لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ

(بیشک اللہ نے اپنے رسول کو واقعی سچا ہی خواب دکھایا تھا)

کتاب لاجواب موسومہ

رؤیائے صادقہ

جس میں

مذہب اسلام کی سچائی ثابت کی گئی ہے

مصنفہ

مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم

لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق

بے شک اللہ نے اپنے رسول کو (واقعی) سچا ہی خواب دکھلایا تھا

نقل رزولیوشن جو کمیٹی الاصلاح واقع علیگڈھ کالج نے اس کتاب کی نسبت اجلاس عام میں بالاجمال پاس کیا

"جو اس کتاب جتنی باتیں بھی نہ جانتا ہو اس کا اسلام کیا"

رویائے صادقہ

اس کتاب میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ سچا اسلام بالکل عقل کے مطابق ہے اور اس میں شکوک اور اشتباہات کو دخل نہیں ہو سکتا

مصنفہ

خان بہادر شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد مرحوم و مغفور، ایل ایل ڈی، ڈی، او، ایل، سابق ڈپٹی کلکٹر و ممبر آف دی بورڈ آف ریونیو سرکار عالی نظام

بسعی و اہتمام منذر احمد نبیرہ مصنف مرحوم

۱۳۴۸ہجری مطابق ۱۹۲۹ء

(چوتھی بار دو ہزار) قیمت فی جلد عہ

فہرستِ مضامین رویائے صادقہ

دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ دیدہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم

خدا کی یہ شان ہو تو اُس کی حمد کیا مقدورِ انسان سے ہو انما انا بشر مثلکم[1] نے پیغمبر صاحب کی نعت کا کچھ یوں ہی سا حوصلہ دلایا تھا سو دنی فتدلی[2] فکان قاب قوسین او ادنیٰ سے وہ بھی پست ہو گیا ؎

اِدھر مخلوق میں شامل اُدھر اللہ سے واصل   خواص اس برزخ کبریٰ میں تھا حرفِ مشدد کا

تمہید کے طور پر جو کہنا منظور رہی یہ ہے کہ آدمی کے ساتھ ساتھ مذہب اور مذہب کے ساتھ ساتھ اختلاف پیدا ہوا۔ اور اس اختلاف نے دنیا کو کبھی چین سے نہ رہنے دیا۔ اِن دنوں مذہبی چرچے بڑے زوروں پر ہیں۔ اور اِس کے ضروری نتیجے بھی ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اس رسالے کے تصنیف کرنے سے غرض یہ ہے کہ مسلمان جہادی نہیں بلکہ اجتہادی مسلمان ہوں۔ اور آپ بھی امن چین سے بیٹھیں اور دوسروں کو بھی امن چین سے بیٹھے رہنے دیں۔ معلوم نہیں میں اس ارادے میں کہاں تک کامیاب ہوں گا۔ مگر میرا دل تو ان ہی خیالات کی بدولت اسلام کی طرف سے پورا پورا مطمئن ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذٰلک

---

[1] میں بھی تم ہی جیسا بشر ہوں ۱۲

[2] پیغمبر صاحب نزدیک آئے پھر اور پاس کو سرکے یہاں تک کہ دو کمانوں جتنا فاصلہ رہ گیا یا اس سے بھی کم ۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی فصل

تمہید کے طور پر صادقہ کی تقریب اور اُس کی خواب دیکھنے کی عادت

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ کیا دھوکا ہوا ہی۔ ہم مدت تک اسی خیال میں رہے کہ **صادقہ** اور **یوسفی** دو سگی بہنیں تھیں۔ اب تحقیق ہوا کہ ایک ہی عورت کے دو نام ہیں۔ اور اصلی ایک بھی نہیں۔ اُس کو میکے ہی میں لوگ **صادقہ** کہنے لگے تھے۔ اس واسطے کہ اُس نے ساری عمر نہ کبھی جھوٹا خواب دیکھا اور نہ اپنے جی سے بنا کر کوئی خواب بیان کیا۔ بیاہی گئی تو سُسرال کی طرف سے یوسفی بیگم کا خطاب ملا۔ اس لیئے کہ کثرت سے خواب دیکھتے دیکھتے اُس کو تعبیر میں ایسا ملکہ ہو گیا تھا کہ اُس کی رائے تیر بہدف ہوتی تھی۔ یوں تو کوئی ایسا بندہ بشر نہیں جو سوتے میں خواب نہ دیکھتا ہو۔ بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہی کہ آدمی کا دماغ ایک لحہ بھی بیکار نہیں رہ سکتا۔ وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ سوچا ہی کرتا ہی۔ جیسا جاگتے میں ویسا سوتے میں۔ اتنا فرق ضرور ہوتا ہی کہ اکثر لوگوں کو خواب یاد نہیں رہتا۔ مگر تو بھی وہ جتنی دیر سوتے ہیں خواب ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ جانوروں میں سے اور جانوروں کا تو حال معلوم نہیں مگر گھوڑے کو جس کا جی چاہے آزمالے کہ تھان پر کھڑا سو رہا ہی۔ آنکھیں بند ہیں۔ خرانٹوں کی آواز چلی آتی ہی اور یکا یک خاص طور پر ہنہنایا۔ ایسے موقع پر سائیس یا جو کوئی آدمی موجود ہوتا ہی

تھان ہی تھان ہی" کہہ دیا کرتا ہی۔ اس سے معلوم ہوتا ہی کہ گھوڑا بھی کسی نہ کسی طرح کے خواب دیکھتا ہی۔ لوگوں نے بہت کچھ عقلیں دوڑائیں مگر کسی کو ٹھیک پتہ نہیں ملا کہ خواب ہی کیا چیز اور اس کی تعبیر کے اصول کیا ہیں۔ ہم بھی مدتوں اس خبط میں گرفتار رہے جب سے صادقہ کا حال سُنا یہ خیال ہی چھوڑ دیا اور سمجھ لیا کہ خواب بھی اسرارِ الٰہی میں سے ہی۔

ع خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

اس عورت کا دماغ بھی خدا نے عجیب ہی طرح کا بنایا تھا۔ وہ پرلے درجے کی ذہین تھی۔ یوں بھی لڑکیاں بولنے اور بات چیت کرنے پر جلد قادر ہو جاتی ہیں۔ اور صادقہ تو پورے ڈھائی برس کی بھی نہ ہوگی کہ ہم نے اپنے کانوں اُس کو مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر مسلسل گفتگو کرتے سُنا۔ نہ لغزش، نہ لکنت، نہ رکاوٹ۔ اُس کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ اُس کو اپنے بچپن کے اُن وقتوں کی باتیں جب کہ اُس کو اچھی طرح گفتگو بھی نہیں کرنی آتی تھی ایسے صاف طور پر یاد تھیں کہ گویا کل کی بات ہی۔ ایک دفعہ کا اُس نے مذکور کیا کہ "میں جھولے میں لیٹی ہوئی تھی۔ اوپر سے گری چھپکلی۔ اور اتفاق سے اُس وقت کوئی میرے پاس نہ تھا۔ میرے جی میں آیا کہ آواز دوں۔ مگر بولنا نہیں آتا تھا ناچار رونے لگی دوا نے مجھ کو آکر اُٹھا لیا۔ میں چُپکی تو ہو گئی۔ مگر جب پھر اُس نے جھولے میں لٹانا چاہا تو میں اکڑ گئی۔ دوا سمجھ تو گئی کہ جھولے میں لیٹنا نہیں چاہتی۔ مگر اُس کو سبب کون سمجھائے۔ آخر اماں جان کا ذہن منتقل ہوا۔ اور لگیں کہنے ارے ذرا نہالیچے کو تو دیکھو جوں نہالیچہ اُٹھایا چھپکلی کود بھاگی وہ جا۔ اماں جان نے مجھے گود میں لے کر پیار کیا۔ اور اُسی وقت جھٹ کیری بندھوا دی۔ تب میرے دم میں دم آیا"

وہ ایسی باتوں کے ایسے ٹھیک پتے دیتی تھی کہ تسلیم اور تصدیق کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا۔

غالباً اُس نے خواب بھی اسی زمانے سے دیکھنے شروع کیئے ہوں گے مگر اُس کا چرچا گھر میں اُس وقت سے ہونے لگا۔ جب سے اُس کو بولنا آیا جیسی اِس کی عمر تھی، جیسے اِس کے خیالات تھے ویسے ہی اس کے اُن دنوں کے خواب بھی ہوتے تھے۔ مثلاً ایک دن اُس کا بھائی کہ وہ بھی بچہ ہی تھا، اس سے کوئی دو سوا دو برس بڑا سویرے اُٹھ کھانے کے لیئے ضد کرنے لگا۔ ماں نے کہا باُسی کھچڑی تو میں تم کو دینے کی نہیں۔ رہیں کچوریاں، سو اوّل تو ابھی دُکانیں نہیں کھلیں اور دوسرے وہی ایسی کونسی خوبی بھری ہیں۔ گھی کا نام اور آدھے سے زیادہ تیل اور پھر ماش کی دال۔ نہیں صاحب ذرا دم لو۔ ابھی میں تم کو روغنی ٹکیا ڈلوائے دیتی ہوں پھر چاہنا کھانڈ سے کھانا۔ یا مربّے کی پھانک سے۔ مگر خدا کے لیئے اوپر سے پانی نہ پی لینا۔ ایسا نہ ہو پھر رات کو آپ بھی مارے کھانسی کے بے چین رہو اور ہم سب کی نیند بھی حیران کرو۔" یہ سُن کر صادقہ بولی۔ "اماں جان مربّے کا مرتبان تو گر کر ٹوٹ گیا۔"

ماں۔ "یہ کب اور کیوں کر؟"

صادقہ۔ "کب اور کیوں کر تو میں جانتی نہیں مگر میں نے خواب میں دیکھا ہے۔"

خواب کا نام سُن کر سب لوگ ہنس پڑے۔ بات گئی گزری ہوئی۔ ماما نے جلدی جلدی کر کے توا چڑھایا۔ ٹکیا پکائی۔ جوں مربّے کے لیئے کوٹھری کھولی ایک جھوڑ دو دو بلیاں نکل کر بھاگیں۔ اندر جا کر دیکھا تو واقع میں مرتبان زمین پر ٹوٹا پڑا ہے۔

دو چار بار تو لوگ خبر نہ ہوئے۔ لیکن جب دیکھا کہ یہ ہر روز خواب دیکھتی اور جو دیکھتی ویسا ہی ظہور میں آتا تو گھر والوں کو اچھا مشغلہ ہاتھ آیا۔ صبح ہوئی اور سب نے پوچھنا شروع کیا کیوں بی آج کیا خواب دیکھا؟ نہ کبھی ایسا ہوا کہ صادقہ نے کوئی خواب نہ دیکھا ہو اور نہ ایسا ہوا کہ دیکھا ہو اور سچا نہ اترا ہو۔ رفتہ رفتہ پہلے گھر میں پھر محلے میں پھر تو سارے شہر میں

ایک غل سا مچ گیا۔ ادھر تو صادقہ کی شہرت بڑھتی جاتی تھی۔ اُدھر عمر کے ساتھ ساتھ وہ خوابوں میں ترقی کر رہی تھی۔ صادقہ کے خوابوں کے سلسلے سے ایسا معلوم ہوتا ہو کہ جس طرح کسی علم کے مبتدی کو پہلے آسان آسان باتیں سکھائی جاتی ہیں اور پھر بتدریج وہ مشکل کتابوں پر عبور کرتا ہو۔ اسی طرح صادقہ کو پہلے صاف صاف خواب دکھائی دیتے تھے۔ یعنی جو بات ہوئی جیسی کی تیسی اُس کو خواب میں دکھائی دے گئی۔ وہی خواب وہی تعبیر۔ لیکن آہستہ آہستہ اُس کے خواب پیچ دار ہوتے چلے جو بدون تعبیر کے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتے تھے جیسے پہیلی یا معمّا یا چیستاں۔ مثلاً گھر میں کسی کو تپ آنے کو ہوتی تو اُس نے خواب میں دیکھا۔ بخار چڑھا ہوا ہو۔ اور پڑے ہیں۔ پھر یوں دیکھنے لگی کہ دھوپ میں بیٹھے ہیں یا آگ سے تاپ رہے ہیں اور آخر آخر کو ایسا معلوم ہوا کہ آگے دیگچی[1] رکھی ہو اُس میں چار رنگ کے چاول ہیں مگر بُسے ہوئے۔ اکثر تو ایسا ہوتا تھا کہ صادقہ کو خواب ہی میں اُس کی تعبیر بھی معلوم ہو جاتی تھی۔ گویا تعبیر بھی جزو خواب تھی۔ اور کبھی خواب میں تعبیر معلوم نہ ہوئی تو اُس نے بیداری میں آپ تعبیر دے لی۔

ایک عجیب بات اور تھی کہ صادقہ کبھی فرمائشی خواب بھی دیکھتی تھی یعنی مثلاً ہم کو ایک بات کے معلوم کرنے کی ضرورت ہو اور ہم نے اُس سے درخواست کی۔ جیسا کچھ ہونے والا ہو صادقہ نے خواب میں دیکھ دیا۔ مگر یہ بات اس کے اختیار کی نہ تھی۔ بہتیری مرتبہ ایسا ہوا کہ صادقہ نے خواب دیکھنا چاہا اور بھلا یا بُرا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ صادقہ نے سب تو نہیں مگر اپنے ضروری اور معرکے کے خواب تعبیر سمیت روزنامچے کے طور پر ایک کتاب میں جمع کر لیے تھے۔ اور اتفاق سے وہ اصل روزنامچہ ہمارے ہاتھ آ گیا ہو۔ اور ہم اس کو

---

[1] دیگچی۔ معدہ۔ چار رنگ کے چاول صفرا۔ خون۔ بلغم۔ سودا۔ چار خلطیں۔ چاولوں کا بُسنا۔ خلطوں کا فساد جس سے تپ آتی ہو۔

عن قریب چھپنے والے ہیں۔ جب وہ روزنامچہ مشتہر ہوگا تو قابلِ دید ہوگا نہایت دلچسپ

اُس روزنامچے میں ایک بڑی خوبی تو یہ ہے کہ کودن سے کودن اور غبی سے غبی اس کو پڑھ لے

اور اُلجھی ہوئی باتوں کو آسانی کے ساتھ سلجھانے لگے۔ اور اس میں تو ذرا سا بھی تامل نہیں کہ

صادقہ کا روزنامچہ دیکھنے کے بعد اتنی بات تو چار و ناچار تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس جہان کے

علاوہ ایک عالم ارواح بھی ہے اور سوتے میں ہم کو اس کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اور اگر ہم

اس میں مشق و مہارت پیدا کریں تو بہت سے اسرارِ قدرت منکشف ہوں۔ اور یہی معمولی

خواب جو ہم اکثر دیکھا کرتے ہیں اور کبھی اِن کی پروا نہیں کرتے۔ ان میں سے ہر ایک میں

بڑے بڑے مطالب پوشیدہ ہوتے ہیں۔ مگر ہم کو ان کے دریافت کرنے کا سلیقہ نہیں۔

دوسری فصل

صادقہ کا ایک عجیب خواب

لیکن یہ باتیں روزنامچے کے ساتھ لکھنے کی ہیں۔ تاہم اس غرض سے کہ لوگوں کو صادقہ کے

خوابوں کی وقعت ہو جس کے وہ مستحق ہیں، مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے

کہ صادقہ کے ماموں الہ آباد کی طرف کہیں تحصیل دار تھے۔ کثیر العیال اور اس پر رحم دل

اور سخی ایسے کہ باوجود موٹا کھانے اور موٹا پہننے کے ہمیشہ محتاج، روپیوں کے نہیں

پیسوں کے۔ تو وجہ کیا تھی کہ آدھے کے لگ بھگ تو اُن کی تنخواہ مصارفِ خیر میں

چلی جاتی تھی۔ بیواؤں اور یتیموں اور مسکینوں کی تنخواہیں جو مقرر تھیں سو تھیں۔ کتنے

غریبوں کے بچوں کی فیس دیتے۔ اُن کے لیے کتابیں بہم پہنچاتے اور اُن کو مدرسوں میں

پڑھواتے۔ کبھی سُنا نہیں کہ کوئی سائل اُن کے یہاں سے محروم پھرا ہو۔ وہ ہمیشہ نئے

سائلوں اور مواقع خیرات کی تلاش میں رہتے۔ اور اُن کا خیال یہ تھا کہ نہیں معلوم کس کا دیا خدا کی درگاہ میں قبول ہو جائے۔ ساری عمر بیش قرار ماہانے کی نوکریاں کیں، اور گھر میں دیکھو تو بیوی بیٹیوں کے کانوں میں چاندی کی بالیاں۔ تنگ موہری کے پاجامے۔ چمڑے کی سادی جوتیاں۔ جس طرح بانگی سے اناج کے ڈھیر کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک بات سے آدمی کا تمام طرز مزاج کھل پڑتا ہے۔ جو شخص اس درجے کا سخی ہو محال عقل ہے کہ ظالم و مرتشی ہو۔ تحصیل دار صاحب کا حال یہ تھا کہ اگر کسی سرکاری کام سے علاقہ پر جاتے۔ ایک ایک پتی لکڑی کی قسم۔ گھاس کا تنکا حرام۔ غرض عملے کے لئے عذاب و مصیبت تھے۔ رعایا کے حق میں خدا کی رحمت۔ سرکار کے معتمد الخدمت۔ بیچارے کو مشکل یہ درپیش تھی کہ قانون یاد نہیں ہوتا تھا۔ ہر برس امتحان میں جاتے اور ہر بار فیل ہوتے۔ کلکٹر مہلت دلواتے دلواتے تھک گئے۔ حکامِ بالادست درگزر کرتے کرتے عاجز آگئے۔ ضلع اور کمشنری بلکہ بورڈ تک سے معافی امتحان کی رپورٹیں ہوئیں۔ مگر اُن دنوں کی گورنمنٹ کچھ ایسی سخت گیر تھی کہ مطلق نہ پسیجی۔ گورنمنٹ اس بات پر تلی ہوئی تھی کہ کچھ بھی ہو نئے تعلیم یافتہ اختیار اور اعتبار کے عہدوں پر بھرتی ہوں۔ دیانت سہی، امانت سہی، راست بازی سہی، سرکار کی خیر خواہی سہی۔ پُرانے لوگ وہ روشن خیالی، وہ آزادی رائے، وہ بے تعصبی، وہ معلومات کہاں سے لائیں گے جس کے بدون ملک داری ہو ہی نہیں سکتی خیر

ع رموزِ مصلحتِ خویش خسرواں دانند۔ تحصیل دار صاحب کا یہ اخیر سال تھا کہ یا امتحان پاس کریں یا نوکری سے برطرف۔ بس یہاں تو منکر سے منکر کو بھی ماننا ہی پڑے گا کہ خدا ہے اور آڑے وقت پر آڑے آتا اور اپنے نیک بندوں کی مدد کرتا ہے۔ امتحان میں بس زیادہ نہیں کوئی ایک ہفتہ باقی رہا ہو گا کہ صادقہ نے خواب دیکھا اور دہاں ماموں صاحب کا وہی حال۔

کورے سپاٹ۔ کارروائی اچھی مقدمات کی تجویز درست۔ کتابی سوال پوچھو تو سکوت۔ اور کچھ بتایا بھی تو ادھورا اور غلط۔ خدا جانے کس کی دعا لگی۔ کجا صادقہ اور کجا قانون کا امتحان۔ مگر ہاتف غیبی نے خواب میں پورے کے پورے سوال بتا دیئے۔ صادقہ نے صبح سویرے اُٹھ سوالات لکھ رجسٹری کرا ماموں پاس روانہ کیئے۔ ہر چند تحصیل دار کی طبیعت کو قانونی مناسبت نہ تھی اور کسی قدر نسیان بھی تھا۔ مگر سوالات ایسے وقت پر پہنچے کہ تحصیل دار صاحب نے اطمینان کے ساتھ اُن کے جوابات سوچ لیئے۔ صادقہ کے خواب پر بھروسا تو تھا۔ مگر تو بھی اندر سے دل دھکڑ پکڑ کرتا تھا۔ مجلس امتحان میں جا کر بیٹھے۔ تو ایک نقطے اور شوشے کا بھی تو فرق نہ تھا۔ بڑی ناموری کے ساتھ پاس ہوئے تنخواہ اور اختیارات زیادہ ہوئے سوا الگ۔

تیسری فصل

خواب دیکھنا صادقہ کے حق میں مضر ہوا

بے شک صادقہ میں سچی خواب دیکھنے کی ایک خاص صفت تھی لیکن سوائے اس ایک خواب کے جو ہم نے ابھی بیان کیا اور ایک خواب جس کا حال آگے چل کر معلوم ہوگا۔ اُس نے کبھی کوئی بکار آمد خواب نہ دیکھا۔ اُس کو آئندہ کے واقعات دکھائی دیتے تھے۔ مگر اتنا ہی فرق تھا کہ اور لوگوں کو وقوع کے بعد خبر ہوتی تھی اور اس کو ذرا پہلے۔ ایک عالم غیب کی ٹوہ کے پیچھے پڑا ہے اور اسی بنیاد پر نجوم اور رمل اور جفر اور فال اور شگون اور کیا اور کیا، کتنے پاکھنڈ دنیا میں چل پڑے ہیں۔ لیکن جب ہم واقعات اور اُن کے نتیجوں کو روک نہیں سکتے تو پہلے سے جان لینا اگر ہو بھی تو کیا فائدہ دے سکتا ہے؟ اور یہی سبب ہے کہ خدا نے کسی بندے کو غیب کا علم نہیں دیا۔ کیوں کہ سب باتیں اُس نے اپنے قبضۂ قدرت میں

رکھی ہیں۔ اور کسی کو اس قدرت میں شریک کرنا چاہا نہیں تو نرا علم بے قدرت کس کام کا تھا۔

صادقہ کے خواب بھی اسی قبیل سے تھے۔ اگر اس نے کوئی اچھا خواب دیکھا تو اصلی اور عین خوشی کے مقابلے میں اُس کی خوشی بہت ہوتی ہوگی تو جیسے عید سے پہلے عرفہ۔ اور اگر برا دکھائی دیا تو وہی کہاوت ہوئی کہ قبل از مرگ واویلا۔ صادقہ کو ہم نے کبھی اس کی شیخی مارتے بھی نہ دیکھا اور کچھ کام کی بات ہوتی تو اُس پر ناز ہوتا پر ہوتا۔ بلکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ صادقہ اپنی اس حالت سے دل میں خوش نہ تھی، گو اُس نے ناخوشی کبھی ظاہر نہیں کی۔ اول تو لوگوں کی فرمائشیں اُس کو پریشان کیے رہتی تھیں۔ کوئی بندہ بشر ایسا نہیں جس کو واقعات آیندہ کے دریافت کرنے کی ضرورت نہ ہو، یا واقعاتِ آئندہ کے دریافت کرنے کا اُس کو شوق نہ ہو۔ جو سنتا ایک فرمائش لے دوڑتا۔ اور فرمائشی خواب کا دیکھنا صادقہ کے اختیار میں نہ تھا اکثر ایسا ہوا کہ کسی خاص معاملے میں اُس نے خواب دیکھنا چاہا۔ اور ہر چند کوشش کی برا بھلا کچھ بھی نہ دکھائی دیا۔ تو جن لوگوں کی کاربراری نہ ہوتی ناحق ناراض ہوتے اور صادقہ پر بے توجہی یا اخفائے حال کی بدگمانیاں کرتے جس سے صادقہ کو ایذا ہوتی۔ اور ایذا کی بات بھی تھی۔

سب سے بڑا نقصان جو صادقہ کو اپنے خوابوں کی بدولت پہنچا یہ تھا کہ لوگ اُس کی نسبت خیال کرنے لگے کہ اس کے سر پر کچھ ہے۔ ایک طور پر اُس کا ادب کرتے اور اُس کو وقعت کی نظر سے دیکھتے۔ مگر دل ہی دل میں ڈرتے بھی تھے کہ خدا جانے کیا اسرار ہے اور آیندہ چل کر کیا گل کھلے۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ صادقہ اکیس بائیس برس کی ہوگئی اور کہیں سے اُس کے بیاہ نکاح کا پیام سلام کیسا، مذکور تک بھی تو نہ آیا۔ کئی برس تک اُس کی ماں اس پر اڑی بیٹھی رہی کہ "بڑی آگے سے اُٹھے گی تو چھوٹیوں کا ٹھکانا کروں گی۔ بڑی کے آگے

چھوٹیوں کو بیاہ سے جانے کا کیا حق ہے۔ بڑی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ تو چھوٹیوں کے پیٹے میں
سو دقعہ کسی کو نہیں پوچھتی۔ یہی نہ کہ تینوں میرے گھٹنے سے لگی لگی بوڑھی ہو جائیں۔ بلا سے۔
خدا نہ کرے میرے یہاں کا ہے کی کمی ہے۔ پہلے یہ تینوں اور پیچھے ہم سب۔ مجھے تو دونوں
آنکھیں برابر ہیں اور تینوں ہی میرے کلیجے کے ٹکڑے ہیں۔ بڑی کو بٹھا رہنے دوں اور
چھوٹیوں کے گھر بسا دوں تو بڑی دل میں کیا کہے گی۔ اور پھر تو بڑی کی بات کہیں ہوتی بھی
ہو تو نہ ہو۔ لوگوں کے دل میں دل نہیں ڈالا جاتا۔ خدا رکھے دو بہنیں اور بھی ہیں مگر بڑی بڑی
ہی ہے۔ صورت شکل میں دونوں سے بیس۔ خانہ داری کا سلیقہ ماشاء اللہ اب کہ گھر کی یہ ساری
رونق صادقہ ہی کے دم سے ہے۔ پڑھی لکھی ہوشیار ذہن کی تیز اور کتنی بڑی خوبی ہے دیندار
کچھ آج کل کے مردوں کی قسمت ہی ہیٹی ہے۔ ورنہ اس کے گنوں کو دیکھیں تو ہزاروں
اس کے خریدار ہوں۔ اور جب اس کی قسمت کھلے گی تو جس کے پلے بندھے گی وہ زندگی کا
مزہ بھی پائے گا اور کہے گا کہ ہاں بیوی ہو تو ایسی ہو۔ رہی خوابوں کی بات سو اول تو
مدتوں سے اُن میں بہت ہی کمی ہو گئی ہے۔ اور عجب نہیں پہلے سے اتنی بھی نہ رہے لیکن
کسی کا حرج ہی کیا ہے۔ بلکہ قدر کرنے والا ہو تو سو ہنر ایک طرف اور یہ اکیلا ایک طرف۔
بیوی کی بیوی اور نجومی کی نجومی۔ آج لوگ کیسے کیسے جتن کرتے ہیں کہ آگے کا کچھ حال
معلوم ہو اور اٹکل کے تکوں کے سوائے کچھ حاصل نہ حصول۔ اور میری صادقہ تو جو کہتی ہے
گویا لوحِ محفوظ سے دیکھ کر کہتی ہے۔ اس کی بات نہ کبھی جھوٹی ہوئی اور نہ کبھی جھوٹی ہو لیکن
حق ناحق جو لوگ شبہہ کریں اور خلل آسیب قرار دیں اس کا کیا جواب۔ بس صبر اور شکر الٰہی۔ جو
ایسا شبہہ کریں اُن کو ماں اُن کے چہیتوں کو ماں اُن کے پیاروں کو ماں اور اُن کے رہنے سہنتوں کو ماں
میری صادقہ کو اللہ رسول کی امان۔ ماں اللہ رسول کا سایہ“۔

یہ تھے خیالات صادقہ کی ماں کے جو ایک ماں کو ہونے چاہئیں۔ لیکن وہ لوگوں کی عام رائے کا اگرچہ وہ رائے غلط تھی مقابلہ کر نہیں سکتی تھی۔ حال یہ تھا کہ چھوٹی بیٹیوں کے لئے پیام پر پیام اور رقعے پر رقعے چلے آتے تھے اور صادقہ کے لیے موتھ پھوڑ کر کہا بھی جاتا تھا تو بھی کوئی ہامی نہیں بھرتا تھا۔ لحاظ کے مارے کسی نے موتھ سے نہ کہا۔ مگر وہ چپ کرجانا بھی کہے داخل تھا۔ آخر کنبے کے لوگوں نے سمجھایا کہ اس کے کرم میں بر ہی نہ لکھا ہوگا تو کیا کرلوگی۔ ایک کی خاطر دو کی منزل کھوٹی کرنی۔ بھلا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے۔ اور فرض کرو زبردستی سر پڑا کر کیا بھی اور خدا کو اس کا گھر بسانا منظور نہ ہوا تو؟ اپنی اپنی تقدیر اپنا اپنا نصیب۔ ایک ماں کے پیٹ سے دس بچے ہوتے ہیں دسوں کی دس صورتیں اور دس طرح کی قسمت۔ رہا بیٹیوں کا بٹھانا سو یہ ہاتی بادشاہوں سے نہیں باندھے گئے۔ بیٹیاں پرایا دھن ہیں۔ اور سدا سے ہوتی چلی آئی ہے اور ہوتی چلی جائے گی کہ ان کو پالو پوسو اور آخر کار جس کی امانت ہے اُس کے حوالے کرو۔ تو تم یہ ضد چھوڑ دو۔ بندے کا کیا حوصلہ ہے کہ خدا سے لڑے۔ چھوٹیوں کو ٹھکانے لگنے دو۔ بڑی کا بھی خدا مالک ہے۔ جب اس کا وقت آئے گا۔ اور اس کے نصیب کھلیں گے۔ غیب سے کوئی اس کا بھی خریدار پیدا ہو جائے گا۔ آگے کو رستہ تو ہو۔ دوہرے دوہرے سمدھیانے ہوں گے۔ چار کے کان آواز پڑے گی۔ اب بھی کیا ہے کہ کوئی اس کا خواہاں نہ ہو۔

غرض برس کے اندر ہی اندر دونوں چھوٹی بہنیں بیاہی جاکر دو دو تین تین بچوں کی مائیں ہو گئیں۔ اور بیچاری صادقہ ہے کہ کوئی اس پر ہاتھ نہیں کھتا۔ گویا بیاہے جانے کے لیے خدا نے اس کو پیدا ہی نہیں کیا۔ یوں تو بیٹی والوں کو بہتیری ہی جلدی ہوتی ہے۔ اور نہ کیوں ہو۔ دیر لگی اور لڑکی کھٹائی میں پڑی۔ لیکن لحاظ کے مارے، اور کچھ اس خیال سے بھی کہ خدا جانے

کوئی کیا گمان کرے، یہ لوگ گھبراہٹ کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ نہ ان کی طرف سے ابتدا ہوتی اور نہ اس قدر جلد رضامند ہو جاتے کہ بس منتظر ہی بیٹھے تھے۔ لیکن صادقہ کے بیٔے تو وضعداری کو بھی اُٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ اس پر بھی کوئی نہیں جھنتا تھا اور بس وہی ایک واہمہ کہ اس کے سر پر کچھ ہے جب صادقہ کی ماں کے کان میں یہ بھننگ پڑی تو اس نے صادقہ کو بڑا قدغن کر دیا تھا کہ خبردار جو خواب کا نام لیا ہوگا۔ اور اس کے بعد سے اگر کوئی کچھ پوچھنے آیا تو اُس کو بھی ترش روئی سے کہہ دیا کہ "لوگو کیا کھیل لگایا ہے۔ ایسا ہی غیب دانی کا شوق ہے تو نجومیوں پاس جاؤ۔ پنڈتوں سے پترا کھلواؤ۔ مولوی ملّا سے فال نکلواؤ۔ اس بے چاری کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ اب یہ گھر کا کام کاج کرے یا تمہاری بیگار بھگتے۔" پس اگرچہ کئی کئی برس خوابوں کا چرچا بند تھا۔ مگر تاڑنے والے تاڑ گئے تھے۔ اور صادقہ کی نسبت لوگوں کا وہ عام خیال کہ اُس کے سر پر کچھ ہے نہ مٹا پر نہ مٹا۔ اُدھر تو صادقہ کی ماں نے اُس پر خوابوں کی بندی کر رکھی تھی۔ اور اِدھر رُو در رُو نہیں اُس کی سہیلیوں اور ہمجولیوں اور میل ملاپ والیوں کی معرفت تقاضا تھا کہ جس طرح ہو سکے اپنے بیاہ کے بارے میں کوئی خواب دیکھے۔ صادقہ عجب مصیبت میں گرفتار تھی، خواب کا دیکھنا اس کے اختیار میں نہیں۔ جھوٹ موٹ دل سے بنا کر کہہ دے یہ اس کی عادت نہیں۔ ایسی کیا بات ہے کہ صادقہ کو اپنے بیاہے نہ جانے کا ملال نہ ہو۔ وہ دیکھتی تھی کہ گھر میں رات دن اسی کا مذکور ہے۔ اور ہر شخص اپنی جگہ افسردہ ہے۔ ممکن نہیں کہ اُس پر اس کا اثر نہ پڑتا ہو۔ کُنبہ اور محلہ تو بجائے خود، اُس نے اپنے ہی گھر میں اپنے سے چھوٹی اور اپنے سے ہیٹی ایک چھوڑ دو دو بہنوں کو بیاہے جاتے اور بچے کھلاتے دیکھا۔ تھی تو وہ بھی آدمی ہی کا بچّہ۔ کیوں نہ خیال آتا ہوگا۔ مگر اُس کی کسی ادا سے کبھی یہ بات ظاہر نہیں ہوتے پائی کہ اس کو کواری بیٹھے رہنے کا اتنا بھی رنج ہے جتنی اُڑد پر سفیدی۔

وہ اپنی بہنوں کی شادی بیاہ چھٹی وغیرہ تقریبات میں ایسی خوش دلی سے شریک ہوئی کہ کواری عورت کے لیئے بلکہ کسی قدر نامناسب سا تھا۔ اُس نے ماں سے لڑ لڑ کر زادراز واجب بہنوں کے حقوق دلوائے۔ اور اتنا ماں کو بیاہی ہوئی بیٹیوں کا خیال نہ تھا جتنا کہ اس کو بہنوں کا۔

چوتھی فصل

صادقہ کا انتظام خانہ داری

وہ جو کہتے ہیں کہ ناامیدی میں بھی ایک طرح کی راحت ہے۔ بس وہی حال صادقہ کا تھا۔ اُس نے سمجھ لیا تھا کہ اب میری یہ عمر آئی اور میں کواری ہی زندگی بسر کروں گی اور کواری ہی مروں گی۔ اور وہ ایسی زندگی کے لیئے بالکل طیار تھی۔ ہمارے ملک میں لڑکیاں ایسی چھوٹی سی عمر میں بیاہ دی جاتی ہیں کہ اُن کو خانہ داری کے لیئے طیاری کرنے کی کافی مہلت نہیں ملتی۔ صادقہ کو بڑی مہلت ملی۔ مگر اس کو خانہ داری کی طرف سے بالکل نااُمیدی تھی تاہم اُس نے اِن لیاقتوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا جو ایک شریف بی بی اور لائق ماں میں ہونی ضرور ہیں۔ اِس نے ماں کے گھر کو اپنا گھر اور چھوٹے بھائی بہنوں کو اپنے بچے سمجھ کر خانہ داری کے سب نشیب و فراز نظر میں کر لیئے۔ جو باتیں سینہ بسینہ سکھائی جاتی ہیں اُن کے علاوہ اُس کی علمی لیاقت اس درجے تھی کہ ایسا ویسا مرد اس کی جوڑ کا نہ تھا۔ وہ تو خدا کو پردہ ڈھکا رکھنا تھا کہ بیٹھے بٹھائے لوگوں کو اس پر آسیب کا اشتباہ ہو گیا ورنہ کتنوں کو اس نے یہ کہہ کر جتا دیا ہوتا کہ میں ان کے قابل نہیں۔

گھر والے اور نوکر چاکر گنے ہوئے بیس آدمی صبح بیس آدمی شام کھانے والے، اور یہ مہنگا سماں اور اُجلی زندگی اور کل ہم سو روپیئے مہینے کی آمدنی۔ اسی میں شادی اسی میں غمی۔

اسی میں تیر تیوہار اور اسی میں آیا گیا بھی۔ کسی دوسرے کے ہاتھ میں یہ انتظام ہوتا تو نہیں معلوم کتنی دفعہ دیوالا نکلا ہوتا۔ مگر وہ تو صادقہ ہی سری کی خوش سلیقہ تھی کہ ہر چیز سے امیری کی شان ظاہر ہوتی تھی۔ بال بچوّں کا گھر اور ایسا ستھرا خدا جانے کیا کمال تھا اور نوکروں اور بچوں کو کیسا سدھایا تھا۔ ہر ایک دالان میں بھرپور چاندنی بچھی ہوئی صدر مقام پہ جاڑا ہوا تو قالین اور گرمی ہوئی تو سوزنی سوزنی پر گاؤ تکیہ۔ ایک پہلو میں ٹپاری دوسرے میں صندوقچہ سامنے اُگال دان۔ اُگال دان پر تہ کیا ہوا اُجلا رومال۔ دالان کی دونوں طرف دو نواڑی پلنگ۔ دونوں پر سفید چادریں کسی ہوئیں نہ جھول نہ سلوٹ سرہانے کے تکیے الگ۔ بغلی الگ۔ پائینتی کو موسم کے مطابق چادر یا دولائی۔ اوپر پلنگ پوش۔

باورچی خانہ ہم نے صاف دیکھا تو صادقہ کے گھر کا۔ کہ اگر چولھے نہ ہوں تو کوئی تمیز نہ کر سکے کہ یہ باورچی خانہ ہے۔ گھر کی صفائی دیکھ کر خیال گزرتا تھا کہ کیا ہر وقت ایک آدمی جھاڑو لئے کھڑا رہتا ہے کہ کہیں تنکے کا نام نہیں۔ کوٹھریوں میں گھس گھس کر دیکھا تو بلا مبالغہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کوٹھری بجائے خود دکان ہے۔ اور اس میں بیچنے کے لئے اسباب سجایا گیا ہے۔ پانی کے مٹکوں کی بھی کچھ اصل ہے! باوجودیکہ برسویں دن رمضان کے رمضان بدلے جاتے تھے۔ مگر جب جس کے جی میں آئے جاکر دیکھ لے ایسے معلوم ہوں گے کہ کورے منگوا کر رکھے ہیں۔ سبب یہ کہ دونوں وقت اندر باہر سے مانجے اور رگڑے جاتے ہیں اور کائی یا گرد جمنے نہیں پاتی۔

ہم کو بڑی ہی حیرت ہوئی تھی کہ سو روپے میں ایسا گھر کیوں کر چلتا ہوگا۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ خانہ داری میں اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اور ان ہی میں بہت خرچ بیٹھتا ہے۔ مثلاً بچوں کا ناشتہ اور بازار کا سودا سلف۔

شہر میں رہ کر بازار کے سودے سلف کی قسم تو کھائی نہیں جاتی۔ مگر ہاں صادقہ اس اہتمام میں ضرور لگی رہتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے کسی کو اس کی چاٹ نہ پڑنے پائے۔ یہ نہیں کہ وہ بچوں کو ترساتی تھی، بلکہ ہر قسم کی خانہ ساز چیزیں ہر وقت موجود رہتی تھیں اور وہ یقیناً بازاری چیزوں سے زیادہ لطیف اور مزہ دار ہوتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ رات کا بچا ہوا باسی کھانا کسی کو نہیں بھاتا اور اکثر اس کا مزہ بھی اُتر جاتا ہے اور یہی وجہ ہوتی ہے کہ چار و ناچار بازاری چیزیں منگوانی پڑتی ہیں۔ لیکن اول تو صادقہ کا اندازہ ایسا ٹھیک تھا کہ اگر کبھی کبھار کچھ بچا بھی تو ایسا کہ اس کو بچنا نہیں کہتے۔ اس کا اصول یہ تھا کہ نہ باسی بچے نہ کُتّا کھائے۔ دوسرے اور گھروں میں بس دو وقت کے کھانے کو ضروری سمجھا جاتا اور اسی کا اہتمام ہوتا ہے۔ صادقہ کھانے سے بڑھ کر تازہ ناشتے کا اہتمام رکھتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ کوئی بھول کر بھی بازار کے سودے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اور اگر آ بھی گیا تو کوئی چاؤ سے کھاتا نہ تھا۔ اور یوں مہینے کے مہینے ایک بڑی رقم پس انداز ہوتی تھی۔

زنانے کپڑوں میں وہ کچھ ایسا زیادہ کتر بیونت کر نہ سکی۔ بڑ بڑاتی جاتی تھی۔ مگر بنانے ہی پڑتے تھے۔ لیکن مردانے کپڑوں میں اُس نے ایسا تصرف کیا کہ اس مد میں روپیوں کی جگہ آنوں کا خرچ رہ گیا تھا۔ اُس کو اس کی بڑی چڑ تھی کہ مرد اگرچہ وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو مہین کپڑے پہنے یا عورتوں کی طرح گوٹا ٹھپا لگائے۔ کچھ ایسی پٹی پڑھا رکھی تھی کہ آٹھ برس کے لڑکے کی کیا بساط وہ اپنے کسی ہم عمر کو کامدار جوتی پہنے دیکھ کر ہنستا تھا۔ پس مردوں کے کپڑے قیمتی ہوتے تھے مگر سادہ اور چلاؤ۔ لباس کے بارے میں چاہو اس کو فضول خرچی سمجھ لو کہ ایسے گھر میں دھوبی کو بہت اُڑ کر ملتا تو سوا روپیہ ڈیڑھ روپیہ۔ صادقہ چار روپیہ مہینا دیتی تھی۔ مگر ان کے یہاں کے اُترے ہوئے کپڑے دوسروں کے

تازہ تہ دار دُھلے ہوئے کپڑوں سے بہتر ہوتے تھے اور پھر مہینے میں چھ چھ سات سات دُھلائیاں جب کہ ہمارے یہاں کیا سارے شہر میں مہینے کی ایک دھلائی کا بٹنا پڑا رہتا ہی۔ ایک خاص بات صادقہ کے یہاں ہم نے اور بھی دیکھی کہ اندر باہر ملا کر پانچ نوکر تھے مگر اُن کے کام اس طرح پر بنٹے ہوئے تھے کہ نہ کسی کو کثرت کار کی شکایت اور نہ اتنی فرصت کہ احدیوں کی طرح پڑے اینڈا کریں۔ اور اس کی بڑی سخت تاکید کہ کوئی دوسرے کے کام میں ہاتھ نہ لگائے۔ اس سے ہوتا کیا تھا کہ ہر ایک کو اپنی ذمہ داری معلوم رہتی تھی اور جب کوئی کام بگڑتا تھا ایک شخص خاص کو اُس کی جوابدہی کرنی پڑتی تھی۔ یہ نہیں کہ انا کو خالی بیٹھے دیکھ کر اُس کے آگے سلائی ڈال دی۔ پیسنے والی سے آٹا گندھوا لیا۔ پکانے والی کو کسی کی خیر صلاح کی خبر کو بھیج دیا۔ اپنے کرنے کا کام نہ ہو تو خالی بیٹھی رہو۔ مگر دوسرے کے کام میں دخل نہ دو۔ دیر ہو تو تمھاری بلا سے اور بگڑے تو تمھارے صدقے سے۔ اس ربط وضبط کی قدر کوئی اُن کے دل سے پوچھے جو گھر کا انتظام اُٹھائے ہوئے ہیں۔

یہ ہی ایک مختصر سا نمونہ صادقہ کی کارروائی کا جس سے معلوم ہو سکتا ہی کہ وہ کس عقل اور سلیقے کی عورت تھی۔ ہائے افسوس ایسی دانشمند، ایسی زیرک، ایسی منتظم، ایسی لائق، صورت کی اچھی، سیرت کی عمدہ، اور وہ بائیس برس کی عمر تک صرف اس وجہ سے کواری بیٹھی رہے کہ سچا خواب دیکھتی تھی اور لوگ ناحق ناروا شبہہ کرتے تھے کہ اس کے سر پر کچھ ہی۔ لیکن خدا کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ انسان اپنے قصور عقل کی وجہ سے اُن مصلحتوں کو اکثر نہیں سمجھتا اور مونھ سے نہ بھی کہے تو دل میں ناراض ہوتا ہی اور اس کو ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ یہی حال رہا ہوگا صادقہ کا اور اس کی بہتری چاہنے والوں کا۔ لیکن بعد کو منکشف ہوا کہ وہ اس غرض سے بٹھائی گئی تھی کہ روز ازل میں اس کا جوڑ ایسے شخص کے ساتھ ہو چکا

کہ معمولی طور کی عورت نہ اُس کو خوش رکھ سکتی اور نہ آپ خوش رہتی۔

پانچویں فصل

بیاہ کے بارے میں صادقہ کے خیالات

ناظرین کی خدمت میں اس شخص کی تقریب کرنے سے پہلے ہم ایک گفتگو نقل کرتے ہیں جو صادقہ اور اس کی پرانی بچپن کی سہیلی ہمراز بیگم میں ہوئی تھی کہ اُس سے بیاہ کے بارے میں صادقہ کے خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ دونوں میں رشتہ ناطہ کچھ نہ تھا۔ مگر ہمسائگی، ہم عمری اور ہم مکتبی کی وجہ سے ایسا خلا ملا تھا کہ دو سہیلیوں میں کہیں ہوگا تو بس اتنا ہی ہوگا۔ خدا جانے کس نے بیان کیا تھا کہ دونوں نے ایک ساتھ کا سونا اُس دن چھوڑا ہی جب ہمراز بیاہی جاکر بدا ہوئی۔ اور تب ہی سے صادقہ ہمراز سے ذرا کھنچنے بھی لگی تھی۔ کیوں کہ کواری لڑکی کا بیاہی ہوئی لڑکیوں سے بہت میل جول رکھنا ذرا بدنما بھی سمجھا جاتا ہی۔ لیکن صادقہ کی رکاوٹ پر ہمراز کا یہ حال تھا کہ سسرال سے ہر روز بلا ناغہ خیر صلاح کے لیئے آدمی بھیجتی اور میکے آتی تو پہلے سیدھی صادقہ کے پاس آتی۔ اور سسرال جاتی تو سب سے اخیر اُس سے مل کر جاتی اور باوجودے کہ ماں ہیتیرا روکتی ٹوکتی رہتی تھی کہ دیکھو ایسا نہ ہو سسرال سے کوئی آدمی آ نکلے۔ ہمراز کا (کیا گنتی بنائیں) ایک پاؤں اپنے گھر ہوتا تھا اور دوسرا صادقہ کے یہاں۔

شروع شروع میں تو یہی کیفیت رہی۔ مگر دنیا کی کسی چیز کو بھی قیام نہیں۔ جوں جوں ہمراز بال بچوں کے بکھیڑے میں پھنستی گئی پیار اخلاص میں تو نہیں مگر ہاں تپاک میں کمی آتی گئی۔ یوں تو صادقہ کے بیاہ کی طرف سے ماں کو ہر وقت تردد ہی تردد رہتا تھا مگر جب سے لوگوں نے یہ صلاح دینی شروع کی کہ بڑی کے بیاہ کا انتظار نہ کرکے چھوٹی لڑکیوں کو بیاہ دو تب سے تو

حقیقت میں ماں کا اضطراب اس قدر بڑھ گیا تھا کہ رات دن اسی کی دُھن تھی۔ جہاں اُس نے اور تدبیریں کیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ہمراز کو بلاکر کہا کہ میں تو نہیں کہہ سکتی تم اپنے طور پر صادقہ سے کہو کہ اُپنے بارے میں کوئی خواب دیکھے۔ اور عجب نہیں دیکھا ہو اور لحاظ کے مارے نہ کہتی ہو تم اس کی ٹوہ لو۔"

ہمراز نے صادقہ کو الگ دالان میں لے جاکر باہر کی چلمنیں چھوڑ دیں۔ صادقہ اس بلا کی ذہین تھی کہ اتنی ہی بات سے سمجھ گئی۔ بارے جب دونوں ایک جگہ بیٹھیں تو صادقہ ہی نے بات نکالی کہ اب کے تو تم سُسرال میں خوب جمیں معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم لوگوں کی اگلی سی چاہت نہیں رہی۔"

ہمراز۔"مجھ کو تو سُسرال میں ایک ایک دن دو بھر ہو رہا ہے کیا کروں پرائے بس میں ہوں ننّے کا ایسا ہلکا خون ہے کہ آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اور اب کے تو دُشمنوں کی کچھ بھی آس نہ تھی ایسے زور کا مغلی دُکھ ہوا تھا کہ بارہ دن تک ساری ساری رات لیئے بیٹھے رہے۔ بارے اب برسوں سے ہوشیار ہوا تو میں زبردستی نکل بھاگی۔ امّاں جان تو اب بھی راضی نہ تھیں اور وہ مجھ سے راضی ہی کب ہوئی ہیں ہاں تم اپنی تو کہو۔"

صادقہ۔"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ ہماری تو وہی کہاوت ہے نہ ساون سوکھے نہ بھادوں ہرے جیسے کل تھے ویسے آج ہیں۔ تمہارے ننّے کو میں نے خواب میں بیمار دیکھا تھا مگر انجام بخیر تھا بلکہ تمھاری امّاں ایک دن گھبرائی گھبرائی آئیں تھیں اور میں نے اُن سے کہہ بھی دیا تھا۔ اور خبر تو میں روز ہی پوچھ لیا کرتی تھی۔ اور تم جانتی ہو میرے آنے کا کوئی موقع نہ تھا۔"

ہمراز۔"ہاں امّاں نے تمہارے خواب کا حال کہلا بھیجا تب تو میرے دم میں دم آیا۔ ورنہ اتنے دن دانہ مُونہ میں گیا ہو تو حرام۔ خیر ہمارے لیئے تو تم نے بہتیرے خواب دیکھے۔ یہ تو بتاؤ اپنے لیئے بھی

کچھ دیکھایا نہیں؟

صادقہ۔"میں اپنے لئے کیا دیکھتی؟"

ہمراز۔"جس طرح میرے بیاہ سے پہلے مجھ کو دلھن بنا ہوا دیکھا تھا۔ کبھی اپنے تئیں بھی دیکھا یا نہیں؟"

صادقہ۔"ہمراز تم اب بیاہی جا چکی ہو۔ اللہ رکھے تمہارے آگے بچے ہیں۔ تم کو مجھ سے ایسی باتیں کرنی نہیں چاہئیں۔"

ہمراز۔"کیوں؟ کیا بیاہے جانے سے مجھ کو کچھ اور بھاگ لگ گئے ہیں؟ میں وہی ہمراز ہوں جس کے ساتھ پہروں تم اس قسم کی باتیں کیا کرتی تھیں۔"

صادقہ۔"بے شک وہی ہمراز ہو۔ مگر میری تمہاری حالت میں اب بڑا فرق ہے۔ شاید لوگ میرا تمہارا بہت گاڑھا ربط وضبط اب پسند نہیں کرتے۔ تمہارا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ مگر مجھ کو موئنہ پر نہیں تو پیٹھ پیچھے پکی پھبتیسی ضرور کہیں گے۔"

ہمراز۔"اسی خیال سے میں نے چلمنیں چھوڑ دی ہیں کہ کوئی سُنے نہیں۔"

صادقہ۔"بوڑھی اماں ہو کر تم نے اتنی ہی عقل سیکھی۔ کوئی شبہہ نہ کرنا تو کرے۔"

ہمراز۔"میں تمہاری اماں کے اشارے سے آئی ہوں اُنھوں نے مجھ کو تمہارے پاس اسی غرض سے بھیجا ہے۔"

صادقہ۔"نہیں معلوم اماں کو کاہے کی گھبراہٹ ہے۔ یہ میں جانتی ہوں کہ میرا روٹی کپڑا ان پر بھاری نہیں اور ساری اولاد میں مجھ کو چاہتی بھی بہت ہیں۔ اور میں چلی جاؤں تو کوئی ان کا ہاتھ بٹانے والا نہیں۔ تو کیا میری کسی بات سے ان کو تقاضا معلوم ہوا۔"

ہمراز۔"ہزار تقاضوں کا تقاضا تو تم خود ہو۔"

صادقہ۔ "خواہ نخواہ بھی؟ اور جو مجھ کو منظور ہی نہ ہو؟"

ہمراز۔ "کیا تم انوکھی عورت ہو کہ ساری عمر کواری بیٹھی رہو گی۔ اور کوئی تم کو بٹھا بھی رکھے گا؟ اور تم کو انکار ہی تو مونھ سے پھوٹتیں کیوں نہیں کہ لوگ اپنا سُبیتا کریں"

صادقہ۔ "بات یہ ہو کہ اول تو یہ ایسا مشکل معاملہ ہو کہ اطمینان کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں ہو سکتی دوسرے اب میرے انکار کی بھی کیا سند ہی۔ میں انکار کرتی تو اُس وقت کرتی جب انکار کرنے کا موقع تھا۔ اب وہ موقع تو نکل گیا۔ انکار کروں تو میری وہی کہاوت ہو جو کسی کتاب میں میری نظر سے گزری ہو کہ ایک لومڑی چلتے پھرتے کسی باغ میں جا نکلی۔ دیکھا کہ انگور خوب پھلے ہیں اور کوئی رکھوالا نہیں۔ ٹٹیوں کے تلے پہنچی تو معلوم ہوا کہ انگور تو لدے پڑے ہیں مگر اونچے بہت ہیں۔ اُچھلی کودی اور بہتیرے جتن کیے۔ انگور ہاتھ نہ آتے۔ ناچار صبر کر کے چلتی ہوئی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتی جاتی تھی کہ خیر کم بخت تھے بھی کھٹے۔"

ہمراز۔ "اس سے تو معلوم ہوتا ہو کہ تم بیاہے جانے سے ناراض ہو۔"

صادقہ۔ "اگر ناراض نہیں تو راضی بھی نہیں۔"

ہمراز۔ "لیکن ہم تم میں جو مذکور رہا کرتے تھے وہ بھی یاد ہیں؟ تب تو تم کہا کرتی تھیں کہ میں بیاہی جاؤں گی تو یہ کروں گی اور وہ کروں گی۔"

صادقہ۔ "آدمی کے خیالات کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ تمھاری طرح مجھ کو دُلہن بننے کی خوشی تھی۔ اور میرے نزدیک بیاہ اسی کا نام تھا کہ جیسی جس کی حالت ہی عمدہ سے عمدہ کپڑے بدلے۔ گہنا پہنا۔ بنائے سنوارے گئے۔ دان جہیز لیا۔ سُسرال سے چڑھاوے کا آیا۔ کچھ رونمائی میں ملا۔ سُسرال جاتے ہیں تو وہاں خاطر مدارات۔ میکے آتے ہیں تو یہاں چوچلے۔ پھر جوں جوں عمر زیادہ ہوتی گئی اور اونچ نیچ کی سمجھ آئی۔ بہت کچھ کتابوں میں پڑھا اور کسی قدر

اپنی دیکھ بھال سے دریافت کیا تو بیاہ کے نام سے میرا کلیجہ تھر تھر کانپنے لگتا ہی اور اندر سے جی یہی چاہتا ہی کہ عمر بھر اسی طرح بیٹھی رہوں۔"

ہمراز۔ "سچ کہا ہی بہت سیان پت بھی آدمی کو خراب کرتی ہی۔ سب تمھاری ہی طرح سوچا کریں تو دُنیا کاہے کو بسے۔ آخر سب بیاہے ہی جاتے ہیں۔"

صادقہ۔ "بیاہے تو جاتے ہیں مگر ایک گھر کا تو نشان دو جہاں جوتیوں میں دال نہ بٹتی ہو اور تم اپنے ہی تئیں کیوں نہیں دیکھتیں۔ باوجودے کہ تم کو خوش قسمتی سے میاں بھی ایسے ملے ہیں کہ ہزاروں میں ایک۔ پڑھے، لکھے، لائق، حسب نسب سے درست، اور سب سے بڑی بات یہ ہی کہ نوکر اور نوکری بھی معقول اور پھر نہ تم خوش اور تمھاری ہی کہن ہی کہ وہ بھی تم سے خوش نہیں اور ابھی کتنے آدمی کتنے بیر شدی بیتیں دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔"

ہمراز۔ "ہمارے یہاں تو یہ ایک بڑا بل آ کر پڑا ہی کہ گھر گھر ساس نندیں ہیں لیکن ایسی آخور تو کہیں بھی نہ ہوں گی جیسی میری۔ ان کو رات دن میری بدیاں رونے کے سوائے اور کچھ کام ہی نہیں۔ وہ[1] آپنی ذات سے ایسے بُرے نہیں۔ مگر اُنھوں نے لگا لگا کے لگا لگا کے آخر مجھ کو اُن کی نظروں سے گرا دیا۔ اور اب بھی تو صبر نہیں۔"

صادقہ۔ "کیا تم سے کچھ سختی کرتے ہیں؟"

ہمراز۔ "نہیں۔ خدا نہ کرے سختی تو نہیں کرتے۔ مگر میری طرف اُن کا رُخ نہیں کبھی بضرورت ایک آدھی بات کر لی ورنہ کوئی پہچان نہیں سکتا کہ یہ میاں بیوی ہیں۔"

صادقہ۔ "کیا ہوا بعض آدمی کم سخن بھی ہوتے ہیں۔"

ہمراز۔ "اے ہے یہی تو غضب ہی۔ بڑے باتونی، بڑے خوش مزاج۔ مگر مجھ سے نہیں اوروں سے

---

[1] ہمراز نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا کیونکہ ہندوستان میں بی بی شوہر کا نام نہیں لیا کرتی۔

ایک ہمارے رشتے کی خالہ ہوتی ہیں۔ ہمارے گھر سے دیوار بیچ اُن کا گھر ہے ہم نے تو اُن کو بھی کے دیکھا خدا جانے کتنے برسوں میں حج کر کے آئی ہیں۔ اور بغداد اور بیت المقدس اور نہیں معلوم کہاں کہاں گئی تھیں۔ اُن کو بُلا بُلا بھیجتے ہیں۔ اور پہروں اُن سے اِدھر اُدھر کے حالات پوچھا کرتے ہیں۔ یا ہمارے ماموں زاد بھائی میاں آگاہ جب کبھی آ نکلتے ہیں تو پھر ان دونوں کی باتیں سُنو۔ دونوں میں سے کسی کے ہاتھ میں اخبار ہوتا ہے اور رُوم اور رُوس اور خدا تمھارا بھلا کرے کابل اور کَون کَون ملکوں کے جھگڑے پیش ہوتے ہیں۔ میں تو کچھ سمجھتی بوجھتی نہیں۔ مگر نہ تو اُن کا جی اُٹھنے کو چاہتا ہے اور نہ یہ اُن کا پنڈ چھوڑتے ہیں۔ تو کیوں کر کہوں کہ کم سخن ہیں۔"

صادقہ لم کو پہنچ تو گئی مگر ہمراز کی دل شکنی کے خیال سے کچھ نہ کہہ سکی اور پوچھا تو یہ پوچھا کہ تم نے کبھی موقع پا کر اپنے میاں سے اِس کا سبب بھی دریافت کیا ؟"

ہمراز۔" ایک بار ؟ بیسیوں دفعہ۔ جب پوچھا یہی کہہ کہہ دیا میں جس دنیا میں ہوں تم کو اُس کی ہوا ہی نہیں لگی اور کھانے پہننے کی باتوں سے میرا جی اُلجھتا ہے کیوں کہ یہ تمھارے کرنے کے کام ہیں نہ ان میں مجھ کو درک اور نہ دخل دینے کی ضرورت۔ میرا بہت سا وقت صرف ہوتا ہے کچہری میں۔ تم کو اس سے کچھ مناسبت نہیں۔ میں ہر چند سوچتا ہوں تم سے کرنے کی کوئی بات ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ سو بُوا اب تو ہار کر میں نے بھی اس کا خیال چھوڑ دیا۔ وہ کوارپنے کی بے فکریاں جو کبھی یاد آ جاتی ہیں تو ایک سنّاٹا سا گزر جاتا ہے۔

صادقہ۔" اور پھر میں کہتی ہوں تم سینکڑوں ہزاروں میں اچھی ہو۔ میں نے تو بڑی بڑی دور تک خیال دوڑائے ہیں۔ وہ امن چین وہ تسلّی وہ خوشی جو بیاہ کا مقصود ہے کسی ایک آدھ ہی کو نصیب ہوتی ہو گی اور اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے ہاں کا بیاہ اندھے کا نشانہ ہے۔ لگا تو تیر۔ نہیں خالی نکا۔ کیا مرد کیا عورت ہر ایک کا مزاج الگ، ہر ایک کی طبیعت جدا ہر ایک کی

نو خصلت علی حدہ ۔ دو آدمی اجنبی محض ۔ جان نہیں پہچان نہیں ۔ ملاقات نہیں ، صاحب سلامت نہیں ۔ اوپر والوں کی تجویز سے ملا دیئے جاتے ہیں ۔ اب وہ شیر و شکر کا سا ملنا ملیں تو اُن کی تقدیر اور نیل اور پانی کا سا ملنا ملیں تو اُن کی تقدیر ۔ اور جوں کہ مرد کا پلہ بھاری ہے موافقت نہ آئی تو عورت زندہ درگور ہو چکی یہی سوچ سمجھ کر میرا جی ڈگمگ پگمگ کرتا ہے ۔ اور واقع میں میں کوئی انوکھی عورت نہیں ہوں جو دنیا جہان کی بیٹیوں کا دستور وہ میرا دستور ہے مجھ کو ہرگز اُمید نہیں کہ ساری عمر بھی اطمینان کے ساتھ اس کا فیصلہ کر سکوں گی غرض اندر دل سے تو میں بیاہ سے راضی نہیں ۔ مگر جانتی ہوں کہ سب اس کے درپے ہیں تو انکار بھی نہیں کر سکتی ۔"

ہمراز ۔"پھر آخر میں تمھاری اماں سے کیا جا کر کہوں ؟"

صادقہ ۔"اُن سے تو اتنی ہی بات کہہ دینا کہ خواب تو میں نے کوئی دیکھا دکھایا نہیں ۔ اور نہ ہونا ہوتا تو مجھ کو ضرور دکھائی دیتا میرا خیال یہ ہے کہ ہوگا تو سہی مگر دیر سے ۔

چھٹی فصل

صادقہ کے بیاہ کی چھیڑ چھاڑ

چھوٹی بہنوں کے بیاہ سے پہلے پہلے تو صادقہ کے بارے میں بڑی اگر ما گرمی رہی ۔ جب سے یہ دونوں بیاہی گئیں نہیں معلوم اُن کے شغل میں لگ گئے یا نا اُمید ہو کر بیٹھ رہے غرض مدتوں سے گھر میں صادقہ کے بیاہ برات کا کچھ چرچا سننے میں نہیں آتا تھا ۔ لیکن ماں کے تو تلووں سے لگی تھی ۔ وہ پانچوں وقت نماز کے بعد دعا مانگا کرتی تھی ۔ برسوں اس کے لیئے اُس نے حصن حصین پڑھی ۔ اور عمل تو جس نے جو بتایا کیسا ہی مشکل کا ہو اُس کو کرنا ضرور ۔

بارے بخارا کی طرف کے کوئی بزرگ سیاحت کے طور پر شہر میں آ نکلے تھے۔ اتفاق سے اسی محلے کی مسجد میں آ کر ٹھہرے۔ معمول کے مطابق صادقہ کے یہاں سے دونوں وقت کھانا آتا رہا۔ وہ ہو گئے بیمار۔ ان لوگوں نے حسبۃً للہ ایسی خبر گیری اور خدمت کی کہ جو خبر گیری اور خدمت کا حق ہے۔ دونوں وقت حکیم کو حال کہلا بھیجنا۔ نسخہ منگوانا بنانا۔ حکیم نے جو کچھ کھانے کو بتایا ہو وقت پر طیار کرا دینا۔ اتنے تعلق سے اُن بزرگ کو اس گھر کے بعض حالات بھی معلوم ہوئے۔ اور اُن میں سے صادقہ کا معاملہ بھی تھا۔ آخر ان بزرگ نے کہلا بھیجا کہ ان شاء اللہ میں بھی دعا کروں گا۔ اور تم میں سے کسی سے ہو سکے تو نماز تہجد کے بعد تنہائی میں دو نفلیں تعدیل ارکان کے ساتھ پڑھ کر اول آخر سات سات بار درود اکتیس دفعہ اس آیت شریف کا ورد کرو اور پھر خشوع و خضوع کے ساتھ عرض حاجت۔ آیت یہ ہے ومن[1] ایاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ۔ ان بزرگ نے یہ بھی فرمایا کہ اس عمل کی حد تو ایک چلے کی ہے۔ مگر مجھ خدا کی ذات سے توقع ہے کہ ہفتے کے اندر ہی اندر بشارت ہو گی۔

عمل کو شروع کئے ہوئے تیسری رات تھی کہ اُدھر صادقہ کی ماں دعا مانگ رہی تھی اور اِدھر صادقہ کو خواب دکھائی دے رہا تھا۔ دیکھتی کیا ہے کہ جیسے اس کے والد چوکھٹے میں ایک تصویر لئے کھڑے ہیں اور اس کو دکھا رہے ہیں اور وہ تصویر کسی انگریز کی سی ہے۔ صادقہ نے اجنبی مرد کی صورت دیکھتے ہی بے اختیار اپنا مونھ چھپا لیا۔ تو اس کے والد کہتے ہیں بیٹا یہ تو تصویر ہے اور تصویر بھی ٹھیک نہیں۔ دیکھو اس شخص کی اصلی صورت یہ ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے اُس تصویر کے نیچے سے اور تصویر نکالی۔ تو وہ ایک مسلمان کی تھی مگر دونوں تصویریں تھیں ایک ہی شخص کی۔

---

[1] اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تم ہی میں سے تمھارے لئے بیبیاں پیدا کیں کہ تم اُن کی طرف رغبت کرو اور تم میں اور اُن میں دوستی اور مہربانی قائم کی۔

صادقہ کو تو اپنے خوابوں کی تعبیر کی مہارت تھی ہی۔ سمجھ گئی کہ بیاہ کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ کوئی اور نادان عورت ہوتی تو مارے خوشی کے اچھل پڑتی۔ مگر صادقہ کو اُن ذمہ داریوں کا خیال آگیا جو بیاہ کے پیچھے اُس پر عائد ہوں گی اور وہ ابھی سے سوچ میں گئی کہ اس چہرے مُہرے کا شخص کس مزاج کا ہوگا۔ اور اُس کو رضامند رکھنے کے لئے مجھ کو کیا کرنا پڑے گا۔ قیافے کے سوائے تحقیقات کا اور کوئی ذریعہ تھا نہیں تو اس نے عقل دوڑائی کہ یہ مرد درمیانہ قد سے نکلتا ہوا ہے۔ اور اس کی گردن بھی لمبی ہے تو یہ برتری کی دلیل ہے اور ضرور ہے کہ ایسا شخص نام و نمود کا طلب گار ہو۔ اس کا سر بڑا ہے یعنی دانشمند ہے۔ پیشانی اونچی اور فراخ ہے تو خوش مزاج ہوگا۔ ماتھا اُبھرا ہوا ہے ذہن کا تیز ہے۔ آنکھیں روشن اور بڑی ہیں بلند نظر اور سیر چشم ہے۔ ہونٹ پتلے اور بھنچے ہیں ارادے کا پکّا اور ہٹ کا پورا ہے۔ ناک کسی قدر موٹی اور نتھنے چوڑے ہیں خود دار اور غصیلا ہے اور کیا عجب ہے مغرور ہو۔ کنپٹیاں الگ دیکھ پڑتی ہیں کمانے کے خوب ڈھنگ آتے ہوں گے۔ سینہ چوڑا ہے تو تندرست اور قوی دل ہے۔ یہ روداد تو کچھ بُری نہ تھی۔ بلکہ ان صفتوں کے آدمی میسّر نہیں آتے مگر کچھ یہ سمجھ میں نہ آیا کہ دو تصویریں کیسی۔ چند روز کا وقفہ دے کر پھر صادقہ نے دیکھا کہ باپ نے وہی دو تصویریں اس کے حوالے کیں کہ تو تم اپنے پاس رکھو۔ مگر بہت احتیاط سے رکھنا اس کا مطلب بھی صاف تھا تیسری بار کسی کو خواب میں پکار کر کہتے ہوئے سُنا کہ وہ تصویریں تمہارے ہم نام کی ہیں۔ صادقہ نے غور تو کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا مراد ہے۔

آج جمعرات کی رات کو صبح ہوتے ہوتے صادقہ نے یہ اخیر کا خواب دیکھا۔ اور اگلے ہی دن کوئی چار گھڑی دن چڑھتے چڑھتے ڈاکیے نے آواز دی کہ رجسٹری خط لے جاؤ دیکھیں تو ایک بڑا سا اعمدہ انگریزی کاغذ کا لفافہ صادقہ کے والد میر خسرو کے نام بنارس سے

صادق نامی کسی شخص نے ایسے اہتمام سے بھیجا ہو کہ لفافے کی درزوں پر ایک ایک انچ کے فاصلے سے لاکھ کی مُہریں ہیں۔ مکتوب الیہ کا نام اور پتہ انگریزی فارسی دونوں خطوں میں ایسا صاف لکھا ہوا تھا کہ اُس میں کسی طرح کا شک و شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لفافے تو لیا مگر یہ معمولی طور کا لفافہ نہ تھا کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا کہ ہمارے متعارفین میں سے بنارس میں اس نام کا کون شخص ہے۔ اور اُس کو ایسا لفافہ رجسٹری بھیجنے کی کیا ضرورت پڑی ہوگی۔ سردی کا تھا موسم اور ابھی کچھ ایسا دن بھی نہیں چڑھا تھا سب لوگ ایک ہی دالان میں جمع تھے۔ ازاں جملہ صادقہ بھی۔ یہ تو سمجھ گئی کہ ہم نام کی یہ تعبیر ہے میر صاحب نے تھوڑی دیر تامل کر کے آخر لفافے کو کھولا۔ اندر سے جز کا جز ایک خط نکلا چند سطریں بھی پڑھنے نہیں پائے تھے کہ بی بی نے پوچھا۔ "آخر کون ہیں کیا لکھتے ہیں؟"

میاں۔ "ابھی اِس کے پوچھنے کا کیا موقع ہے ذرا پڑھ تو لینے دو۔"

بی بی۔ "بس میرا بولنا تو تم کو زہر لگتا ہے"

میاں۔ "تم بات ہی ایسی کرتی ہو کہ نہ رکھی جائے اور نہ اُٹھائی جائے۔ اول تو تم کو میری ہر ایک بات کی کرید ہی کرنی کیا ضرور ہے۔ اور پھر صریحاً دیکھ رہی ہو کہ کتاب کی کتاب میرے ہاتھ میں ہے۔ پڑھنا شروع کیا ہے کہ تم نے بیچ میں ایک پتھر کھینچ مارا۔ مجھ کو خود معلوم نہیں تو جواب کیا دوں؟ ابھی زردے کا عمل پورا نہیں ہوا۔ اوپر تلے چار پانچ پان کھاؤ گی تو تمھارا مزاج درست ہوگا۔"

بی بی۔ "آپ سارے دن حقہ بیٹھے گڑ گڑائیں تو کچھ نہیں۔ میرے زردے کا ہر وقت طعنہ لو اب زردہ کھاؤں تو حرام کھاؤں۔ مُردار کھاؤں۔"

یہ کہہ کر گلوری جو تھوڑی دیر ہوئی مُونھ میں رکھی تھی اور ابھی اُس کے چبانے کی بھی

نوبت نہیں آئی تھی اگال دان اُٹھا تھوک دی۔ میر صاحب بے چارے خط ہاتھ میں لیئے
دم دبائے چلتے ہوئے۔ اور اگر ایک لحہ بھی بیٹھے رہیں تو دونوں میں ایسی ہی لڑائی ہو جیسی
ہر روز ہوا کرتی تھی۔ باہر مردانے میں اطمینان سے بیٹھ کر خط پڑھا تو لکھا تھا۔

ساتویں فصل

سید صادق کی طرف سے شادی کا رقعہ۔ کہنے کو رقعہ در واقع میں کتاب اور اُسی میں علیگڈھ کالج کا مختصر حال اور نکاح کے بارے میں لوگوں کی رائیں

جناب من۔ بندے کا نام تو آپ کو لفافے ہی سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ میں اُس پر اتنا
اور زیادہ کرنا چاہتا ہوں کہ ۱۸۹۰ء کے بی اے کے امتحان میں جو شخص کلکتہ یونیورسٹی میں
اول رہا وہ یہی خاکسار ہے۔ میں نے علی گڑھ کالج میں تعلیم پائی ہے اور اب بھی اُسی کالج کی
ایم اے کلاس میں پڑھتا ہوں بندے کا وطن آبائی توفیض آباد ہے مگر شاہزادہ فلک شکوہ
کے توسل کی وجہ سے والد نے بنارس میں رہنا اختیار کیا۔ اور چوں کہ کچھ جائداد از قسم
زمینداری وغیرہ بھی پیدا کرلی ہے۔ اب ہم یہیں کے ہو گئے ہیں۔ ہمارا نسب نامہ محفوظ ہے
اور میں اُس سے آپ کو اپنے سید الطرفین ہونے کا یقین دلا سکتا ہوں۔ اور اِس کا بھی
کہ بزرگوں میں عُلما اور مشائخ اور احکام وقت مشاہیر گزرے ہیں ع لیکن بنود وصف
اضافی ہنر ذات۔ میں آپ اپنا معرّف ہونا زیادہ پسند کرتا ہوں مجھ کو آپ کے ایک
بڑے واقف کار سے آپ کے ذاتی اور خانگی حالات با تفصیل سُننے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور
اُس سے جو خیال میرے دل میں آپ کی طرف سے پیدا ہوا اُسی نے مجھ کو اس عریضے کے
لکھنے اور پیش کرنے کی جرأت بھی دلائی۔ گو آپ انگریزی نہیں جانتے لیکن مجھ کو

تحقیق دریافت ہوا ہے کہ آپ کا مزاج بے تعصب واقع ہے۔ طبیعت منصف، ذہن رسا، رائے صائب، عقل مصلحت اندیش، خیال آزاد۔ افسوس ہے کہ لوگوں کو یہ بات عام طور پر معلوم نہیں کہ ہمارے کالج میں کا ہے کی خصوصیت ہے۔ مجھ کو اس بات کے مان لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ پڑھائی کے اعتبار سے ہم میں کوئی برتری نہیں اور چوں کہ سرکار نے تعلیم اپنے اختیار میں کر رکھی ہے۔ وہ یا قت کے درجے ٹھیراتی اور ان ہی کے مطابق بی اے وغیرہ علمی خطاب دیتی تو ہم اُس میں کوئی ردوبدل کر نہیں کر سکتے۔ ہم سب سمجھتے ہیں کہ یہ تعلیم ہم کو کچھ ایسی زیادہ مفید نہیں۔ لیکن تا وقتیکہ گورنمنٹ اپنا کورس نہ بدلے ہم کو چاروناچار اسی کی پیروی کرنی ہے۔ غرض میں اپنی اُسی بات کا پھر اعادہ کرتا ہوں کہ پڑھائی کے اعتبار سے ہم میں کوئی برتری نہیں۔ اور یہ جو نماز روزے کی تاکید اور دینیات کے درس کا چرچا آپ سنتے ہیں۔ تو چند دانے ہیں جو مسلمانوں کو دام تعلیم میں لانے کے لیئے بکھیر دیئے گئے ہیں۔ پادریوں کا مقصود اصلی ہے اپنے دین کی اشاعت اور ہمارا دنیاوی تعلیم۔ وہاں لوگوں کو دین عیسوی سے گریز ہے۔ اور ہمارے ہاں مطلق انگریزی تعلیم سے۔ تو پادریوں نے دفع وحشت کے لیئے دنیاوی تعلیم کو آڑ بنایا ہے اور ہم نے دینیات کو۔

ہمارے کالج میں جو خصوصیت ہے صرف دو باتوں کی ہے۔ ایک تو ہمارے یہاں کثرت سے ایسے طالب علم ہیں جو مدرسے ہی میں پڑھتے، مدرسے ہی میں کھاتے، مدرسے ہی میں سوتے، مدرسے ہی میں کھیلتے اور رات دن مدرسے ہی میں رہتے ہیں۔ اور گھروں کی بے تمیزیاں اور سوسائٹی کی بیہودگیاں۔ بزرگوں کی نازبرداریاں ان کی طبیعتوں پر بُرا اثر نہیں کرنے پاتیں۔ دوسرے پڑھنے کے علاوہ لڑکوں کو دُنیا کے معاملات میں غور کرنا اور دُنیا میں رہنے کا سلیقہ سکھلایا یعنی طالب العلموں کو آئندہ کی زندگی کے لیئے طیار کیا جاتا ہے۔

اگر مجھ کو بالفرض کسی کا چال چلن دریافت کرنے کی ضرورت ہو اور وہ شاید ایک درجن عمدہ سے عمدہ سرٹیفکٹ مجھ کو دکھا سکے تو میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میرا دل اس کی طرف ہرگز ایسا مطمئن نہیں ہوگا جیسا صرف ایک اتنی بات سے کہ وہ میری طرح علی گڑھ کالج کا بورڈر ہو۔ اگر آپ نے علی گڑھ کالج کے کچھ حالات معلوم کیئے ہیں۔ اور آپ جیسے بیدار مغز روشن خیال آدمی سے تعجب ہے کہ نہ کیئے ہوں تو آپ نے کالج کی رپورٹوں میں، علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں، ضرور ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ ہم بورڈر کیوں کر اپنے کھانے اور پہننے اور کھیلنے اور کل ضرورتوں کا خود انتظام کرتے، آپس میں کیسے مباشے رہتے، اور ایک دوسرے کے دُکھ درد میں کس طرح شریک ہو جاتے ہیں۔ ہم لوگوں میں کئی قسم کی کمیٹیاں قائم ہیں۔ ازاں جملہ ایک کمیٹی الاصلاح ہے اُس کے تحت میں ایک سب کمیٹی ہے جس میں صرف بیس برس سے زیادہ عمر کا طالب علم شریک ہو سکتا ہے۔ اور مجھ کو اس کمیٹی کے سکرٹیری ہونے کی عزت بخشی گئی ہے۔ اس کمیٹی کی کارروائی شب کے وقت دروازے بند کر کے ہوتی ہے اور ممبروں کے سوائے کسی کو کمیٹی میں آنے کی اجازت نہیں۔ اس کمیٹی کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص نکاح کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرے اور اُس پر ردو قدح ہو، تاکہ جو شخص ایسا تعلق کرنا چاہیے وہ اُس کے نفع و نقصان اور لوازم و نتائج کو پہلے سے سوچ چکا ہو۔

مدّت تک میری یہ رائے رہی کہ میں تجرّد میں اپنی زندگی بسر کروں گا جس دن میں نے کمیٹی میں اپنی یہ رائے ظاہر کی اور وہ مضمون جو لکھ کر لے گیا تھا پڑھ کر سنایا ممبروں کا ایک گروہ کا گروہ اُس کی تردید کو کھڑا ہو گیا اور مہینوں اس پر بڑی سرگرمی اور جوش کے ساتھ بحث ہوتی رہی۔ میں نے جن باتوں پر زور دیا تھا وہ یہ تھیں کہ اس تعلق کا مدار دلی رغبت اور محبّت پر ہے۔ بلکہ رغبت اور محبّت کی جگہ لفظ تعشق استعمال کیا جائے تو زیادہ

مناسب ہوگا۔ اور رغبت و محبّت کی مثال میرے نزدیک درخت کی سی ہو کہ ایک دم سے سموچے کا سموچا زمین سے نہیں نکل کھڑا ہوتا بلکہ اس کا بیج بویا جاتا ہی، پھر وہ جڑ پکڑتا ہی، پھر پھوٹتا ہی، پھر اس میں کونپل نکلتی ہی، پھر پتّے لگتے ہیں، پھر پھیلتا اور بڑھتا ہی، پھر پھولتا اور پھلتا ہی۔ بعینہٖ یہی حال ہو رغبت اور محبّت کا۔ دو طبیعتوں میں ایک طرح کی خلقی مناسبت ہوتی ہو۔ پھر ساتھ رہنے سے اُنس پیدا ہوتا۔ اُنس سے اُلفت۔ اُلفت سے رغبت اور آخر کار رغبت سے محبت پھر آگے محبّت کے مدارج ہیں۔ تو جن دو شخصوں نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں، ایک دوسرے کے پاس نہیں بیٹھے، ساتھ نہیں رہے، ایک دوسرے سے بات نہیں کی، ایک دوسرے کے شریک رنج و راحت نہیں ہوئے۔ کیوں کر ایک کو ایک کی محبت ہو سکتی ہو؟ پس ہمارے یہاں کا تعلق زناشوئی ایک طرح کا جُوا ہو۔ لوگ جیتتے بھی ہیں اور ہارتے بھی ہیں۔ اور چوں کہ محبت ایک کے کرنے سے نہیں ہوتی۔ جیتنے کا احتمال ایک ہی تو ہارنے کے دو۔ اور یہی وجہ ہو کہ اکثر خانہ داریوں میں فساد سُنے جاتے ہیں۔ تو میں نہیں سمجھتا کہ انسان کیوں یہ مصیبت مول لے۔ ہم مسلمانوں میں سے دولت نکل گئی ہو اور نکلتی چلی جاتی ہو اور دولت کے کمانے کے جو طریقے ہیں اُن سے ہم کو گریز ہو اور مسلمانوں کی طرف سے میں بالکل نااُمید ہوں اور اسی میں اُن کی بہتری سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ جہاں تک ممکن ہو اپنے شمار کو بڑھنے نہ دیں کیوں کہ شمار کے ساتھ ساتھ مفلسی اور خواری بڑھتی جلئے گی۔ ہوں اور ذلیل و محتاج ہوں تو ہوں ہی کیوں ہو بے شک میرے اکیلے کی کون سُنتا ہو اور نہ صرف میری اکیلے کی بلکہ مجھ جیسے سینکڑوں کی ہزاروں کی۔ لیکن مسلمانوں کے فائدے کی جو بات سوجھ پڑے اُس کے ظاہر کیئے بدون بھی تو نہیں رہا جاتا۔ تھوڑا سا اثر ہوگا تو بھی بہت ہی۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ مشکل ہم لوگوں کی ہو جنھوں نے انگریزی پڑھی ہی یا پڑھ رہے ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انگریزی

پڑھنے سے معلومات میں وسعت اور خیالات میں آزادی آجاتی ہی۔ اور ایک خاص طرح کا مذاق پیدا ہوتا ہی، ہندوستانیوں (پُرانے خیالات کے ہندوستانیوں) کے مذاق سے بالکل جُدا او رممتاز بلکہ متبائن۔ اختلاف رائے، اختلاف وضع، اختلاف خیالات کے ہوتے دوسرے تعلقات تو خیر بُری طرح یا بھلی طرح نبھ بھی سکتے ہیں۔ لیکن یہ خاص تعلق، یہ تمام تعلقات سے قوی تر تعلق، میں نہیں سمجھتا کہ ایک دن بھی خوش اسلوبی سے نبھ سکتا ہو۔ جو شخص اپنے برابر والوں کو بلکہ اپنے سے بڑوں کو صرف پرانے خیالات کی وجہ سے مُونہہ سے نہ بھی کہے تو دل میں ضرور حقیر سمجھے، کیوں کر مانوس ہو جائے گا اُس عورت سے جس کو اس کے سے خیالات چھو بھی نہیں گئے ہ کیا وہ خوش رہ سکتا ہو اِس سے کہ جب گھر میں آئے پکانے کھانے اور سینے پرونے کے سوائے کوئی بات نہ سُنے ہ کیا وہ خوش رہ سکتا ہو اس سے کہ جب دو عورتیں مِل کر بیٹھیں اُس کی بدی اُس کی غیبت کے علاوہ اُن میں کوئی مذکور نہ ہو؟ کیا وہ خوش رہ سکتا ہو اِس سے کہ جن باتوں میں اس کو دلچسپی ہو گھر میں کسی کو اُس سے لگاؤ نہیں ہ کیا یہ خوش رہ سکتا ہو اِس سے کہ جتنی دیر گھر میں رہے اکیلا پڑا ہوا کتاب دیکھا کرے یا اخبار پڑھا کرے اِس لیئے کہ گھر والی کے ساتھ گفتگو کی سلسلہ جنبانی کرنے کو یہ کوئی مطلب نہیں پاتا ہ کیا یہ خوش رہ سکتا ہو اِس سے کہ خیالات کے اعتبار سے بی بی کو ایک دم اُبھار نہیں سکتا اور اُس کے پست خیالات میں شریک ہونے کے لیئے اپنے تئیں گرا نہیں سکتا ہ کیا یہ خوش رہ سکتا ہو اِس سے کہ سارے گھر کی روزی پیدا کرنے کے لیئے یہ اکیلا دن بھر مصیبت جھیلے اور رات کو تھکا ماندہ گھر آئے تو کوئی اتنا نہ ہو کہ اُس کو صلاح بتائے یا زبانی سہارا لگائے ہ کیا یہ خوش رہ سکتا ہو اِس سے کہ پردیس میں ہو تو صرف اس وجہ سے کہ بی بی پڑھی لکھی نہیں نہ اپنی کہہ سکے اور نہ اُس کی سُن سکے؟

کیا یہ خوش رہ سکتا ہے اس سے کہ ماں کی بے تدبیریوں سے اس کے بچے ہلاک ہوں،
وہ پڑیں بیمار اور دوا کے عوض ان کو پلائے جائیں تعویذ، باندھے جائیں گنڈے،
اُتارے جائیں ٹونے، مانی جائیں منتیں ؟ کیا یہ خوش رہ سکتا ہے اس سے کہ اولاد کی
ابتدائی تربیت میں ایسی غلطیاں کی جائیں کہ ساری عمر اُن کی اصلاح نہ ہو سکے ؟ الغرض
ان وجوہ سے اپنی نسبت اس وقت تک میرا ایسا خیال ہے کہ میں شادی نہیں کروں گا۔ اور
میں اس کمیٹی کے ممبروں کو بھی یہی رائے دیتا ہوں۔ کیوں کہ نتیجہ برخود نہ پسندی بر دیگرے میسند۔
میں تو اتنا کہہ کر بیٹھ گیا اور پھر جو اس پر چاروں طرف سے بوچھاڑ ہونی شروع ہوئی
تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے مضمون کیا پڑھا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ کوئی
شخص نہ تھا جس کے مونھ میں ایک یا دو اعتراض نہ ہوں۔ ان میں سے بعض بودے
اور پھسپھسے بھی تھے لیکن میں نے کمیٹی کے سکریٹری ہونے کی حیثیت سے رودادیں
لکھنے کے لیے سب کو یکجا کیا تو مجموعہ ایسا قوی معلوم ہوا کہ مجھ کو اپنی رائے بدل دینی پڑی۔
اعتراضات کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم کو اپنے دوست سیّد صادق کی رائے سے ہرگز اتفاق نہیں۔
ان کی رائے مدلّل ہے مگر غلطی اور مبالغے سے خالی نہیں۔ اُنھوں نے اس اصول کے
قرار دینے میں بڑی مکروہ غلطی کی ہے کہ تعلق زناشوئی کو ہونا چاہیئے نتیجہ محبت یعنی طرفین میں
پہلے رابطۂ محبت قائم ہولے اُس کے بعد یہ تعلق ہو۔ ہم بالکل اس کے برخلاف سمجھتے ہیں۔
اور ہمارا خیال یہ ہے کہ محبت پیدا ہوتی ہے تعلق زناشوئی کے بعد۔ بے شک دو اجنبی جن میں
مطلق سابقۂ معرفت نہیں ایک دوسرے سے ملا دیئے جاتے ہیں۔ اُن میں خدائے تعالیٰ نے
ایک دوسرے کی طرف رغبت کرنے کا مادّہ ودیعت رکھا ہے۔ نکاح سوائے اس کے اور کچھ نہیں
کہ مرد اور عورت کو ایک دوسرے کی طرف رغبت کرنے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ موقع پاکر

وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف رغبت کرتے ہیں جس کو تخم محبت کہنا چاہیئے۔ اور آخرکار اکثر ان میں محبت پیدا ہو بھی جاتی ہی۔ اور جتنی خانہ داریاں ہیں سب مظاہر ہیں اُسی محبت کے ہمارے دوست سید صادق نے محبت کے پیچ کو بہت زور سے کس دیا ہی۔ اور وہ اُس موانست کو جو تعشق سے کم ہو محبت نہیں کہنا چاہتے۔ یہ بھی ان کی غلطی ہی تعشق کیا چیز ہی؟ بے قراری کی محبت۔ اور اس درجے کی محبت کو عقلاء اور حکماء اور طلباء اور صلحاء ان میں سے کسی نے بھی جائز نہیں رکھا۔ ایسی ہی محبت یعنی شیفتگی ہی جس کو پیغمبر صاحب صلوٰت اللہ علیہ و علی آلہ و اصحابہ اجمعین فرماتے ہیں حب الدنیا راس کل خطیئۃ (دنیا کی محبت اعلیٰ درجہ کا گناہ ہی) ایسی ہی محبت یعنی شیفتگی ہی جس کو اطباء نوع من الجنون (ایک طرح کی دیوانگی) لکھتے ہیں۔ انتظام دُنیا کے لئے ایسی گاڑھی محبت جو عشق اور شیفتگی کی حد کو پہنچ گئی ہو درکار بھی نہیں۔ اور کیوں اُس کو خانہ داریوں میں ڈھونڈا جائے۔ جتنی معمولی طور کی محبت سے خانہ داریاں چلتی ہیں اور چل سکتی ہیں عموماً ہر گھر میں پائی جاتی ہی۔ اس سے کہ میاں بی بی کسی وقت کسی بات پر ردوکد کر لیتے ہیں، نہیں کہہ سکتے کہ ان میں محبت نہیں۔ وہ صبح کو روٹھتے اور شام کو منتے، دن کو لڑتے اور رات کو پیار اخلاص کرتے ہیں۔ ہمارے دوست سید صادق عجیب حکمت سے پردے کی بحث کو اُڑا گئے ہیں لیکن جو اُن کا اصل مطلب ہی وہ اُن کی تمام تقریر سے پڑا ٹپکتا ہی۔ وہ حقیقت میں عورتوں کے پردے کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ یہی پردہ ہی جو تعلق نکاح کے بدون مرد اور عورت میں اختلاط کا مانع ہی۔ لیکن بے پردگی سے جو شرمناک نتیجے یورپ اور امریکہ میں پیدا ہوئے ہمیشہ کے لیے ایک غیور اور منصف مزاج آدمی کی آنکھیں نیچی رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ شاید سو میں ننانوے ہوں گے جو بے پردگی کی رسم بد کو آج اُٹھا دیں اگر اُن کا بس چلے۔ علاوہ بریں وہ

محبّت جس کو ہمارے دوست نے اس تعلق کے لئے ضروری سمجھا ہو اور وہ ضروری ہو بھی
پردہ داری کی صورت میں زیادہ محفوظ رہ سکتی ہو کیوں کہ عورت نہ اجنبی مرد کو دیکھنے اور نہ
اُس کی نیت ڈانوا ڈول ہو سکتی۔ پردہ اُس کو سکھاتا ہو کہ وہ صرف اپنے شوہر کے لئے ہو
اور بس۔ پردے کی غرض و غایت کیا ہو؟ عورت کی پاک دامنی اور ناموس کی حفاظت۔
لیکن جن لوگوں میں پردے کا دستور نہیں وہ بھی اپنی عورتوں کی پاک دامنی اور ناموس کی
ویسی ہی حفاظت کرنی چاہتے ہیں جیسی ہم۔ ہم میں اُن میں اگر فرق ہو تو اتنا ہی کہ مثلاً
ایک شخص نے خزانے کے صندوق پر تالا لگایا۔ دوسرے نے تالا بھی لگایا اور صندوق کو
ایسی جگہ رکھا کہ چور کی نظر نہ پڑے۔ ہم پوچھتے ہیں، ہم اپنے دوست کے موںھ سے سُننا چاہتے ہیں:
دونوں میں خزانے کی طرف زیادہ مطمئن کون ہو؟ بے شک وہی جس نے تالا بھی لگایا اور صندوق کو
ایسی جگہ رکھا کہ چور کی نظر نہ پڑے۔ ہم اس کو مانتے ہیں کہ انگریزنیں ہماری عورتوں سے
بہت زیادہ لائق ہیں۔ انتظام خانہ داری میں، شوہروں کے خوش رکھنے میں، اولاد کی
تربیت و تعلیم میں، بلکہ علمی لیاقت میں بھی۔ لیکن نہ بے پردگی کی وجہ سے بلکہ عام سوسائٹی کی
شائستگی اور تہذیب اور ترقی کی وجہ سے۔ ہم میں بھی لائق مردوں کی ماں بہنیں جورواں سے
زیادہ لائق ہوتی ہیں۔ دین داروں کی دین دار۔ نیک کرداروں کی نیک کردار۔ بھلوں کی
بھلی۔ بُروں کی بُری۔ شریفوں کی شریف۔ پاجیوں کی پاجی۔ یوں تو جیسی دو آنکھیں
مردوں کی ویسی عورتوں کی۔ جیسے دو کان مردوں کے ویسے عورتوں کے۔ جیسے قوائے دماغ
مردوں کے ویسے عورتوں کے۔ لیکن پھر بھی خدا نے مرد اور عورت میں بڑا فرق رکھا ہے۔
عورتیں کتنے ہی ہاتھ پانوں پٹیں، کتنا ہی غل غپاڑا مچائیں، وہ فرق مٹ نہیں سکتا۔
عورت کی حالت کہے دیتی ہو کہ وہ گھر کا کام کاج دیکھنے بھالنے، بچّوں کے پالنے کے سوائے

اور کچھ کر نہیں سکتی ۔ اور کرے گی تو کیا ؟ کرنا چاہے اور کرنے کا قصد کرے تو ہم سمجھیں گے کہ مردوں کا موںھ چڑاتی ہے ۔ اور ہم مردوں میں اس سے زیادہ اُس کی قدر نہیں ہوگی جیسی عورتوں میں ہیجڑے کی ۔ شور وشغب تو بہت کچھ سنتے ہیں مگر یورپ و امریکہ میں بھی عورتوں نے آزادی پاکر اس سے زیادہ کونسا کمال حاصل کر لیا ہے کہ میڈم اماک گاتی خوب ہے ۔ میڈم ڈھمک پیانو کے بجانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی ۔ میڈم فلاں تھیئٹر میں سوانگ ایسا بھرتی ہے کہ نقل کو اصل کر دکھاتی ہے ۔ یا بڑی فضیلت پناہ لیاقت دستگاہ ہوئیں تو ناول یعنی قصے کہانی کے ڈھکوسلے ہانکنے لگیں اور قصے کہانیاں بھی گندے ناپاک ع می تراود چہ کنم انچہ در آوند من ست ۔ کسی نے وزارت کی ہے کوئی سپہ سالار ہوئی ہے مقنن بنی ہے اور یوں سینکڑوں برس میں دو چار نام و نمود کی ہو گئیں تو ایسی اذان دینے والی مرغیاں کبھی ہمارے ڈربوں میں سے بھی نکل آتی ہیں ۔

اب رہی ہمارے دوست سید صادق کی یہ تجویز کہ مسلمان بے دولت ہیں ، اور دولت کے کمانے کے ہنر اُن کو سیکھنے منظور نہیں ، اس لیے ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اُن کا شمار بڑھنے نہ پائے ۔ تشخیص مرض تو درست ہے مگر علاج غلط ۔ اگر ہاتھ میں ایک پھنسی نکلے اور اُس کا زہر پھیلتا چلا جائے ۔ اور خوف ہو کہ سارا ہاتھ از کار رفتہ ہو جائے گا تو کیا طبیب کا یہ کام ہے کہ پھنسی کا نام سنتے کے ساتھ ہاتھ کے جڑ سے اُڑا دینے کا حکم دے ۔ یا کسی پھوہڑ عورت کے سر میں جوئیں پڑ جائیں تو اُس کو یہی صلاح دینی چاہیے کہ سر منڈوا ڈال ، نہ بال ہوں گے نہ جوئیں پڑیں گی نہیں نہیں علاج اس کا نام ہے کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے ۔ زخم اچھا ہو جائے اور قطع ید لازم نہ آئے ۔ بُٹیا بھی رہے اور روپیہ لیکھ ڈھونڈی نہ ملے اب ہمارے دوست سید صادق کا صرف ایک اعتراض اور رہ گیا ہے کہ انگریزی پڑھے ہوؤں کو اُن کی مرضی کی بیبیاں مل نہیں سکتیں سچ ہے کہ نہیں مل سکتیں جس طرح عورتوں کو ایسے شوہر نہیں مل سکتے جو دابہ گری کا کام بھی جانتے ہوں

عورتوں سے وہ توقعات ہی کیوں پیدا کی جاتی ہیں جو اُن کے بس کی نہیں۔ اور آخر ایسی ہی عورتوں کے ساتھ لاکھوں کروڑوں آدمی گزارہ کرتے ہیں۔ انگریزی خواں جو خوش نہیں رہ سکتے تو اس وجہ سے کہ انھوں نے انگریزی پڑھ کر اپنے تئیں چھوئی موئی بنا لیا ہے۔ قصور تو اپنا اور اُلاہنا دوسروں پر۔ سید صادق نے تاہّل ہیں تو بہتیرے کیڑے ڈالے لیکن اُنھوں نے اِن قباحتوں پر بھی نظر کی جو تجرّد کو لازم ہیں۔ اگر یہ بیٹھے جیسا کہ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹھنا چاہتے ہیں، تو زیادہ نہیں آج سے تو دس برس کے اندر اندر دکھا دیں گے کہ کسی نا گفتہ بہ بیماری میں گل سڑ کر مر گئے ہوں گے۔ یا بڑے گھُل رہے ہوں گے یا قیدیوں کے ساتھ سڑک کوٹتے ہوں گے۔ یا ایسی خراب حالت میں ہوں گے کہ کالج کے پرنسپل اور پروفیسر اور طالب العلم تو سب اپنی جگہ۔ کالج کے بھنگی کو یہ کہتے ہوئے شرم آئے گی کہ یہ بھی کبھی ہمارے کالج میں تھے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو لیکن اگر ہو تو وہ سزا ہو گی اُن کی اپنی کرتوت کی کہ اُنھوں نے قانونِ قدرت کو توڑا اور پیغمبر اسلام کی سنت سے مونھ موڑا۔ اے جناب یہ اعتراض سُن کر میں تو لگا بغلیں جھانکنے۔ اور مجھ سے ایک بات کا بھی جواب دیتے نہ بن پڑا۔ اور میں نے اپنا کان امیٹھا اور تجرد سے توبہ کی اور اب مجھ کو یہ سوچ پیدا ہوا کہ تاہّل کرنا تو ضرور ہے۔ اور میں نے اپنی غلط فہمی سے اُس کی عمر کا ایک حصہ ضائع بھی کر دیا۔ اگر میں زیادہ دن تک بیٹھا رہوں تو لوگ ایسا خیال کریں گے کہ میں اُسی غلطی پر جما ہوا ہوں۔ اور کمیٹی ہے کہ اپنے قاعدے کے مطابق برابر ہوئے چلی جا رہی ہے جس کے جی میں آتا ہے کوئی نئے بحث پیش کرتا ہے اور اُس پر بحث ہوتی ہے۔ میں تو پہلی ہی دفعہ تجرد کی سے حمایت کر کے نکّو سا ہو گیا۔ اب سُنتا سب کی ہوں مگر حوصلہ نہیں پڑتا کہ آپ بھی کچھ کہوں لیکن کمیٹی کی کارروائی جواب تک ہو چکی ہے میں سمجھتا ہوں کافی اور کافی سے زیادہ ہے اور مجھ کو کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں۔ میں کمیٹی کے ممبروں سے

نام ظاہر نہیں کرسکتا۔ اور نہ کمیٹی کے قواعد کی رو سے کسی کو ایسی اجازت ہے۔ ورنہ جیسی جیسی گفتگو کمیٹی میں ہوتی ہے۔ میں نام بنام بیان کرتا۔ اور چوں کہ کمیٹی میں بعض آپ کے بھی متعارف ہیں آپ کو کسی قدر مزہ بھی ملتا۔ لیکن مجھ کو جہاں کہیں اس خط میں ضرورت ہوگی۔ میں حرفوں سے کام لوں گا۔

ایک دن **الف**۔ نامی ایک ممبر کے مونھ سے نکل گیا میں تو انگلش لیڈی لاؤں گا۔ اس پر جو گفتگو ممبروں میں ہوئی اُس کی نقل کرتا ہوں۔

ب۔ "ارے میاں۔ کہیں خدا کے لیئے ایسا غضب نہ کر بیٹھنا۔"

الف۔ "آپ تو جانتے ہیں کہ میں اپنے والد کا اکیلا بیٹا ہوں اور وہ جیسے کفایت شعار ہیں معلوم۔ اُن کے پاس اچھا اندوختہ تھا اور ہمیشہ سوچا کرتے تھے کہ اس کو کاہے میں مشغول کروں کوئی صلاح دیتا تجارت میں تو وہ کہتے مجھ کو آپ تو اس کا سلیقہ نہیں۔ اتنا سرمایہ نہیں کہ اُس سے بڑی تجارت ہو سکے۔ لے ہوئے پچاس ساٹھ ہزار تو اُن کی کیا بساط۔ اور پچاس ساٹھ بھی میں نے مثال کے طور پر بیان کیئے ورنہ میں نے تو اتنی بڑی رقم کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی۔ اور دیکھتا کہاں سے۔ اس نعمت پر ہیچ ڈپٹی کلکٹری میں تو توقع ہی نہیں۔ وہ موذی کلکٹر چھاتی پر بیٹھا ہوا مونگ دلا کرتا ہے۔ آپ بڑے دن کی ڈالیاں لے مفت کی سواریوں پر لدا لدا پھرے۔ دورے میں دودھ انڈا مرغی کوئلا لکڑی گھاس کسی چیز کے دام۔ قلی بیگار کی مزدوری نہ آپ دے اور نہ اُس کے لشکر والے دیں تو کچھ نہیں۔ عین میز کے تلے عملے کی تقدیر کا ہُن برسا کرے تو خبر نہیں۔ چپراسی اور خانگی ملازم انعام کے لیئے کتّوں کی طرح لوگوں کو لپٹیں تو پروا نہیں۔ مگر ڈپٹی صاحب نے خدا جانے اُس کا باپ مارا ہے یا کیا بگاڑا ہے جب دیکھو ان ہی کے حال کی تفتیش،

ان ہی کی خبروں کی کرید - بھلا ایسی تاک جھانک میں کس کی شامت آئی ہے کہ رشوت کی
طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے - بادش بخیر تحصیلداری کا خدا بھلا کرے کہ دس بارہ برس
نبھ گئی تو ذرا پر پرزے بھی درست ہو گئے اور ایک خدا نے یہ بھی بڑا ہی کرم کیا کہ بیٹی پوتے
بہت نہ ہوئے - ساری عمر میں یہ ایک چنیچلا کہ خدا کرے جیتا رہے ورنہ گھر والی کا سلیقہ بھی
دھرا ہی رہتا - تو ایسی تھوڑی پونجی میں کیا تجارت کر سکتا ہوں - تحصیلداری ڈپٹی کلکٹری
کرنے کے بعد یہ تو مجھ سے ہونے کا نہیں کہ بساطی بنوں یا آٹے دال کی دکان کھول بیٹھوں
چار و ناچار دوسرے کی آڑ میں شکار مارنا ہوگا - تو وہ دوسرے ایسے کیا قرآن کا جامہ
پہنے ہوں گے کہ جو کمائیں گے میرے ہاتھ لا کر دھر دیں گے آٹا ہے کر نمک چھوڑ دیں تو غنیمت
غرض تجارت میں روپیہ لگانا تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا - دوسرا کہتا جناب تو آپ پرامیسری
نوٹ خرید لیجئے - اس سے مطمئن تر پیرایہ تو کوئی ہو نہیں سکتا - یہ برکت خدا نے سود ہی میں دی ہے
بیٹھے چڑھے سوتے چڑھے اور پھر نہ ہاری لگے نہ پھٹکری - چھ ماہی ہوئی اور اپنے ٹکے گنوا لیئے
نہ ہٹر پٹر نہ کھٹر کھٹر - تو والد فرمانے کہ کہتے تو سچ ہو - مگر فائدہ تو دیکھو - اونٹ کے مونھ میں زیرا -
کوہ کندن و کاہ برآوردن اپنی چھاتی تلے سے رقم نکال کر دو - اور برس بھر بیٹھے سیوا کرو -
اتنی زحمت کے بعد ملا کیا سو بیچ چار - دیکھو تو کیا چالاک قوم ہے - یہ کسی کے چھیپر بیٹھوں
نہیں رہنے دینگے - بادشاہ ہو کر رعایا سے لیں قرض - اور اُس کو ریلوں اور نہروں اور
فائدے کی چیزوں میں لگائیں - اور بیس بیس پچیس روپئے سیکڑا کمائیں - اور روپئے والوں کو
دیں چار - کیا کہوں نمک کھایا ہے ان کو خدا کی سنوار - اور پھر اس میں سے ٹیکس کی کٹوتی
اور کل کو عملداری اُٹھ گئی تو کاغذ کو لیئے چاٹا کرو - اور عملداری کا کس نے بیمہ لیا ہے -
روس آہستہ آہستہ بڑھتا ہی چلا آتا ہے امیر کابل کی آڑ تھی سو اُس کا یہ حال ہے کہ بہت کہتے ہیں

سیدھی اور وہ سمجھتا ہو الٹی۔ دیکھئے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہی۔ ناصاحب نوٹ کی صلاح تو ٹھیک نہیں۔ اس پر وہ صلاح کار بولا بس تو زمینداری۔

والد۔ ہاں میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ مگر کم بخت زمینداروں کی بھی شامت ہی دیکھتے نہیں آئے دن نقانے اور تحصیل میں کھنچے کھنچے پھرتے ہیں۔ اور اب زمینداری میں رہ ہی کیا گیا ہی۔ گودا گودا تو سرکار نکال لیتی ہی باقی بچی ہڈیاں۔ ان کو زمیندار اور کاشتکار ٹپے چچوڑا کریں۔ اول تو زمین میں وہ اگلے وقتوں کی سی پیداواریاں کہاں۔ اور جو ان کی جگہ نیسری رہ بھی گیا ہی تو کاشتکار ہی کا پورا نہیں پڑتا زمیندار کو کہاں سے دے۔ اور جب سے سرکار نے موروثی کاشتکاروں کے حقوق تسلیم کر لیے ہیں گانوں میں چوکیدار کی وقعت ہی۔ اور نہیں ہی تو زمیندار کی۔ یہ کسی کا کر ہی کیا سکتا ہی کہ کوئی اس سے دبے اور اس کا حکم مانے۔ پس زمینداری اب اس کا نام ہی کہ کاشتکاروں سے جو کچھ وقت پر منت سے خوشامد سے وصول ہوا اپنے پاس سے پورا کر کے سرکار میں بھرا اور حق زمینداری میں تحصیل والوں کی جھڑکیاں سنیں، دھکے کھائے، حوالات میں رہے۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔ گانوں میں واردات ہو گئی تو پہلا مجرم زمیندار۔ بہتیری تدبیریں کرتا ہی کہ بھلا کچھ بچے نہیں تو مہاجن کا سود تو پہنچتا رہے مگر برس کے دورے کی ٹڈیوں کا پڑاو ایک تدبیر کو پیش رفت نہیں ہونے دیتا

صلاح کار۔ پھر جناب آپ فائدے سے قطع نظر کیجئے اور جو کچھ آپ کے پاس ہی لیے بیٹھے رہیے مال عرب پیش عرب۔ اول تو آپ کی پنشن ہی اتنی ہو گی کہ آپ اس میں سے بھی کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیا کریں گے۔ گرہ سے نہ کھانا پڑے تو یہ فائدہ کیا کم ہی اور اگر آپ روپئے سے روپیہ کمانا چاہیں گے تو اس میں تھوڑی یا بہت زحمت بھی ہو گی۔ کم یا زیادہ خطر بھی ہو گا۔

والد۔ روپے کے معطل ڈال رکھنے کو تو طبیعت گوارا نہیں کرتی۔ دیکھو کوئی علاقہ ہی مول لوں گا۔
ہر چند زمینداری میں چند در چند قباحتیں ہیں پھر بھی میں خیال کرتا ہوں کہ ان لوگوں کو
زمینداری کرنی نہیں آتی ورنہ بہتیری گنجائشیں نکل سکتی ہیں اور جو ناجائز تکلیفیں زمینداروں کو
پہنچتی ہیں اکثر اُن ہی کی ناواقفیت کی وجہ سے۔ اور اگر ان کو پورے طور پر اپنے حقوق
اختیارات اور ذمہ داریاں معلوم ہوں تو اب بھی زمینداری بہا بہتر چیز ہے۔ اور میں
جو اس کو اپنے لیے پسند کرتا ہوں تو اس کی ایک وجہ خاص اور بھی ہے کہ اب میری
ہونے والی ہے پنشن۔ یوں تو تم دیکھتے ہو کہ خدا کے فضل و کرم سے میں کسی طرح کام سے
معذور نہیں۔ اب بھی چھ سات گھنٹے قلم ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔ اور دس کوس
پندرہ کوس بے تکان گھوڑے پر چڑھ سکتا ہوں۔ انگریزوں کی طرح پیدل دوڑا تو
نہیں جاتا لیکن یوں ہوئے ہوئے دو تین کوس چل لینا کچھ بات نہیں۔ غرض کوئی حاکم
مہربان ہو تو پچپن سالہ کے قاعدے سے مستثنیٰ ہو سکتا ہوں۔ مگر اب سرکار کا منشا نہیں کہ
ہم جیسے لوگ جن کو انگریزی نہیں آتی بڑے عہدوں پر رہیں تو ایسے سر پڑ کر نوکری کرنی
کیا ضرور ہے۔ اور سر پڑنا کیسا میں تو بہتیرا پاؤں پڑوں مگر اگلا ہاتھ بھی دھرے۔ تو میں
سوچتا ہوں پنشن ہوئے پیچھے کیا کروں گا۔ ساری عمر کام کرتے گزری تو کوئی نہ کوئی
مشغلہ ہونا ضرور ہے۔ زمینداری سے بہتر کوئی مشغلہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ تحصیل داری
اور ڈپٹی کلکٹری تو کہاں تاہم اس میں ایک طرح کی حکومت ہے۔ غرض ضلع بلند شہر کا
وہ مشہور گاؤں خداداد پور جو آپ نے سُنا ہو والد نے خرید لیا۔ دخل خارج میں بڑی دقتیں
پیش آئیں۔ آخر کار دیوانی کرنی پڑی اور ہائی کورٹ سے قبضہ ملا۔ اب والد کی پنشن
اور گاؤں کی آمدنی ملا کر چھ سات سو روپئے مہینے کی معقول یافت ہے۔ مگر چوں کہ والد کو

ہمیشہ سے جوڑنے کا مرض ہے میں اُن کو کبھی خوش نہیں دیکھتا اگرچہ وہ آپ انگریزی نہیں پڑھے اور اُن کے خیالات بھی کچھ ایسے شگفتہ نہیں ہیں مگر آخر ڈپٹی کلکٹری کرتے تھے۔ اتنی بات اُن کو زمانے نے سکھا دی تھی کہ مجھ کو انگریزی پڑھنا ضرور ہے۔ جبلّی کفایت شعاری کی وجہ سے وہ مجھ کو انگریزی پڑھواتے رہے۔ مگر کس طرح ؟ کہ اُن کے ملاقاتیوں میں سے یا انگریزی دفتر کے کرانیوں میں سے جہاں کسی کے پاس چلا گیا۔ یا کسی کو ڈپٹی صاحب کا ایسا ہی پاس و لحاظ ہوا تو تھوڑی دیر کے لیے اُس نے تکلیف کی۔ مَیں نے اس وجہ سے پانچ یا چھ برس انگریزی پڑھی اور جس کے باپ کو انگریزی نہ آتی ہو اُس کو ایسے طور پر پڑھنے سے جتنی اور جیسی انگریزی آنی چاہیئے مجھ کو آتی بھی تھی۔ اتنے میں تو سُن پڑا کہ کل سیّد احمد خاں آنے والے ہیں۔ ڈاک بنگلے میں ٹھیرینگے اور اگلے دن علی گڑھ کالج کے لیئے چندہ جمع کرنے کی غرض سے لکچر دیں گے۔ سید احمد خاں کا نام تو سُنتا ہی تھا میرے دل میں بھی گدگدی ہوئی کہ اُن کو دیکھوں اور لکچر سُنوں۔ بارے والد صاحب اُن سے ملنے گئے تو مجھ کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ والد سے اور اُن سے پہلے کی بھی ملاقات تھی۔ مجھے ساتھ دیکھ کر پہچان گئے ہوں گے کہ اُن کا بیٹا ہے۔ غرض میں نے دور سے بہت ہی جُھک کر سلام کیا۔ اور اُن کے فرمانے سے ایک کرسی پر مؤدب بیٹھ گیا۔ والد کی طرح لباس میرا بھی ہندوستانی تھا مگر سادہ اس واسطے کہ بڑھیا پوشاک نہ وہ آپ پہنتے تھے اور نہ مجھ کو زرق برق کے کپڑے پہننے دیتے تھے۔ والد صاحب اور سید صاحب دونوں باتیں کر رہے ہیں اور میں سر جھکائے سید صاحب کو کبھی کبھی نیچی نظروں سے دیکھتا جاتا ہوں۔ آخر والد صاحب نے کہا دیکھیئے آپ کی منشا کے مطابق میں بندہ زادہ کو انگریزی پڑھوا رہا ہوں۔

سیّد صاحب ۔ ایسا انگریزی پڑھوانا کیا فائدہ دے سکتا ہے جب تک تم اس کو جنٹلمین نہ بناؤ۔

اور تمھاری سوسائٹی میں رہ کر ہو نہیں سکتا۔ نری انگریزی پڑھ کر یہ بہت کرے گا تو ایک کرانی بننے کے لائق ہو جائے گا۔ اور رہا یک اسسٹنٹ اس کو ویسا ہی ذلیل سمجھے گا جیسا ہم لوگ کتے کو سمجھتے ہیں۔

والد۔ تو کیا میں اس کو کسی سکول میں داخل کر دوں؟

سیّد صاحب۔ اِن سکولوں اور کالجوں سے تو یہی بہتر ہے کہ تم اس کو گھر پر پڑھواؤ جیسا پڑھواتے ہو۔

والد۔ پھر آپ جیسا ارشاد فرمائیں۔

سیّد صاحب۔ ابھی تک آپ میرے ارشاد فرمانے ہی کے منتظر ہیں۔ میں ولایت تک کی خاک چھان آیا کئی برس مجھ کو بھیک مانگتے ہو گئے۔ اپنے اوپر کفر کے فتوے لکھوائے۔ گالیاں سُنیں۔ بُرا کہلوایا۔ ابھی تک آپ کو معلوم ہی نہیں کہ میں کیا ارشاد فرماتا ہوں۔ اے جناب میں آپ کی خدمت میں بمنت التماس کرتا ہوں کہ آپ اس کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ میں اس کو لے جا کر علی گڑھ کالج میں داخل کر دوں۔ ابھی تک آپ نے اس کو پڑھوایا ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کیا ہے۔ میرے اور آپ کے سامنے بھیگی بلّی بنا ہوا بیٹھا ہے۔ گویا یہ آدمی نہیں اور نہ یہ سمجھتا ہے کہ میں بھی آدمی ہوں اُس کو لے جاؤں گا اور آدمی بناؤں گا۔ اس کو سکھاؤں گا کہ تو کیا ہے اور تجھ کو کیا ہونا چاہیئے۔ یہ پہلے اپنی عزت آپ کرے گا اور پھر دوسروں سے طلبگار ہو گا کہ اس کی عزت کریں۔ اسسٹنٹ جنٹ کلکٹر کیا چیز ہیں۔ اس سے لاٹ صاحب کے آگے بھی ہاتھ نہیں جوڑے جائیں گے ہاتھ جوڑنے کے عوض یہ اُن سے شیک ہینڈ کرنا چاہے گا اور اُن کو شیک ہینڈ کرنا پڑے گا۔ اور وہ اس کے ساتھ شیک ہینڈ کرنے سے اتنے خوش ہوں گے جتنے تمھارے ہاتھ جوڑنے سے نہیں ہوتے۔ یہ انگریزوں سے ہنیں ملے گا

اس طرح پر جس طرح تم لوگ ملتے ہو کہ احاطے سے باہر سواری سے اُترے اور دبے پاؤں اندر گئے جس کی بڑی رسائی ہوئی شاگرد پیشیوں میں بیٹھا۔ ورنہ بذلت اور بے عزتی کے ساتھ دور دور پڑا پھرا۔ بڑی لمبی چوڑی عزت رکھتا ہو تو گھنٹوں کے انتظار کے بعد بلایا گیا۔ کھڑے کھڑے سلام کیا۔ رخصت۔ صاحب کچہری جانے لگے۔ ماوشما فراشی آداب بجالاتے دل میں فرض کر لیا کہ دیکھا او پہچانا خوشی خوشی واپس آئے اور گھر جا کر شیخی بگھاری۔ یہ انگریزوں سے ملے گا جس طرح ایک جنٹلمین ایک جنٹلمین سے ملتا ہو۔ ملاقات کے اوقات معلوم ہیں عین برآمدے میں سواری سے گئے۔ کارڈ بھیج دیا۔ صاحب آپ باہر آکر لے گئے۔ یا اُن کو ملاقات کے کمرے میں بٹھایا۔ طیار ہو کر آئے۔ ہاتھ ملایا۔ بٹھایا۔ جی کھول کر باتیں کیں۔ عزت سے گئے تھے، آبرو کے ساتھ رخصت کیا۔ اور ہمارے کالج کے لڑکے اسی طرح اب انگریزوں سے ملتے ہیں جج اور کلکٹر ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتے اور دوستانہ ان کے ساتھ مدارات کرتے ہیں۔

یہ باتیں ہو ہوا کر اُس وقت ہم دونوں باپ بیٹے رخصت ہوئے۔ اگلے دن سید صاحب نے مسلمانوں پر لکچر دیا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ لکچر تھا یا سحر تھا۔ سید صاحب آپ بھی روئے اور سُننے والوں کو بھی ایسا ایسا رُلایا کہ لوگوں کی ہچکی بندھ گئی۔ بندے کو ایک بار میر انیس کے سُننے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ عجب باکمال آدمی تھا۔ رزم پڑھ رہا ہے اور لوگ ہیں کہ اُچھل اچھل پڑتے ہیں اور ہر طرف سے واہ واہ اور تحسین کی صدا بلند ہے۔ کہ دفعتًا پکارا صاحبو اپنے اپنے رومال سنبھالو کہ میں کچھ رقت آمیز بند پڑھنے کو ہوں۔ اس کے بعد تو مجلس کی یہ کیفیت ہوتی تھی جیسے مرغ بسمل۔ میر انیس اہل بیت نبوی علیہ السلام کے مرثیہ خواں تھے۔ اور سید احمد خان مسلمانوں کی قوم کے مرثیہ خواں ہیں۔ وہ اپنے فن میں

طاق تھے، یہ اپنی شان میں یکتائے روزگار ہیں۔ اگرچہ میرے سامنے ہی سید احمد خاں صاحب نے والد سے مجھے علی گڑھ بھیج دینے کے لیے کہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ والد صاحب اتنا خرچ گوارا نہیں کر سکیں گے۔ دو بارہ والد اکیلے سید احمد خاں سے ملنے گئے۔ خدا جانے کیا سمجھایا کیا نہ سمجھایا کہ گھر آتے کے ساتھ میری کتابیں اور کپڑے بیگ میں رکھ مجھ کو سید صاحب کے ساتھ کر دیا۔ پہلے ہی مہینے میں دو سو ساڑھے بارہ روپیہ کا بل گیا۔ والد تو بہت گھبرائے کہ یہ کیا آفت آئی۔ اور سید صاحب کو لکھا کہ میں ایسی تعلیم سے باز آیا میرے لڑکے کو اُلٹا بھیج دیجیے۔ مگر اس لکھا پڑھی میں اتنا عرصہ گزرا کہ میرا جی لگ گیا تھا میں نے والد کو صاف لکھ دیا کہ میں پڑھوں گا اور علی گڑھ کالج ہی میں پڑھوں گا۔ نوبت بانیجا رسید کہ آخر کار والد صاحب خود تشریف لائے اور میرے ٹھاٹھ دیکھ کر بہت ہی ناراض ہوئے اور مارے غصّے کے یہ بھی تو نہ پوچھا کہ میں نے اتنے دنوں میں کیا ترقی کی ہے کہ آج میں کالج میں کرکٹ ٹیم کا کپتان ہوں، جمناسٹک میں ہمیشہ اول رہتا ہوں، تین بار رننگ ریس جیت چکا ہوں۔ پڑھنے میں میرا سائنس کمزور ہے مگر تلفظ ایسا اچھا ہے کہ کئی انگریزوں نے میرے موتھ پر تعریف کی ہے۔ تاہم میں امید کرتا ہوں کہ امسال انٹرنس ضرور پاس کروں گا۔ میں خانگی جھگڑوں کے بیان کرنے سے آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا خلاصہ یہ ہے کہ والد نے بات کا ایسا بتنگڑ بنایا کہ ناخوش ہو کر شہر میں جا رہے اور سارے کنبے کو جمع کر لیا اور مجھ پر ہر طرح کا دباؤ ڈالنا چاہا۔ مگر اصیل مرغے کی ایک ٹانگ میں نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنی ہٹ پر جما رہا۔ اور میں نے سب کو یقین دلا دیا کہ اگر میرے ارادے میں ناکامیابی ہوگی تو میں اپنے تئیں ہلاک کروں گا۔ چوں کہ میں ایک بیٹا ہوں اور سوائے اس کے کہ جنٹلمین کی شان سے رہنا چاہتا ہوں کسی طرح کا الزام میرے ذمے عائد نہیں ہو سکتا تھا۔ اور لوگ

والد کی کفایت شعاری اور جزرسی سے بے وجہ ناراض بھی تھے بسبب والد کی قائل معقول کیا کہ تمھاری یہ عمر آئی کہ تم گویا قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو اور تمھارے اندھیرے گھر کا یہی ایک چراغ ہے تم نے اب تک جو کچھ کیا اسی کے لیے کیا اور اب بھی جو کچھ کرتے ہو اسی کے لیے کرتے ہو۔ کیوں اس کو ضد دلاؤ؟ جوان لڑکا ہے ایسا نہ ہو اپنی جان پر کھیل جائے۔ اور اگر خراب کرنے پر آئے گا تو آج نہیں کل تمھارے بعد اینٹ سے اینٹ بجاوے گا۔ اُس وقت کون اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔ ہماری صلاح مانو تو خداداد پور اس کے سر مارو۔ یہ جانے اور اس کا کام جانے جو چاہے سو کرے۔ تم جب تک جیتے ہو پنشن ہے۔ تمھاری پلاؤ کی رکابی کہیں نہیں گئی۔ اور آخر کار یہ بھی بڑے نام و نمود کے کالج میں پڑھتا ہے اور سُنتے ہیں کہ یہاں لڑکوں کے چال چلن کی بہت نگرانی کی جاتی ہے۔ انگریزوں سے ملتا جلتا ہے اور یہ لوگ جیسے منتظم ہوتے ہیں ظاہر۔ کچھ تو ان کی خو بو اس میں بھی آئی ہوگی۔ دودھ پیتا بچہ نہیں۔ اتنا تو سمجھتا ہوگا کہ اگر جائداد کو ضائع کر دوں گا تو یہ اللے تللے کی زندگی کیسے نبھے گی۔ کچھ پس و پیش نہ کرو اور بسم اللہ کر کے خداداد پور پر اس کا نام چڑھوا دو کہ اسی کے سر پر بوجھ رہے۔ یہ خداداد پور جس پر اب میں اکیلا قابض و متصرف ہوں مجھے زندگی شروع کرنے کے لیے بہت ہے۔ اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ انٹرنس پاس کیا اور میں ولایت روانہ ہوا۔ خداداد پور پر مجھ کو پندرہ بیس ہزار روپیہ مل جانا کچھ بات نہیں تین برس میں ولایت رہوں گا بیرسٹری کے لیے قانون پڑھوں گا۔ انگریزی میری اب بھی اچھی ہے۔ ولایت میں اور بھی ہو جائے گی۔ بیرسٹری کے امتحان میں کسی کو فیل ہوتے سُنا نہیں۔ کچھ لکچر ہوتے ہیں کہ وہ سُننے پڑتے ہیں۔ بے شک میں اونچے درجے کی سوسائٹی میں ملوں جلوں گا۔ اور کسی نہ کسی مِس کے ساتھ اپنی پٹیس جماؤں گا۔ میں نے تحقیق سُنا ہے

کہ وہاں شادی کرلینا کچھ بات نہیں عورتوں کو مرد کم ملتے ہیں اور خوش حال آدمی پر مسیں اس طرح گرتی ہیں جیسے شہد پر مکھیاں۔ جب میں بیرسٹری کا ڈپلوما وہیم لے کر ہندوستان واپس آؤں گا تو میں سب سے زیادہ خوش نصیب آدمی ہوں گا دنیا میں"۔

ب۔ "نہیں نہیں۔ تم سب سے زیادہ بدنصیب آدمی ہوگے دنیا میں"

الف۔ "کیا اس وجہ سے کہ میں ولایتی بی بی کا خرچ نہیں چلا سکوں گا؟ ذرا مجھ کو بیرسٹری کا ڈپلوما تو لے آنے دیجیے دکھا دوں گا کہ انگریزی گفتگو کے ذریعے سے کتنا کما سکتا ہوں"۔

ب۔ "میں نے خرچ کے لحاظ سے نہیں کہا۔ آپ تو ماشاء اللہ بیرسٹری کے بدون بھی اتنا مقدور رکھتے ہیں۔ بلکہ میں نے اختلافِ صورت، اختلافِ مزاج، اختلافِ طبیعت، اختلافِ رسم و عادت، اختلافِ مذاق، اختلافِ وضع، اختلافِ مذہب، اختلافِ حالت کے اعتبار سے کہا کہ اتنے اختلافات کے ہوتے یہ پیوند محض بے جوڑ معلوم ہوتا ہے اور میں یقین نہیں کرتا کہ یہ گنگا جمنی رشتہ تم دونوں میں سے کسی کو بھی سازگار ہو"۔

الف۔ "اگر ہم طبیعت اور رسم و عادت اور کیا اور کیا کے ایسے مغلوب ہیں تو ہمارا اس کالج میں رہنا لاحاصل ہے۔ میں اپنے تئیں دیکھتا ہوں کہ بالکل بدل گیا ہوں اور نیٹو سوسائٹی سے مجھ کو سخت نفرت ہے۔ اور مجھ کو ان کی کوئی ادا نہیں بھاتی اور برسویں دن تعطیل میں بمجبوری گھر جاتا ہوں تو گھر مجھ کو پھاڑے کھاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ میں ولایتی بی بی لانی چاہتا ہوں"۔

ب۔ "یہ تمہارا خدعِ نفس ہے اور میں تمہاری رائے کی تردید میں اتنے واقعات چشم دید پیش کر سکتا ہوں کہ ان کو سننے کے بعد ضرور تم کو اپنی رائے بدلنی ہوگی میں نہیں کہتا کہ انسان اپنے اختیار سے اپنی کوئی چیز نہیں بدل سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو صحبت اور تلقین و تعلیم

اور افہام و تفہیم سب لغو و لاطائل ماننا پڑے۔ مگر ہاں بضرور میری رائے ہی کہ بعض باتیں
انسان میں ایسی بھی ہیں اور وہ شاید اُس کی خاص فطرت میں داخل ہیں کہ وہ ان کو
مشق و مہارت سے کم تو کر بھی سکے مگر مطلقاً معدوم نہیں کر سکتا۔ ازاں جملہ ایک مذاق ہی
کہ اس کی جڑ طبیعت سے نہیں نکلتی۔ بندے کے والد اصل میں دیہات کے ہیں۔ اور کوئی
دس گیارہ برس کی عمر سے شہر میں آئے۔ اور تب سے برابر شہر ہی میں ہیں مگر میں دیکھتا ہوں
تو اُن کی طبیعت چنے کے ساگ، بتھوے کی بھوجی، باجونی کی روٹی ایسی چیزوں کو
للچایا کرتی ہی اور باوجودیکہ گھر میں لوگ ان کو چھیڑتے بھی ہیں مگر وہ مذاق سے مجبور ہیں
اور جب کبھی اُن کو اپنی مرضی کی کوئی چیز مل جاتی ہی اگرچہ کم ملتی ہی اور مشکل سے
ملتی ہی مگر جب کبھی مل جاتی ہی تو ایسے چاؤ سے کھاتے ہیں کہ کبھی پلاؤ زردے کو بھی
اس رغبت سے کھاتے نہیں دیکھا۔ اس سے زیادہ عجیب ایک بات سنو کہ مسٹر فلاں کو
یہ انگریزی طرز اختیار کیئے ہوئے میں جانتا ہوں تیس برس سے بھی زیادہ ہوئے ہوں گے
تیس برس کی عادت کو طبیعت ثانیہ کہا جائے تو کچھ بےجا نہیں۔ اور چونکہ خدا نے
اُن کو بہت بڑا مقدور دے رکھا ہی جس قدر تکلّف سے رہنا چاہیں رہ سکتے ہیں،
اور یہ سارے نخرے دولت ہی کے ہیں۔ تو ان سے کوئی انگریزی شان چھوٹنے نہیں پائی
اور انگریز بھی ریل اور پولیس کے سٹرل یوریشین نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کے ولایت زاد۔
یہ صاحب ایک دفعہ پڑے بیمار۔ ہلکا سا بخار تھا مگر امیری چونچلے ان کے لیئے وہ بھی
بڑا ہی خطرناک تھا۔ دن میں گھنٹے گھنٹے بعد ٹمپریچر لیا جاتا تھا۔ انگریز تو بلا کے موجد ہیں
تھرمامیٹر کے قسم کی ایک نلی نکالی ہی اس سے حرارت کا درجہ معلوم ہوتا ہی جو چاہے دیکھ لے
اس نلی کے آگے نبض اور قارورے اور زبان کی رنگت کے دیکھنے کی ضرورت باقی نہ رہی

اُس نلی کو پہلے مریض کی بغل میں رکھتے تھے۔ اب مُونہ میں رکھنے لگے ہیں۔ آیندہ دیکھیئے کہاں رکھنا تجویز کریں۔ غرض دن میں گھنٹے گھنٹے ابعد ٹمپریچر لیا جاتا اور ایک کتاب میں لکھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر ٹمپریچر لے کر باہر آیا اور مریض صاحب کے اعزہ اور احباب اور خوشامدی اور اہل اغراض اُس کو آچمٹے۔ اُن لوگوں کو مریض کی حرارت کی اُتار چڑھاؤ کی ایسی لگی رہتی تھی کہ آج ایکسچینج کے اُتار چڑھاؤ کی بھی کسی کو بھی نہیں لگی رہتی۔ بعض کے تو ایسے مغز چلے ہوئے تھے کہ وہ مریض کا بُلیٹن نکالنے کی فکر میں تھے، جیسا آئے دن بڈھے گلیڈسٹن کا نکلتا رہتا ہی۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہی اور بخار ہی کہ جنبش نہیں کھاتا۔ ڈاکٹر نے اوپر تلے کونین کی ایسی بھرمار کی کہ اُس کی یبوست سے مریض کو ہکنا لگ گیا۔ اس ہکنے میں بیمار کو مہیر کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ بیمار داروں میں کوئی سمجھتا نہ تھا کہ مہیر کیا چیز ہی۔ اور جو اُن کے عزیز سمجھتے تھے وہ مارے شیخی کے بتا نہیں سکتے تھے کہ رسوائی ہوگی۔ مہیر غالباً جوار یا اسی قسم کے کسی اناج کے دلیے کا نام ہی جو دیہات میں چھاچھ کے ساتھ پیا جاتا ہی۔ بیمار نے کبھی بچپن میں اپنے گھر مہیر پیا ہوگا اور اُن کی روح مہیر میں ایسی پڑی تھی کہ ہکنے میں مہیر ہی مہیر رٹتے تھے۔ تو جب ایسے شخص کا مذاق نہ بدلا تو کیوں کر باور کر لیا جائے کہ تمھارا یا کسی کا مذاق بدل سکتا ہی اور یہ تو میں نے مثال کے طور پر بیان کیا۔ کتنی ایسی باتیں ہیں کہ طبیعت میں جمیں تو جمیں پھر ساری عمر نہیں نکلتی۔ کیا تم پسند کروگے کہ تمھاری بی بی فُل ڈرس پہنے؟ کیا تم پسند کروگے کہ وہ غیر مردوں کے ساتھ بغل گیر ہو کر بال میں ناچے، بشرطیکہ تمھارے تعلق کی وجہ سے کوئی انگریز اس کے بال میں بُلانے یا آنے کا روادار ہو؟ کیا تم پسند کروگے کہ وہ اجنبی لوگوں کے ساتھ آمد و شد یا خط و کتابت رکھے اور تم اُس سے اتنا بھی نہ پوچھ سکو کہ کہاں جاتی ہو یا اتنی دیر کہاں رہیں، یا کس کا خط ہی اور کیا لکھا ہی؟ شاید تم اپنی بات کی پیچ پر آکر کہہ دوگے

کہ ہاں پسند کروں گا۔ اور بے شک تم اس وقت ایسا ہی خیال کرتے ہو گے۔ مگر بھائی جان منہ سے کہہ دینا آسان ہے اور عمل میں لانا مشکل جب تمھاری بی بی کے ساتھ تمھارے دیکھتے کوئی لگاوٹ کی باتیں کرے اور تم کو بُرا نہ لگے تو جانیں جب تک تمھاری رگوں میں ہندوستان کا بلکہ مجھ کو کہنا چاہیئے مسلمان کا خون ہے ممکن نہیں کہ تم ایسا اختلاط، ایسا گاڑھا ربط ضبط، ایسی بے تکلفی دیکھو اور بدگمان نہ ہو۔ الرجال قوامون علی النساء[1] کی آواز اُس وقت سے ہمارے کان میں پھونکی گئی ہے جب ہم صرف اتنا ہی سمجھتے تھے کہ عورت ماں کو کہتے ہیں اور مرد باپ کو یا عورت بہن کو کہتے ہیں اور مرد بھائی کو۔ اور اگرچہ مسلمان اپنے مذہبی احکام کی تعمیل میں بہت پہلو تہی کرنے لگے ہیں مگر الرجال قوامون علی النساء کے قاعدے پر بڑی سختی اور مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں۔ اور ہمارا قومی مزاج اسی قسم کا واقع ہوا ہے کہ ہم عورتوں پر حکمرانی کرنے کو اپنا حق لازمی سمجھتے ہیں۔ اور ہم نے ہر ایک گھر میں اس قاعدے کو ایسے عام طور پر برتے جاتے دیکھا ہے کہ جہاں کہیں اس کے توڑنے کا نام لیا جاتا ہے وہیں فساد ہوتا ہے۔ جب تم کو شخصی مزاج کے بدلنے پر پوری قدرت نہیں تو قومی مزاج بدرجۂ اولی تمھارے بس کا نہیں۔ اور یورپ میں بالکل اس کا اُلٹ ہے النساء قوامات علی الرجال۔ تو تمھارا انگلش لیڈی سے شادی کرنا اور سازگاری کی اُمید رکھنا اس سے زیادہ امکان وقوعی نہیں رکھتا جیسے کوئی شخص جون اور دسمبر کو ملا کر ایک معتدل موسم بنانا چاہے۔ میاں بی بی کے ایک اختلاف سے دونوں کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے نہ کہ اتنے اختلافات کہ تم اور انگلش لیڈی میں سوائے اس کے کہ دونوں آدمی ہو اور کوئی صفت مشترک نہیں۔ علاوہ اس کے جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنا تو کچھ ٹھیک بات نہیں۔ ولایت کی بات تو رہی ولایت کے ساتھ، اس ملک میں ہم ہندوستانیوں کو

---

[1] عورتوں کے کار فرما مرد۔

ولایت کی سی آزادی تو نہ نصیب ہوئی ہے اور نہ کبھی نصیب ہو گی۔ ہم میں اور انگریزوں میں فاتح و مفتوح کا تفرقہ ہے جو نہ مٹا ہے اور نہ مٹ سکتا ہے۔ بنگالی بڑے بڑ بڑائیں اور سید احمد خانی بلا سے اپنے منہ میاں مٹھو بنیں۔ یہاں کے انگریزوں کو کب خوش آتا ہے کہ ہم ان کو چھیڑیں اور چڑائیں۔ کوٹ پتلون پہننے تک کا تو خیر چنداں مضائقہ نہ تھا بعض کریم النفس انگریز ایسا برا نہیں بھی مانتے۔ مگر داماد بننا تو ہمارے یہاں بھی کھلی کھلی بے نقط گالی ہے تو تم انگلش لیڈی لا کر اپنی عزت تو کیا بڑھاؤ گے اُس بے چاری کو بھی اُس کے ہم وطنوں اور ہم قوموں کی نظر میں ذلیل کر دو گے اور اِس گستاخی کا خمیازہ بھگتو گے سوا الگ۔ انگلش سوسائٹی تم کو اپنے میں لے گی نہیں اور ہندوستانی سوسائٹی سے خود تم کو گریز ہو گا تو تم دو میاں بی بی شہر کے باہر اکیلے بنگلے میں پڑے کیا بھلے لگو گے ؟ از یں سو رانده وز اں سو درمانده ممکن ہے کہ شروع شروع میں تم کو میم صاحب کے ساتھ ایسا شغف ہو کہ کسی کا کسی وقت خلل انداز صحبت ہونا تم کو پسند نہ ہو۔ لیکن پھر سوسائٹی کی تم کو حاجت ہو اور ہو تو انگلش لیڈی کے تمہارے قید نکاح میں آنے سے تم دونوں کو ساری عمر قید تنہائی میں رہنا ہو گا اس کو سمجھ لو"

الف ۔"خیر تو میں یوریشین لیڈی کر دوں گا"

ب ۔ ع نہ بریں عقل و دانش بباید گریست۔ لے وہ ... نہیں چھی چھی۔ بات تو وہی کی وہی رہی اور اگر تمہاری قسمت میں یہی مصیبت لکھی ہے تو انگلش لیڈی بمدارج بہتر۔ دوغلے نہ اُدھر نہ اِدھر یہ بڑا کدھر عیب دیکھو تو چن چن کر دونوں قوموں کے موجود و ہنر کے تام نہ اُن کے نہ اِن کے اور ایسی ہی نسل تم بھی چلانی چاہتے ہو کہ خچر کی طرح پوچھیں باپ کو تو بتائے ماں کو۔"

اس پر ایسا قہقہہ اڑا کہ بے چارے **الف** ہمزہ کے سے بل کھا کر رہ گئے۔ اس کے بعد کمیٹی کے کئی جلسوں میں اس پر بحث رہی کہ اگر آدمی کو اپنے پسند کی بی بی کرنے کا موقع ملے تو

اس کو کون سی صفت کا گرویدہ ہونا چاہیئے۔ اکثر کی یہ رائے تھی کہ حسن صورت کا اس واسطے کہ یہی حسن صورت ہی جو ابتداءً مرد اور عورت میں کٹنی کا کام دیتا ہی لیکن ہماری کمیٹی کے معزز ممبر ص لبسر جن کی رائے پر ان معاملات میں اکثروں کا صاد ہوتا ہو۔ کہتے تھے کہ نہیں ہیں اُن کی عبارت ہی بلفظہا کیوں نہ نقل کروں جس سے ان کا مطلب بخوبی سمجھا جائے۔

اُنھوں نے کہا کہ حسن صورت کی مخالفت سے میری یہ غرض نہیں کہ دلوں کو حسن صورت کی طرف سے پھیر دوں۔ اُس کی پسندیدگی کو میں قریب قریب تقاضائے طبیعت سمجھتا ہوں۔ مگر ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ جس طرح انسان اور بہت سے بے اصل خیالات کیا کرتا ہو ان میں سے ایک حُسن صورت بھی ہی۔ ہر ایک ملک کے آدمیوں نے ایک خاص طرح کے رنگ ایک خاص طرح کے تناسب اعضا کو اچھا سمجھ رکھا ہو اور کوئی پوچھے کہ کیوں تو کچھ بتا نہیں سکتے۔ لیکن یہ خیال ایسا راسخ اور ایسا عام ہو کہ دُنیا کے فسادات میں سے ایک نہائی ضرور اس کی وجہ سے ہیں چنانچہ لوگ زر۔ زمین۔ زن تین چیزوں کو برابر کے درجے میں فساد کی جڑ کہتے بھی ہیں۔ کوئی ایسا ہی زبردست حکیم یا صوفی ہو تو اس خیال کو مٹائے یا دبائے۔ خدا جانے مزاج کی نفاست ہی یا جنون ہو ما جس کو دیکھو حسن صورت پر مفتون ہی۔ حسن صورت بے اصل ہو یا نہ ہو مگر اس کے بے ثبات ہونے میں تو کچھ شک نہیں۔ تو میرا کہنا یہ ہو کہ اگر صرف حسن صورت مدار تعلق زناشوئی ہو تو دونوں میں کئے دن نبھے گی۔ ایک طرف خدا کا فرمان ہو کہ آدمی پیدا ہو اور ماں کے دودھ سے پرورش پائے۔ پھر جب دودھ کفایت نہ کر سکے تو اُس کو غذا کی چاٹ لگے۔ اور غذا کے چبانے اور نرم کرنے کے لیئے اس کے دانت نکلیں اور تا کہ ایک حد تک وہ جلد جلد بڑھے۔ اور اس کی جسمانی اور دماغی قوتیں ترقی پکڑیں اس کے اعضا میں پھرتی ہو اور حواس میں تیزی پھر وہ چندے ایک حالت پر ٹھہرے

اور پھر از خود گھٹتا اور مضمحل اور کمزور ہوتا جائے۔ **قطعہ**

ایک وقت تھا کہ ٹوٹتے تھے دانت دودھ کے پھر یہ ہوا گزرنے لگی کھیل کود کے

اب حال یہ ہی عالم پیری میں اے ظفر باقی نہیں حواس بھی گفت و شنود کے

اور جیسے ابتدا میں مٹّی سے بنا تھا آخر کار مٹّی میں جا ملے ۔ منہا خلقنا کم[1] وفیہا نعید کم و

منہا نخرجکم تارۃ اخرے غرض ایک طرف تو خدا چاہتا ہو کہ یہ خاک کا پتلا دنیا کی بھول بھلیوں

میں گشت کرکرا کے اپنی جگہ پر لوٹ آئے دوسری طرف آدمی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدا ہی مسجد

بنانے کی فکر میں ہو۔ وہ بھول بھلیوں میں آکر سب کچھ بھول بِسر گیا اور سمجھتا ہو کہ بھول بھلیاں

میرا گھر ہو تو میں اس سے نکلوں کیوں ؟ اور باہر جاؤں کس لیے ؟ یہ قدم قدم پر ٹھٹکتا اور

مچلتا ہو۔ لیکن خدا کی طرف سے ایک مصیطر اس کے پیچھے لگا ہو۔ وہ اس کو ٹھیرنے نہیں دیتا۔

یہ رکا اور اُس نے آگے کو دھکّا دیا، یہ اڑا اور اُس نے ہانکا۔ اس کی بیہودہ ہٹ تو دیکھو

کہ جوانی تو جوانی پیری تک چاہتا ہو کہ میں بچّہ ہی بنا رہوں۔ و رنہ سٹھیا جانے اور ستّرے

بہتّرے ہونے کے معنی کیا۔ اس نے جوانی کا رنگ و روغن باقی رہنے کے لیے پوڈر اور

خضاب نکالے ہیں ؎

باقی ہو شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی کالا کرے گا مُنہ بھی جو ڈاڑھی سیاہ کی

دانتوں کے لیے منجنوں اور غراروں کے علاوہ یہ بنارش کی ہو کہ اِن کو باندھ باندھ کر رکھتا ہو

لیکن یہ سب دھوکے کی ٹٹیاں ہیں ؎

گر فتم سال را کردی نہاں با موچہ ی سازی گر فتم موئے را کردی سیہ بارو چہ ی سازی

---

[1] ہم نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور زمین ہی میں تم کو لوٹا کر لائیں گے، اور اسی سے پھر ایک بار تم کو نکال کھڑا کریں گے۔

آدمی اپنے جیسے احمقوں کو بہکا سکتا ہے مگر خدا کے آگے اس کی ایک نہیں چلتی۔ اگر مرا نہیں تو جو بچّہ ہی وہ جوان ہو گا ضرور۔ جوان بوڑھا ہو گا بے شک۔ بوڑھا ایک نہ ایک دن مرے گا لا کلام انسان کو خدا نے عقل دی ہی اور صاحب فہم و شعور بنایا ہی۔ اُس کو کیا زیبا ہی کہ نادان بچوں کی طرح چند روز زرق برق اور عارضی چمک دمک پر فریفتہ ہو۔ اور جو شخص ایسی چیزوں سے متلذذ ہوتا ہی اُس کی حالت اُس شخص سے زیادہ اطمینان کے لائق نہیں کہ ایک دریا ہی عمیق جس کی تھاہ نہیں اور اُس میں ایک جگہ ایسا بھنور پڑتا ہی کہ اس کا گرا ہوا کبھی اُچھلا ہی نہیں، اور اس میں بے شمار مردم خوار ناکے اور گھڑیال منہ کھولے پھرتے ہیں۔ اِس بھنور کے عین کنارے پر وہ شخص کھڑا ہی اور کنارے کی مٹّی ایسی بھُربھری ہی کہ ہمہ وقت دریا اُس کو کاٹتا رہتا ہی کیا بھروسا ہی کہ یہ شخص کس وقت غڑاپ سانی بھنور میں جا رہے گا، اور کیا معلوم بھنور میں گرے پیچھے اس کو کوئی جانور نگل لے گا یا پانی کا گھماؤ اس کو نہیں اُچھلنے دے گا۔ یہی حال حُسن پرستی کا ہی۔ خدا کسی بھلے مانس کو اس کی چاٹ ہی نہ لگائے۔ جن لوگوں کو اس کی لت پڑی دیکھی ہی اول تو اُن کی نیت کچھ ایسی ڈانوا ڈول ہو جاتی ہی کہ نہ موقع دیکھیں نہ محل اچھی صورت سامنے آئی اور ان کی رال ٹپکی۔ دوسرے وہ جو کہا ہی حبّك الشیٔ یعمی ویصم[1] بس اسی محبت پر صادق آتا ہی لوگوں نے اس کے پیچھے مال تلف کیے، آبروئیں کھوئیں، اور بہتیروں نے جانیں بھی گنوائیں اور اس میں مبتلا بھی اکثر وہی لوگ ہوتے ہیں جو بازاری طور کے ہیں بدوضع، آبروباختہ، لوگوں کی نظروں میں سبک۔ کچھ تو دین نے روک تھام کی اور بہت کر کے لوگ ان خرابیوں کو بھی دیکھ کر ڈرے جو حُسن پرستوں کو آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں

---

[1] کسی چیز کی محبت آدمی کو اندھا بہرا کر دیتی ہی۔

ضرور پیش آتی ہیں۔ اس سے یہ ہٹ کے ہیتوں کو نہیں اُبھرنے پائی ورنہ ہمارے یہاں کی شاعری نے تو بچّے بچّے کو فرہاد و مجنوں بنا ڈالا ہوتا اور پھر دیکھتے اُس کی جان کا دشمن ہیں، اور میرے خون کے پیاسے تم۔ لیکن کان پڑی ہوئی آواز خالی تھوڑی جاتی ہے جن کے مُنہ پر مُہر ہے اُن کے بھی دلوں میں دفتر لکھے پڑے ہیں جو آنکھ بھر کر نظر کرنے کو جائز نہیں رکھتے ساری رات اسی کے خواب دیکھتے ہیں۔

یہ تقریر سُن کر سارے ممبروں میں ایک سنّاٹا سا گزر گیا۔ اور کسی سے اتنا نہ ہو سکا کہ حُسنِ صورت کی تائید میں ایک لفظ تو مُنہ سے نکالتا۔ اس کے بعد جو کمیٹی کا جلسہ ہوا تو ایک صاحب نے چھوٹتے ہی یہ سوال پیش کیا کہ اگر کسی کو اتفاق سے دولتمند بی بی ملتی ہو تو کمیٹی اُس کو کیا رائے دیتی ہے۔

م۔ "دُنیا میں اس سے بدتر کوئی ذریعہ معاش ہو نہیں سکتا۔ اور جن لوگوں کو ایسی دولت مل گئی ہے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور اس کی مثالیں کثرت سے تو نہیں مگر ہاں موجود ہیں۔"

س۔ "لیکن لوگوں کو کیا حق ہے کہ ایسے شخص کو ذلیل سمجھیں۔ اُس نے کسی کا مال نہیں مارا۔ چوری نہیں کی۔ امانت میں خیانت نہیں کی۔ کسی ناجائز طریقے سے روپیہ نہیں کمایا۔ دُنیا میں ایسے بہت لوگ ہیں جن کو خدا بے زحمت دے دیتا ہے۔ لوگوں کو بخت و اتفاق سے کبھی کے دبے گڑے خزانے مل مل گئے ہیں۔ یا کسی اور طور پر غیر متوقع فائدے پہنچے ہیں اور ۹۰ جو کہتے ہیں کہ خدا دینے پر آتا ہے تو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔ نری خیالی بات تو نہیں ہے ایسا ہوا ہے اور ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ سینکڑوں ہزاروں آدمی ایک ہی ذریعے سے معاش پیدا کرتے ہیں۔ سب کے سب کی ایک حالت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص بی بی کے

ذریعے سے مال دار بننا چاہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی قباحت نہیں۔ شاید دُنیا میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں نکلے گا جس نے دوسرے کی دولت سے فائدہ نہ اُٹھایا ہو۔ اور نہیں تو اس نے بزرگوں سے ہی کچھ نہ کچھ میراث میں پایا ہو گا تو وہ دوسرا شخص بی بی ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ جو آپ نے کہا کہ لوگ نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ رشک و حسد اس کا باعث ہوتا ہو گا جس سے شاید کوئی نفس بشر خالی نہیں۔ لوگ کسی کی دودوا اور چُپڑی نہیں دیکھ سکتے۔"

م۔ "تو کیا آپ اسی کو جائز رکھتے ہیں کہ شوہر بی بی کا کنونڈا ہو کر رہے؟"

س۔ "یہ سوال خارج از بحث ہے۔ اول تو ضرور نہیں کہ ہر ایک مال دار بی بی اپنے مال دار ہونے کی وجہ سے نکتوڑے کرے اور فرض کیا کہ کرے تو شوہر کو یوں بھی بی بی کی ناز برداری کرنی ہی پڑتی نہ کہ مال دار بی بی کی۔ اور اگر مرد ایسا تنک مزاج ہو اور بی بی کے ساتھ اس درجے کی مغایرت برتنا چاہتا ہو تو ایسے شخص کو بی بی ہی کرنی کیا ضرور ہے۔ اور ایسی مثالیں بھی میری سماعت میں آئی ہیں کہ مال دار بیبیوں نے رفع بدگمانی کے لیے معمول اور توقع سے زیادہ شوہروں کی اطاعت کی ہے۔"

م۔ "کچھ بھی ہو۔ اپنی حمیت تو تقاضا نہیں کرتی کہ جورو کے دست نگر ہو کر رہیں۔"

س۔ "آپ شاید کسی بات میں بھی بی بی کا شوہر سے بہتر ہونا پسند نہیں کرتے؟"

م۔ "بے شک۔"

س۔ "صورت شکل میں بھی؟"

اب تو م صاحب سٹ پٹائے اور ایک تیسرے صاحب ج۔ بولے "نہیں، کہاں یہ۔ کہاں صورت شکل۔ صورت شکل عورت کی صفت لازمی ہے۔"

س "صورت شکل پر بھی عورت کو ویسا ہی ناز کرنے کا موقع ہے جیسا دولت پر۔"

ج "ہاں لیکن وہ ناز اور قسم کا ہے اور یہ ناز اور قسم کا۔"

اس ردّ و کد میں کوئی بات طے ہوتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی تھی کہ **ص** صاحب نے کھڑے ہو کر فرمایا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اس خاص بارے میں خدا کا فرمودہ موجود ہے۔ جس سے بخوبی اس نزاع کا فیصلہ ہو جاتا ہے وہ جو میں نے کمیٹی کے کسی جلسے میں قرآن کی ایک آیت پڑھی تھی الرجال قوامون علے النسآء وہ حقیقت میں پوری آیت نہیں بلکہ آیت کا جزو ہے اور مجھ کو اُس وقت اُسی جزو سے کام لینا تھا اُس جزو کے ساتھ اتنا اور بھی ہے الرجال قوامون علے النسآء بما فضل اللہ بعضھم علے بعض وبما انفقوا من اموالھم اس آیت میں خدا نے عورتوں پر مردوں کے قوم یعنی حکمران ہونے کے دو سبب بیان کیے ہیں۔ ایک مردوں کی فضیلت مطلقہ عورتوں پر لیکن وجوہ فضیلت بیان نہیں فرمائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً مرد مطلقاً عورت پر فضیلت اور برتری رکھتا ہے۔ اور یہ فضیلت خلقی ہے اس قسم کی جیسے انسان کی فضیلت جانوروں پر کہ گھوڑا اگرچہ وہ نجد عرب کا ہو اور اگرچہ وہ کابُک کی نسل مستند کا ہو۔ تاہم اُس پر فضیلت ہے انسان کو اگرچہ وہ حبشی یا وحشی یا گونڈ یا بھیل ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرا سبب عورتوں پر مردوں کے حکمران ہونے کا فرمایا ہے۔ بما انفقوا من اموالھم کہ مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ یعنی مہر دیتے اُن کے نان و نفقے کا بار اُٹھاتے۔ تو جو شخص عورت کا دست نگر ہو کر رہنا چاہے وہ پھر بھی قوام ہوگا اس لیے کہ اُس کی خلقی فضیلت باقی ہے جو اس سے کسی حالت میں جدا نہیں ہو سکتی، مگر ادھورا۔ کیوں کہ اُس کو وہ دوسری خرچ کرنے کی فضیلت حاصل نہیں۔ اور جو شخص مالدار بی بی ڈھونڈھتا ہے آخر کوئی نہ کوئی اُس کی غرض و غایت تو ضرور ہوگی اور وہ بجز اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ وہ بی بی کے مال سے متمتع ہونا چاہتا ہے۔ اور یہ دلیل ہے اُس کے تنسوزمت کی۔ اور افسوس ہے کہ ہمارے کالج کا کوئی طالب العلم ہماری کمیٹی کا کوئی ممبر

ایسے پست خیال کو ایک منٹ کے لئے بھی اپنے دل میں آنے دے۔ آخر دولت آدمی ہی پیدا کرتے ہیں اور جو دوسرے آدمیوں نے کیا ہی یا دوسرے آدمی کرتے ہیں کیا وجہ کہ ہم نہ کرسکیں اور اگر ہم ہمت ہار دیں گے تو بُرے نمونے ہوں گے اپنے ابنائے جنس کے لئے اور موجب بدنامی ہوں گے اپنے کالج کے حق میں، جس رسوائی سے خدا ہم سب کو بچائے"۔

اس پر آمین کے غُل سے سارا کمرہ گونج اُٹھا اور جلسہ برخاست ہوا۔ ہماری کمیٹی میں شہری دیہاتی کسی کی خصوصیت تو نہیں مگر اتفاق سے جتنے ممبر ہیں سب شہری، دلّی آگرہ لکھنؤ بنارس کے رہنے والے۔ الّا ایک صاحب شیخ کہ وہ ضلع سہارن پور کے رہنے والے ہیں۔ یہ صاحب حاضر ہونے والے تو ایسے جیّد ہیں کہ شروع سے لے کر اب تک کمیٹی کا کوئی جلسہ نہیں ہوا جس میں یہ نہ رہے ہوں۔ سنتے تو بڑی توجہ سے رہتے ہیں مگر آپ کچھ دخل نہیں دیتے۔ آخر ایک دن خدا جانے کس نے کہا کہ آپ بھی تو کچھ فرمایا کیجئے تو لگے کہنے کہ "مجھ کو تمھاری کمیٹی کے مباحثوں میں مزہ تو بہت ملتا ہی مگر مجھ کو اس کمیٹی سے کوئی ذاتی تعلق نہیں اس لئے کہ میں ٹھہرا دیہات کا رہنے والا۔ ہمارے یہاں بڑی قیدیں ہیں اور وہاں انتخاب کا قاعدہ چل نہیں سکتا۔ عورت تو عورت ہمارے یہاں کوارا مرد بھی گو وہ کیسا ہی جوان ہو اپنے بیاہ برات کے معاملے میں بھلی یا بُری کوئی بات منہ سے نہیں نکال سکتا۔ وہ لوگ اس کو پرلے درجے کی بے حیائی سمجھتے ہیں۔ دوسرے ہم ہیں جتھے اور برادری کے لوگ کوئی کتنا ہی امیر ہو یا کیسا ہی پڑھ لکھ جائے اگر اس کو دیہات میں رہنا ہو تو چار و ناچار برادری کے قاعدوں کی پابندی کرنی پڑے گی۔ یہاں تک کفو کا لحاظ کیا جاتا ہی کہ مثلاً میں شیخ ہوں، اول تو ہونے ہی کیوں لگا، لیکن اگر بالفرض سیّد بھی مجھے بیٹی دینے پر راضی ہو تو میں نہیں لے سکتا"۔

شیخ صاحب تو اتنا کہہ کر چُپ ہو گئے اور اس پر بہت سے ممبر گفتگو کرنے پر آمادہ معلوم ہوئے تو

جلسے کے پریزیڈنٹ نے کہا کہ شیخ صاحب نے بات تو مختصر کی مگر اس میں دو امر بڑے بحث طلب اغراض کمیٹی سے متعلق ہیں۔ ایک شرافت، دوسرے شرم۔ میں امید نہیں کرتا کہ آج کے جلسے میں دونوں امر طے ہو سکیں گے تو جن صاحب کو کچھ کہنا ہو شرافت کی نسبت اپنا خیال ظاہر کریں اور شرم کو اگلے جلسے پر ملتوی رکھا جائے۔

الف "میرے نزدیک شرافت یعنی شرافتِ نسب کوئی چیز نہیں۔ ہمارے پاس عقلی شہادت موجود ہے کہ کل آدمی ایک آدم کی اولاد ہیں۔ ان کی جسمانی بناوٹ، ان کی خواہشیں، ان کی ضرورتیں سب یکساں ہیں۔ کسی کو کسی پر ترجیح نہیں۔ یہی وہ خیال ہے جو میرے نزدیک سب سے زیادہ ہم مسلمانوں کے تنزّل کا باعث ہوا۔ جو لوگ شریف گنے جاتے ہیں وہ شرافت کی شیخی میں آ کر کسی طرح کا کمال حاصل کرنا نہیں چاہتے اور جو لوگ رذیل سمجھے جاتے ہیں اُن کو لیاقت کے پیدا کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔"

د "نہیں نہیں۔ شریف و رذیل کیسے برابر ہو جائیں گے۔ کہنے کو تو آدمی وہ بھی آدمی یہ بھی، مگر آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ اول تو صورت سے شریف و رذیل الگ پہچان پڑتے ہیں۔ شریفوں کو دیکھو گے اکثر رنگ کے گورے، چہرے مُہرے کے درست، صورت شکل کے پاکیزہ، متناسب الاعضاء، نازک، کہ دیکھنے سے جی خوش ہوتا ہے۔ اور رذیل ہیں کہ اُن کی صورتیں ہی کچھ دوسری طرح کی ہوتی ہیں۔ بکّی بکّی، بھنگم، کرخت، بد رنگ۔ اور یوں کہ یہ فرق پیدائشی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی مرضی سے ہے جیسے گھوڑا اور گدھا کہ خدا نے دونوں کو یکساں نہیں بنانا چاہا اور نہ وہ یکساں ہیں اور نہ کوئی ان کو یکساں سمجھ سکتا ہے۔"

الف "یہ قیاس مع الفارق ہے۔ اگر ذلیلوں کی یعنی اُن لوگوں کی جن کو تم رذیل کہتے ہو صورتیں اچھی نہیں تو اس کی وجہ ہے کہ اُن کو معاش پیدا کرنے کے لیے محنتیں کرنی پڑتی ہیں۔ وہ گرمی کے دنوں میں میر نہیں اور مرزا بھویا بن کر تہ خانوں میں رہ نہیں سکتے۔ دھوپ اور مینہ

اور سردی سے بچنے کے لیے نہ اُن کے پاس سامان ہو کہ اُن کا رنگ میلا نہ ہو۔ اور نہ وہ بیکار رہ سکتے ہیں کہ اُن کے اعضا نرم اور پلپلے ہوں۔ اُن کی یہ حالت داغ خود غرضی ہو انسان کے ناصیہ حال پر جو کسی طرح دُھل نہیں سکتا۔ کیا حق رکھتا ہو ایک شخص اتنا کھا جانے کا کہ اُس کے ہضم کرنے کے لیے اُس کو چورن کی ضرورت ہو جب کہ اسی جیسے ہزاروں بندگان خدا مارے بھوک کے انتڑیوں کو مسوس کر رہ جاتے ہیں؟ کیا حق رکھتا ہو ایک شخص قیمتی دوشالہ اوڑھنے کا جب کہ دوسرے آدمی کو کمل بھی نصیب نہیں؟ کیا حق رکھتا ہو ایک شخص خدا کی دی ہوئی دولت کو شیخی اور نام و نمود میں لٹانے کا جب کہ بہتیرے ایک مٹھی چنوں کے لیے کوڑی کوڑی مانگتے پھرتے ہیں اور نہیں ملتی؟ دُنیا میں جس قدر مصیبت ہو صرف اس وجہ سے ہو کہ ہم میں سے جتنے آرام پر ہیں کا قابو چلا دبا بیٹھا، چنکی کی جگہ مٹھی، مٹھی کی جگہ لپ، لپ کی جگہ جھولی، جھولی کی جگہ گٹھری، گٹھری، ڈھیری، ڈھیر، پہاڑ۔ مجھ کو تو ہنسی اس بات پر آتی ہو کہ کرتوت تو یہ ہو اور اس پر بعض کو دعوے ہیں ہمدردی کے، دین داری کے، رحم کے، جود و سخا کے، بذل و ایثار کے، غرض ہیں حضرتِ انسان بھی عجائب المخلوقات کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ کرنا چاہیے کیا اور کر رہے ہیں کیا؟

وُہ- لیکن شریف و رذیل کی عادت اور طبیعت کا فرق بھی تو دیکھیے۔ انتظام دُنیا اسی طرح پر واقع ہوا ہو کہ سب لوگ ایک حالت کے نہ ہوں تو ایک محتاج ہو دوسرا محتاج الیہ۔ ایک آمر ہو دوسرا مامور ایک خادم ہو دوسرا مخدوم۔ اور اگر سب کی ایک ہی حالت ہوتی تو دُنیا کا انتظام دگرگوں ہوتا۔ آپ اگر سب کو ایک حالت کا بنانا چاہتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ انتظامِ الٰہی میں دخل دیتے ہیں آج تو آدمی ہی کل کو آپ جانوروں کی وکالت کریں گے کہ یہ بھی جان رکھتے ہیں۔ ان کو بھی الم و تکلیف کا احساس ہو۔ آدمی کیوں ان پر سوار ہو، کس لیے ان پر بوجھ لادے، ان سے محنت مشقت کے کام لے، اور سب سے بڑھ کر کیوں کس واسطے اپنے مزے کے لیے ان کو جان سے مارے۔ پھر آپ

اور ترقی کریں گے تو درختوں کا ترس کھائیں گے کہ ان کی بھی ایک طرح کی زندگی ہے۔ لکڑی نہ کاٹو، پتّہ نہ توڑو، ایندھن نہ جلاؤ، خلاصہ یہ کہ دوسروں کی خاطر مر رہو۔ اور جیو تو سڑ سڑ کی ہو کر جیو۔"

ص "میرے دونوں دوست **الف** اور **و** مجھ کو معاف فرمائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ دونوں صاحب اصل مطلب سے الگ ہو کر افراط و تفریط کے کناروں پر آگئے ہیں۔ ہم کو صرف یہ دیکھنا ہے کہ شرافت نسب کوئی چیز ہے بھی یا نہیں۔ میں کہتا ہوں ہے اور دنیا کی تمام قومیں اس کو تسلیم کرتی ہیں۔ بے شک ہر زمانے میں ایسے باکمال لوگ ہوتے آئے ہیں جو ایک صفت یا چند صفتوں میں اپنے ابنائے جنس پر تفوّق رکھتے تھے اور جس کو خدا ممتاز کرتا ہے اُس کی نسبت سے اُس کی سب چیزوں میں وقعت آجاتی ہے۔ یہاں تک کہ رہنے کے مکان میں، پہننے کے کپڑوں میں، باندھنے کے ہتھیاروں میں، سواری کے جانوروں میں۔ لارڈ ٹینیسن مشہور انگریزی ملک الشعراء حال میں مرا ہے۔ اُس کی بیٹھنے کی کرسی کے، لکھنے کی میز کے، قلم کے، دوات کے لوگ لاکھوں روپئے دینے کو موجود ہیں۔ اُس کے وارث جوں کہ خود مقدور والے ہیں، نہیں دیتے۔ اور اس طرح کی مثالیں ڈھونڈھنی چاہو تو ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم میں کثرت سے ملیں گی کہ نامی نامور لوگوں کی کیسی قدر کی جاتی ہے۔ تو جب ممتاز لوگوں کی نسبت سے اُن کی سب چیزوں میں وقعت آجاتی ہو تو کیوں اُن کی نسلوں کی وقعت نہ ہو جو اُن کی زندہ یادگار ہیں اور اُن کے ساتھ نسبت بھی توی اور قریب کی رکھتے ہیں۔ یہ ہے ماخذ شرافت نسب کی قدر کا۔ اب دوسری بات میں یہ کہنی چاہتا ہوں کہ آدمی اشرف المخلوقات تو ہے مگر اس کی مجموعی حالت کے اعتبار سے۔ ورنہ اس کی بہت سی باتیں حیوانوں سے ملتی ہیں کہ اُن ہی کی طرح وہ کھاتا پیتا سوتا چلتا پھرتا ہے اور اُس میں کئی خواص نباتات کے ہیں کہ اس کو بالیدگی ہے، پھولنے پھلنے کے عوض اُس کی نسل چلتی ہے۔ درختوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک درخت کے مزاج شخصی کے مطابق اس میں پھل لگتا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ

نیم کے درخت میں نیمبو پھلیں یا نیبو کے درخت میں نبولیاں جس درخت کے پھل میں ایک خاص ذائقہ ہو اُس سے جتنی نسل چلے گی وہ ذائقہ کم وبیش سب پھلوں میں ہوگا۔ غرض یہ بات نباتات حیوانات اور انسان سب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہو کہ نسلیں اپنے بزرگوں کے ساتھ مشابہت اور مماثلت کو باقی رکھتی چلی آتی ہیں۔ اس کی تصدیق الولد سرہ لابیہ سے ہوتی ہو اور اسی طرح کی ایک کہاوت ہندی میں بھی ہو۔ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ یہ مشابہت نہ صرف جسمانی بناوٹ میں ہوتی ہو بلکہ افتادِ مزاج میں بھی۔ میرے متعارفین میں ایک صاحب ہیں اُن کی گُدّی میں ایک مسّا ہو وہ اُس کو مُہر شرافت کہا کرتے ہیں۔ اُن کا بیان ہو کہ ایسا ہی مسّا اسی جگہ میرے باپ اور دادا کی گردن میں تھا۔ میرے ہو ا بیٹا تو اُس کی گردن میں بھی ایک مضحل سا نشان مسّے کا تھا لیکن گُدّی میں نہیں بڑے ہو کر وہ مسّا کھسکتے کھسکتے اُسی خاندانی جگہ آرہا۔ ایک نوجوان آدمی کا حال مجھ کو معلوم ہو کہ وہ شروع سے نہ باپ پاس رہا نہ اُن سے پڑھا لیکن باپ بیٹوں کا سواد خط اس قدر اشبہ ہو کہ تمیز نہیں ہو سکتی حضرت زید رضی اللہ عنہ جن کو لوگ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا متبنی سمجھ کر زید بن محمد پکارتے تھے گورے چٹے آدمی تھے۔ اور اُسامہ رضی اللہ عنہ اُن کے فرزند تیرہ فام۔ اس سے لوگ اُن کو چھیڑتے تھے اور باپ بیٹے دونوں کو بُرا لگتا تھا۔ اور جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی اُس خصوصیت کی وجہ سے جو زیدؓ کے ساتھ تھی ایذا ہوتی تھی۔ ایک دن کا مذکور ہو کہ زیدؓ اور اسامہؓ دونوں باپ بیٹے ایک چادر اوڑھے مسجد نبوی میں پڑے سوتے تھے اور دونوں کے پاؤں چادر سے باہر نکلے ہوئے تھے اُدھر سے کوئی قیافہ شناس ہو کر گزرا۔ اور بے اس کے کہ پہچانتے دونوں کے پاؤں دیکھ کر کہنے لگا واللہ یہ پاؤں ایک دوسرے کی نسل ہیں۔ یہ سُن کر آنحضرت کو بڑی ہی خوشی ہوئی۔ اور اس حکایت کو آپ نے کئی آدمیوں کے روبرو نقل کیا۔ ہم خیال نہیں کرتے

ورنہ اس مشابہت کی مثالیں اس کثرت سے موجود ہیں کہ ہر فرد بشر، ہر جانور، ہر پھل، ہر پھول، ہر پتّا
اس کی گواہی دے رہا ہے۔ پس شرافت نسب کی قدر کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم حقیقت میں اُن صفتوں کی
قدر کرتے ہیں جو بانی سلسلہ نسب میں تھیں اور اُن صفتوں کے قابل قدر ہونے میں کسی کو گنجائش گفتگو نہیں۔
تو قدر نسب میں کیوں ہو۔ لیکن ہاں یہ بات بھی خیال کرنے کی ہے کہ تعلیم سے، تربیت سے، دوسروں کے
پاس اُٹھنے بیٹھنے رہنے سہنے سے بھی آدمی کے مزاج پر اخلاق پر عادت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اور اچھوں کی
اولاد بُری اور بُروں کی اچھی ہو جاتی ہے۔ اور یہی حال نباتات کی پود اور حیوانات کی نسل کا ہے۔
پھر بھی اصالت اپنا رنگ دکھلائے بدون نہیں رہتی۔ اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں۔
میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ میں مردوں کی طرف سے اب مطمئن نہیں ہوں جیسا عورتوں کی طرف سے۔
کیوں کہ جو چیزیں خارج سے مزاج پر اثر کرتی ہیں عورتیں اُن سے زیادہ محفوظ ہیں۔ اُن کے پاس
وہی موروثی اثاثہ ہے جو انھوں نے اپنے بڑوں سے پایا اور بس۔

اس کے بعد جو کمیٹی کا جلسہ ہوا تو اُس میں شرم پر گفتگو ہونی چاہتی تھی۔ مگر معلوم ہوا کہ
سوائے ع کے اور کوئی گفتگو کے لیے طیار نہیں تو ع نے کہنا شروع کیا کہ انسان میں بہت سی
صفتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلایا۔ ان میں سب سے عمدہ سب سے زیادہ بکار آمد
شرم ہے۔ اگر ہم شرم کا مطلب دوسرے لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو شرم ایک طرح کا ڈر ہے کہ میں نے
جو بے حیائی کی ہے ایسا نہ ہو کسی پر ظاہر ہو جائے تو وہ میری نسبت کیا خیال کرے گا کہ یہ کیسا
نالائق ہے۔ تو اس ڈر کے لیے چاہیے پہلے بُرے بھلے کی تمیز۔ اور تمیز کے ساتھ اتنا ادراک کہ یہ بات
بُری ہے تو مجھ کو کرنی زیبا نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حیا کو جزو ایمان ٹھیرا کر فرمایا ہے۔ الحیاء من الایمان
کہنے کو تو شرم ایک چیز ہے مگر وہ اکھٹے تین کام دیتی ہے۔ وقوع جرم سے پہلے تو اس کو قدرتی
پریونٹو پولیس کا کانسٹبل یا کوئی اور عہدہ دار سمجھو جس کا کام ہے کہ جہاں تک ممکن ہے جرموں کا انسداد کرے

دُنیا میں کتنے گناہ ہیں جو شرم کی وجہ سے ہونے نہیں پاتے۔ دل میں ارادہ ہوتا ہی لیکن شرم دامن گیر ہوکر باز رکھتی ہی۔ اور بندہ بشر ہی شرم مانع آتی ہی رہی اور اس سے قصور سرزد ہوگیا تو شرم ڈٹکٹو پولیس کی طرح اس کو ماخوذ کرتی اور جج بن کر اُس کو سزا دیتی اور یہ افسوس کرتا کہ ہائے کیوں میں نے ایسا جھک مارا، اور آیندہ کے لیے اس سے مچلکہ مانگتی کہ پھر ایسا نہیں کروں گا۔ خیر یہ تو مطلق شرم کی نسبت میں نے چند باتیں بیان کیں۔ اب مجھ کو اُس شرم کے بارے میں کچھ کہنا چاہیئے جو شادی بیاہ کے معاملات میں کی جاتی ہی۔ عورت تو کوئی رذیل سے رذیل بھی اپنے بیاہ کی صلاح میں شریک نہیں ہوسکتی۔ میں سمجھتا ہوں وتنا تو نہیں مگر مردوں کا حال بھی قریب قریب عورتوں ہی کا سا ہی۔ پہلے مجھ کو تعجب ہوتا تھا کہ وہ ضرورت جو ہر فرد بشر کے پیچھے لگی ہو اور خدا کی حکمت کاملہ اسی کی مقتضی ہوئی کہ اسی ضرورت کو دُنیا کے بڑھنے اور باقی رہنے کا ذریعہ قرار دے اتنی ساری شرم تو اس میں کہاں سے آگھُسی۔ بہت غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ ضرورت طرح طرح کے فسادات اور انواع و اقسام کے جھگڑوں کا پھاٹک ہی۔ اگر اس کو سختی کے ساتھ بند نہ رکھا جائے تو دُنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔ پہلا خون جو آدم کی نسل میں ہوا وہ اِسی نالائق ضرورت کی وجہ سے ہوا کہ ہابیل نے عورت کے کارن اپنے بھائی قابیل کو مارا۔ اُس دن سے جو یہ پھاٹک تیغہ ہوا ہی تو آج تک تیغہ چلا جاتا ہی اور اسی طرح روز قیامت تک تیغہ رہے گا۔ ضرورت کے لیئے نکاح کی ایک کھڑکی کھُلی رکھی گئی ہی سو اُس پر بھی جیسی کچھ روک ٹوک ہی آپ سب صاحبوں کو معلوم ہی۔ یہ روک ٹوک کی گئی تھی کسی مصلحت سے، مگر لوگ اس کی سختی کے متحمل نہ ہوسکے جس کا ضروری نتیجہ یہ ہوا کہ لگے دیواریں پھاندنے۔ نقب لگاتے۔ سرنگیں دوڑانے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ پھاٹک کے پٹ کھول دینے سے اتنی خرابیاں نہ ہوتیں جتنی ان ناجائز اور شرمناک رستوں سے ہوئیں اور ہوتی ہیں اور ہوں گی جب پہلے دن ہمارے دوست سید صادق نے بھری کمیٹی میں اپنا

ارادہ تجرد کا ظاہر کیا تو مجھ کو سخت تعجب ہوا تھا میں سید صادق کو ایسا ضابطہ اور مستقل مزاج آدمی
سمجھتا ہوں کہ یہ مشکل سے مشکل بات کو بھی جی میں ٹھان لیں تو چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے
یہ اُس کو پورا ہی کر اُتاریں لیکن جب اُنھوں نے تجرد کا نام لیا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ الٰہی
برسویں دن ایک مہینے رمضان کے روزے تو پہاڑ کی طرح کٹتے ہیں یہ ساری عمر کا روزہ اِن سے
کیوں کر نبھے گا! بلا سے لوگوں نے ان کو خوب ہی آڑے ہاتھوں لیا اور چوں کہ ہمارے سید صاحب
منصف مزاج اور معقول پسند ہیں یقین کرتا ہوں کہ اُنھوں نے اُس خیال محال کو چھوڑ دیا ہی۔
یہ خدا کی ستاریاں ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو مُنہ دکھانے کے قابل بھی ہیں ورنہ ؎

ٹھہرے ہی نہ پروانہ نہ رُکے ہی زبان شمع وہ سوختنی ہی تو یہ گردن زدنی ہی

اخلاق کی کتابوں میں شرم کے تین درجے لکھے ہیں۔ ادنیٰ درجہ یہ ہی کہ آدمی اپنے ابنائے جنس سے
شرم کرے۔ اِس سے بڑھ کر یہ کہ خدا سے شرم کرے اور سمجھے کہ وہ دانائے نہاں و آشکارا ہمارے
دلوں کے ارادوں تک سے واقف ہی اور ہم اندھیری رات میں شتر پردوں کے اندر کوئی کام کریں تو،
اور روز روشن میں ڈھول بجا کر کوٹھے پر چڑھ کر کریں تو اُس کی نظر میں دونوں یکساں ہیں۔
لیکن شرم کا ایک درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہی کہ آدمی اپنے نفس سے شرم کرے اور بُرے کام کرنے سے
اُس کو یہ خیال مانع ہو کہ یہ کام میری شان کے لائق نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے
حالات میں لکھا ہی کہ وہ بڑے ہی شرمیلے تھے یہاں تک کہ اکیلے مکان میں بھی برہنہ غسل نہیں
کرتے تھے بے شک یہ ہی اعلیٰ درجے کی شرم جس کو خدا نصیب کرے۔ میں نے بہت غور کیا کہ
ہم لوگوں کی شرم ان تین قسموں میں سے کس قسم کی ہی تو میری سمجھ میں یہ آیا کہ اس کو ایک قسم
جداگانہ قرار دینا چاہیے کہ گلگلوں کے تو نام سے چڑیں اور گڑ یا ئیں تو بھیلیاں کی بھیلیاں
چٹ کر جائیں غرض اس جھوٹی اور منافقانہ اور دکھاوے کی شرم کو شرم کہتے ہوئے مجھ کو تو

بہت ہی شرم آتی ہے۔ ایک بات اور ہے کہ یوں تو وہ شرم سے خارج ہے مگر ہے اسی کا ضمیمہ چھوٹی عمر میں شادی کرنے کا دستور ہم مسلمانوں میں تو کم ہے مگر جیسی عمروں میں ہمارے یہاں اکثر شادی بیاہ ہوتے ہیں لوگ اس کو بھی جلدی ہی سمجھتے ہیں۔ اور اُن کا خیال یہ ہے کہ اسی سے ہماری نسلیں کم زور ہوتی اور عمریں گھٹتی چلی جاتی ہیں۔ اصل میں یہ اعتراض انگریزوں نے نکالا ہے اور دوسرے اِن کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں لیکن اگر واقع میں ہماری نسلیں کم زور اور عمریں گھٹتی جاتی ہوں تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ جو قرار دیا جاتا ہے بلکہ اس کا سبب ہے ہمارا طرزِ تمدن، کہ ہم لوگوں میں اصولِ صفائی کی مطلق رعایت نہیں۔ گنجان آبادی، بند مکان، میلا پانی، گندی ہوا آپ حدی چلنے کے نہیں پھرنے کے نہیں۔ بل بوتا آئے تو کہاں سے آئے؟ اور دیہات میں یہ خرابیاں کم ہیں تو ویسے ہی دیاں کے لوگ موٹے تازے زبردست مضبوط ہونچال جفاکش بھی ہوتے ہیں۔ ہم جیسے نہیں کہ چھینکنے سے ناف ٹلتی اور کھانسنے سے کولا اترتا۔ ملک کی آب و ہوا کہ یہاں مرد اور عورت جلد جوان ہو جاتے ہیں اور سوسائٹی کی حالت دیکھ کر میں مسلمانوں کو شادی بیاہ میں دیر لگانے کی ہرگز رائے نہیں دوں گا کہ کوارے میری جان کو کوسیں۔ اگر ہمارے یہاں کچھ جلدی ہوتی ہے اور اس سے کچھ قباحت لازم آتی ہے تو وہ اُس قباحت بلکہ اُن قباحتوں کے آگے ہرگز قابل لحاظ نہیں جن کا دیر کی صورت میں پیدا ہونا کچھ بعید نہیں۔ بلا سے آگے کو نسل چلے اور مرجیونی ہو اور ہم بھلے مانس رہیں بہتر ہے اس سے کہ چلے ہی نہیں۔ یا چلے اور بعد خرابی بصرہ چلے؟

ہماری کمیٹی کی کتاب روداد بہت ضخیم ہو گئی ہے۔ مگر میں نے ضروری مطالب اُس میں سے اخذ کر لیے ہیں آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جو شخص اس کمیٹی کا ممبر ہو اور صرف ممبر ہی نہیں بلکہ سکرٹیری بھی، شادی بیاہ کے بارے میں اُس کے کیسے خیالات ہونے چاہئیں چنانچہ اسی کمیٹی کی تعلیم کا اثر ہے کہ میں نے جھوٹی شرم کو بالائے طاق رکھ کر یہ عریضہ لکھا ہے۔ مجھ کو اِس کے بھیجنے میں

شرم تو مانع ہو ہی نہیں سکتی تھی مگر ہاں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ ایسا نہ ہو آپ بُرا مانیں ور بیٹھے بٹھائے آپ کو یا کسی کو رنج دینا، گو وہ رنج بے اصل ور بلا وجہ معقول ہی کیوں نہ ہو، میں جائز نہیں رکھتا لیکن آخر میں نے سوچا کہ جب میں نے فیصلہ کر لیا کہ نکاح کروں گا تو کیوں میں اپنی تجویز سے نہ کروں۔ اس کا نتیجہ بھلا یا بُرا تو میں بھگتوں گا۔ میں نرا بچہ نہیں کہ اپنے نیک و بد میں تمیز نہ کر سکوں۔ ایسا بڑا ضروری کام جس پر میری آیندہ کی زندگی کی کامیابی اور ناکامیابی خوشی اور ناخوشی موقوف ہو گی دوسروں کے سر ڈال کر میں بیٹھا تماشا دیکھا کروں تو مجھ سا احمق کون ہو؟ اُن حالات سے جو میں نے سُنے تھے میں نے آپ ہی کے سایہ میں عافیت اور آسائش دیکھی۔ مجھ کو اس خط کے بھیجنے سے حقیقت میں اس بات کی ٹٹول منظور ہے کہ میں نے جیسا کچھ آپ کو سمجھا ہے اس میں غلطی تو نہیں کی اگر آپ نے میری اس جسارت کو گستاخی اور بے تمیزی اور بیہودگی اور بے حیائی خیال فرمایا تو میں سمجھوں گا کہ نہیں آپ کے ڈھب کا اور نہ آپ میرے ڈھب کے۔ لیکن مجھ کو اُمید نہیں کہ آپ ایسا خیال فرمائیں۔ کیا ضرورت تھی کہ میں مشاطہ کے ہاتھ رقعہ یا اسم نویسی بھیجتا پھروں؟ یہ بھی ایک قسم کا رقعہ ہی ہے مگر ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ۔ میں نے اپنے دلی خیالات تک اس میں ظاہر کر دیئے ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ میں نے اپنا حال بنسبت کسی دوسرے کے بیان کرنے میں کچھ اُٹھا رکھا ہے۔ میں اپنا فوٹو بھی اس میں ملفوف کرتا ہوں۔ تاکہ تعلق سے پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں ہر طرح کی معلومات بہم پہنچانے کا موقع دوں۔ رہی آپ کے حالات کی تفتیش، جب تک میں نے بخوبی نہیں کر لی اس خط کے لکھنے کے لیے قلم نہیں اُٹھایا۔ میں آپ سے اتنی بات بھی کیوں چھپاؤں کہ میں زیادہ تر اُسی صفت کا گرویدہ ہوا ہوں جس سے لوگ بھڑکتے ہیں۔ عالمِ ارواح کے ساتھ ایسا قوی تعلق ایک نعمت خداداد ہے۔ اور سخت افسوس کی بات ہو گی اگر کسی ناقدردان کے پلّے پڑے فقط۔

راقم سید صادق - از بنارس

آٹھویں فصل

صادق صادقہ کے بیاہ کے بارے میں صادقہ کے میکے والوں کی صلاحیں

میر صاحب کو بھلا کچھ نہیں تو خط پڑھتے اور سمجھتے ایک گھنٹہ تو لگا ہوگا۔ اتنا صبر تو کیوں کر ہو سکتا تھا کہ خط کے تمام کرنے تک تصویر کو نہ دیکھتے۔ جب جب ص کا نام آتا تھا کہتے تھے ہو نہ ہو اس سے مراد خود سیّد صادق ہے اور اس خیال کے ساتھ ہر بار بے اختیار تصویر پر نظر کر لیتے تھے۔ سارا خط پڑھ چکے تو ایک آنکھ بند کی اور دوسری کے آگے مٹھی کی دوربین لگائی اور کبھی دور سے کبھی نزدیک سے کبھی اس پہلو سے کبھی اُس پہلو سے تصویر کو تا دیر بہت ہی غور سے دیکھا۔ صورت پر شرافت، متانت، ذہانت پڑی برس رہی تھی اور انگریزی لباس کے سوائے کوئی چیز نہ تھی جو نظر میں کھٹکے۔ غرض میر صاحب نے تو اُسی وقت سے بیٹی کا دینا بچار لیا۔ ایک ہاتھ میں خط دوسرے میں تصویر گھر میں آئے اور بی بی سے کہا۔ "گلوری تو تم تھوک ہی چکی ہو۔ لو اب غصے کو بھی تھوک دو۔ میں ایک خوش خبری لایا ہوں بنارس سے ایک شخص نے صادقہ کا پیام دیا ہے اور لو یہ اُس کی تصویر ہے۔"

بی بی (تصویر دیکھ کر) "اوئی یہ مردوا کیسا ہے؟ یہ تو کوئی نگوڑا انگریز معلوم ہوتا ہے۔"

میاں۔ "بہت سے ہندوستانیوں نے انگریزی لباس اختیار کر لیا ہے اور جتنے انگریزی خواں ہیں سب کی یہی وضع ہوتی جاتی ہے۔ مگر یہ شخص مسلمان ہے اور ذات کا سیّد ہے۔ سید احمد خاں کا نام تم نے سُنا ہو اُن کے مدرسے میں پڑھتا ہے بی اے پاس ہے۔"

بی بی۔ "سید احمد خاں وہ تو نہیں علی گڑھ والے؟"

میاں۔ "ہاں وہی سید احمد خاں۔ وہ اصل میں ہماری دلّی کے ہیں۔ انھوں نے علی گڑھ میں بڑا بھاری

ارادہ تجرد کا ظاہر کیا تو مجھ کو سخت تعجب ہوا تھا۔ میں سید صادق کو ایسا ضابط اور مستقل مزاج آدمی سمجھتا ہوں کہ یہ مشکل سے مشکل بات کو بھی جی میں ٹھان لیں تو چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے یہ اُس کو پورا ہی کر اُتاریں لیکن جب اُنھوں نے تجرد کا نام لیا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ الٰہی برسویں دن ایک مہینے رمضان کے روزے تو پہاڑ کی طرح کٹتے ہیں یہ ساری عمر کا روزہ ان سے کیوں کر نبھے گا! بلکہ لوگوں نے ان کو خوب ہی آڑے ہاتھوں لیا اور جوں کہ ہمارے سید صاحب منصف مزاج اور معقول پسند ہیں یقین کرتا ہوں کہ انھوں نے اُس خیال محال کو چھوڑ دیا ہی۔ یہ خدا کی ستاریاں ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو منہ دکھانے کے قابل بھی ہیں ورنہ ؎

ٹھیرے ہی نہ پروانہ نہ روکے ہو زباں شمع وہ سوختنی ہی تو یہ گردن زدنی ہی

اخلاق کی کتابوں میں شرم کے تین درجے لکھے ہیں۔ ادنیٰ درجہ یہ ہی کہ آدمی اپنے ابنائے جنس سے شرم کرے۔ اِس سے بڑھ کر یہ کہ خدا سے شرم کرے اور سمجھے کہ وہ دانائے نہاں و آشکارا ہمارے دلوں کے ارادوں تک سے واقف ہی اور ہم اندھیری رات میں سّتر پردوں کے اندر کوئی کام کریں تو، اور روز روشن میں ڈھول بجا کر کوٹھے پر چڑھ کر کریں تو، اُس کی نظر میں دونوں یکساں ہیں۔ لیکن شرم کا ایک درجہ اِس سے بھی بڑھ کر ہی کہ آدمی اپنے نفس سے شرم کرے اور بُرے کام کرنے سے اُس کو یہ خیال مانع ہو کہ یہ کام میری شان کے لائق نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا ہی کہ وہ بڑے ہی شرمیلے تھے یہاں تک کہ اکیلے مکان میں بھی برہنہ غسل نہیں کرتے تھے۔ بے شک یہ ہی اعلیٰ درجے کی شرم جس کو خدا نصیب کرے۔ میں نے بہت غور کیا کہ ہم لوگوں کی شرم ان تین قسموں میں سے کس قسم کی ہی تو میری سمجھ میں یہ آیا کہ اس کو ایک قسم جداگانہ قرار دینا چاہیے کہ کلکلوں کے تو نام سے چڑیں اور گڑیا ئیں تو ہیلیاں کی ہیلیاں چٹ کر جائیں۔ غرض اس جھوٹی اور منافقانہ اور دکھاوے کی شرم کو شرم کہتے ہوئے مجھ کو تو

بہت ہی شرم آتی ہے۔ ایک بات اور ہے کہ یوں تو وہ شرم سے خارج ہے مگر ہے اسی کا ضمیمہ چھوٹی عمر میں شادی کرنے کا دستور ہم مسلمانوں میں تو کم ہے مگر جیسی عمروں میں ہمارے یہاں اکثر شادی بیاہ ہوتے ہیں لوگ اس کو بھی جلدی ہی سمجھتے ہیں۔ اور اُن کا خیال یہ ہے کہ اسی سے ہماری نسلیں کم زور ہوتی اور عمریں گھٹتی چلی جاتی ہیں۔ اصل میں یہ اعتراض انگریزوں نے نکالا ہے اور دوسرے ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں۔ لیکن اگر واقع میں ہماری نسلیں کم زور اور عمریں گھٹتی جاتی ہوں تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ جو قرار دیا جاتا ہے بلکہ اس کا سبب ہے ہمارا طرز تمدن، کہ ہم لوگوں میں اصول صفائی کی مطلق رعایت نہیں۔ گنجان آبادی، بند مکان، میلا پانی، گندی ہوا آپ حدی پلنے کے نہیں پھرنے کے نہیں۔ بل بوتا آئے تو کہاں سے آئے؟ اور دیہات میں یہ خرابیاں نہیں تو ویسے ہی وہاں کے لوگ موٹے تازے زبردست مضبوط ہونچال جفاکش بھی ہوتے ہیں۔ ہم جیسے نہیں کہ چھینکنے سے ناف ٹلتی اور کھانسنے سے کولا اترتا۔ ملک کی آب و ہوا کہ یہاں مرد اور عورتیں جلد جوان ہو جاتے ہیں اور سوسائٹی کی حالت دیکھ کر میں مسلمانوں کو شادی بیاہ میں دیر لگانے کی ہرگز رائے نہیں دوں گا کہ کوارے مہری جان کو کوسیں۔ اگر ہمارے یہاں کچھ جلدی ہوتی ہے اور اس سے کچھ قباحت لازم آتی ہے تو وہ اُس قباحت بلکہ اُن قباحتوں کے آگے قابل لحاظ نہیں جن کا دیر کی صورت میں پیدا ہونا کچھ بعید نہیں۔ بلا سے آگے کو نسل چلے مگر جب ہوتی ہو اور ہم بھلے مانس رہیں بہتر ہے اس سے کہ چلے ہی نہیں۔ یا چلے اور بعد خرابی بصرہ چلے؟ ہماری کمیٹی کی کتاب روداد بہت ضخیم ہو گئی ہے۔ مگر میں نے ضروری مطالب اُس میں سے لے لیے ہیں آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جو شخص اس کمیٹی کا ممبر ہو اور صرف ممبر ہی نہیں بلکہ سکریٹری بھی، شادی بیاہ کے بارے میں اُس کے کیسے خیالات ہونے چاہئیں چنانچہ اسی کمیٹی کا اثر ہے کہ میں نے چھوٹی شرم کو بالائے طاق رکھ کر یہ عریضہ لکھا ہے۔ مجھ کو اس کے بھیجنے میں

ورنہ اس مشابہت کی مثالیں اس کثرت سے موجود ہیں کہ ہر درخت، ہر جانور، ہر پھل، ہر پھول، ہر پتّا
اس کی گواہی دے رہا ہے۔ پس شرافت نسب کی قدر کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم حقیقت میں اُن صفتوں کی
قدر کرتے ہیں جو بانی سلسلہ نسب میں تھیں اور ان صفتوں کے قابل قدر ہونے میں کسی کو گنجائش گفتگو نہیں۔
تو قدر نسب میں کیوں ہو۔ لیکن ہاں یہ بات بھی خیال کرنے کی ہے کہ تعلیم سے، تربیت سے، اور دوسروں کے
پاس اُٹھنے بیٹھنے رہنے سہنے سے بھی آدمی کے مزاج پر، اخلاق پر، عادت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اور اچھوں کی
اولاد بُری اور بُروں کی اچھی ہو جاتی ہے۔ اور یہی حال نباتات کی پود اور حیوانات کی نسل کا ہے۔
پھر بھی اصالت اپنا رنگ دکھائے بدون نہیں رہتی۔ اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں۔
میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ میں مردوں کی طرف سے ایسا مطمئن نہیں ہوں جیسا عورتوں کی طرف سے۔
کیوں کہ جو چیزیں خارج سے مزاج پر اثر کرتی ہیں عورتیں اُن سے زیادہ محفوظ ہیں۔ اُن کے پاس
وہی موروثی اثاثہ ہے جو انھوں نے اپنے بڑوں سے پایا اور بس۔"

اس کے بعد جو کمیٹی کا جلسہ ہوا تو اُس میں شرم پر گفتگو ہونی چاہتی تھی۔ مگر معلوم ہوا کہ
سوائے ع کے اور کوئی گفتگو کے لیے طیار نہیں۔ تو ع نے کہنا شروع کیا کہ انسان میں بہت سی
صفتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلایا۔ ان میں سب سے عمدہ سب سے زیادہ بکار آمد
شرم ہے۔ اگر ہم شرم کا مطلب دوسرے لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو شرم ایک طرح کا ڈر ہے کہ میں نے
جو یہ بے جا بات کی ہے اگر ایسا نہ ہو کسی پر ظاہر ہو جائے تو وہ میری نسبت کیا خیال کرے گا کہ یہ کیسا
نالائق ہے۔ تو اس ڈر کے لیے چاہیے پہلے بُرے بھلے کی تمیز۔ اور تمیز کے ساتھ اتنا ادراک کہ یہ بات
بُری ہے تو مجھ کو کرنی زیبا نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حیا کو جزو ایمان ٹھہرا کر فرمایا ہے۔ الحیاء من الایمان
کہنے کو تو شرم ایک چیز ہے مگر وہ اکیلے تین کام دیتی ہے۔ وقوع جرم سے پہلے تو اس کو قدرتی
پہرہ ہو، نٹو پولیس کا کانسٹیبل یا کوئی اور عہدہ دار سمجھو جس کا کام ہے کہ جہاں تک ممکن ہے جرموں کا انسداد کرے

دُنیا میں کتنے گناہ ہیں جو شرم کی وجہ سے ہونے نہیں پاتے۔ دل میں ارادہ ہوتا ہی لیکن شرم دامن گیر ہوکر باز رکھتی ہی۔ اور بندہ بشر ہی شرم مانع آتی ہی رہی اور اس سے قصور سرزد ہو گیا تو شرم ڈٹکٹو پولیس کی طرح اس کو ماخوذ کرتی اور جج بن کر اُس کو سزا دیتی اور یہ افسوس کرتا کہ ہائے کیوں میں نے ایسا جھک مارا، اور آیندہ کے لئے اس سے مچلکہ مانگتی کہ پھر ایسا نہیں کروں گا۔ خیر یہ تو مطلق شرم کی نسبت میں نے چند باتیں بیان کیں۔ اب مجھ کو اُس شرم کے بارے میں کچھ کہنا چاہئیے جو شادی بیاہ کے معاملات میں کی جاتی ہی۔ عورت تو کوئی رذیل سے رذیل بھی اپنے بیاہ کی صلاح میں شریک نہیں ہوسکتی۔ میں سمجھتا ہوں وتنا تو نہیں مگر مردوں کا حال بھی قریب قریب عورتوں ہی کا سا ہی۔ پہلے مجھ کو تعجب ہوتا تھا کہ وہ ضرورت جو ہر فردِ بشر کے پیچھے لگی ہو اور خدا کی حکمت کاملہ اسی کی مقتضی ہوئی کہ اسی ضرورت کو دُنیا کے بڑھنے اور باقی رہنے کا ذریعہ قرار دے اتنی ساری شرم تو اس میں کہاں سے آگھسی۔ بہت غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ ضرورت طرح طرح کے فسادات اور انواع واقسام کے جھگڑوں کا پھاٹک ہی۔ اگر اس کو سختی کے ساتھ بند نہ رکھا جائے تو دُنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔ پہلا خون جو آدم کی نسل میں ہوا وہ اسی نالائق ضرورت کی وجہ سے ہوا کہ ہابیل نے عورت کے کارن اپنے بھائی قابیل کو مارا۔ اُس دن سے جو یہ پھاٹک تیغہ ہوا ہی تو آج تک تیغہ چلا جاتا ہی اور اسی طرح روز قیامت تک تیغہ رہے گا۔ ضرورت کے لئے نکاح کی ایک کھڑکی کھلی رکھی گئی ہی سو اُس پر بھی جیسی کچھ روک ٹوک ہی آپ سب صاحبوں کو معلوم ہی۔ یہ روک ٹوک کی گئی تھی کسی مصلحت سے، مگر لوگ اس کی سختی کے متحمل نہ ہوسکے جس کا ضروری نتیجہ یہ ہوا کہ لگے دیواریں پھاندنے۔ نقب لگاتے، سرنگیں دوڑانے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ پھاٹک کے چوپٹ کھول دینے سے اتنی خرابیاں نہ ہوتیں جتنی ان ناجائز اور شرمناک رستوں سے ہوئیں اور ہوتی ہیں اور ہوں گی۔ جب پہلے دن ہمارے دوست سید صادق نے بھری کمیٹی میں اپنا

مدرسہ جاری کر رکھا ہے اور آپ بھی وہیں رہتے ہیں۔"

بی بی- "کہو۔ میں اُن کے خاندان کے بہت لوگوں سے واقف ہوں لیکن وہ تو بہت بدنام ہیں۔ کہتے ہیں اُنھوں نے اپنا مذہب بدل ڈالا ہے اور مسلمانوں کو دین سے بے دین کئے ڈالتے ہیں۔"

میاں- "بس یہی بے دینی ہے جو تم اس تصویر میں دیکھتی ہو۔"

بی بی- "نہیں۔ سُنا ہے انگریزوں کے ساتھ کھاتے ہیں۔"

میاں- "یہ بھی سچ ہے۔"

بی بی- "پھر دین تو آپ سے آپ بدلا۔"

میاں- "کیسی باتیں کرتی ہو۔ کہیں دین بھی کھانے پہننے سے بدلا ہے؟"

بی بی- "کھانے پہننے سے دین نہیں بدلتا تو کسی ہندو کو اپنے گھر کا پانی تو پلا دیکھو۔"

میاں- "پھر کیا تم ہندنی ہو؟"

بی بی- "خدا نہ کرے میں کیوں ہندنی ہونے لگی تھی!"

میاں- "تو بی بی بیگم ہم مسلمانوں کا دین ایسا بودا نہیں ہے کہ کھانے پہننے سے جاتا رہے۔"

بی بی- "پھر شہر میں سیّد احمد خاں کا اتنا غُل کیوں ہے؟"

میاں- "یہ تو اُن لوگوں سے پوچھنا چاہیئے جنھوں نے غُل مچا رکھا ہے۔ میں تو سیّد احمد خاں کو اچھا خاصہ مسلمان سمجھتا ہوں۔ اپنے سے بہتر۔ سیّد آل رسول۔ مسلمانوں کے خیرخواہ۔ مسلمانوں کی بہتری چاہنے والے۔"

بی بی- "تو یہ مردوا بھی اُن ہی کے دین میں ہوگا؟"

میاں- "اُن کا دین کیا معنی؟ دین خدا کا۔ یہ شخص بھی مسلمان کے گھر پیدا ہوا۔ اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے۔ کتاب کی کتاب خط لکھا ہے۔ اس میں ایک حرف دین کے خلاف نہیں۔ جگہ جگہ قرآن کی آیتوں اور حدیثوں کے حوالے دیتا ہے۔ اور مسلمان کیسے ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے سر میں کچھ سینگ نہیں لگے ہوتے کہ اس کے

سر میں نہیں ہیں۔ گھر کی زمینداری ہے۔ خوش حال باپ کا بیٹا ہے۔ لیاقت کا یہ حال ہے کہ آج مڈل پاس نہیں ملتے یہ بی اے پاس کر چکا ہے اور ابھی پڑھ رہا ہے۔ صورت دیکھو اچھی خاصی بھلے مانسوں کی سی، تمھارے دوسرے دونوں دامادوں سے زیادہ شان دار۔ کوئی عیب نہیں نقصان نہیں۔ میری صلاح مانو تو آنکھ بند کر کے صادقہ کا ہاتھ پکڑا دو۔ پھر ایسی جگہ نہیں ملے گی اور ایسی کے کیا معنی، ملے ہی گی نہیں۔ دیر آید درست آید اسی کو کہتے ہیں کہ بے چاری صادقہ اتنے دنوں بیٹھی تو خدا نے اس کو بر بھی اسی کی لائق کا دیا۔ اور مزہ یہ کہ وہ ریجھا ہے اس کے اُن ہی خوابوں پر جن کی وجہ سے کوئی اس کو پوچھتا نہیں۔"

بی بی ۔"دیکھو صاحب۔ بیٹی جیسی میری ویسی تمھاری۔ جو سمجھ میں آئے سو کرو۔ میں تو صادقہ کے بارے میں ایسی عاجز آئی ہوں کہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتی۔ یہ میری آنکھوں کے آگے چلتی پھرتی ہے اور میں ہوں کہ اس کو دیکھ دیکھ کر سہمی چلی جاتی ہوں کہ آگے کیا ہوگا اور کب تک بیٹھی رہے گی اور اس کے دل میں آپ کیسی کیسی باتیں آتی ہوں گی۔ چھوٹی بہنیں اس کے دیکھتے گھر بار کی ہو گئیں اور اسی کی تقدیر نہ کھلی۔ وہ تو یوں کہو کہ بیٹی ذات ہے اور ہے بھی نیک کہ اس نے اپنی سہیلیوں میں بھی آدھی بات منہ سے نہیں نکالی۔ ورنہ اور سری کی ہوتی تو ہر جیلے ہر بہانے سے کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ پر ہاں اتنا ضرور خیال کر لینا کہ کسی کو یہ کہنے کو نہ ہو کہ بیٹی کو کہیں بد نصیب ہوا تو کرستان کے گلے مڑھی۔"

میاں ۔"میں کیا خدانخواستہ اپنی اولاد کا دشمن ہوں یا ہم نے یہ بیٹی کہیں کوڑے پر سے پڑی پائی ہے؟ دنیا میں رہ کر ناک تھوڑی کٹوانی ہے۔ پوچھوں گا۔ تحقیق کروں گا۔ چار کی صلاح لوں گا۔ پھر بات سو بات۔ بس ذرا یہی انگریزی وضع دیکھ کر جی ہچکچاتا ہے ورنہ میں تو آج ہی جواب لکھ بھیجتا کہ ہم کو منظور ہے۔"

میر صاحب نے اپنے طور پر بہت چھانا یہ یام تو سید صادق کا، اور لوگ علی گڑھ کالج کا نام سنتے کے ساتھ خواہی نخواہی ذکر نکال کھڑا کرتے سید احمد خاں کا۔ کوئی کافر بتاتا، کوئی مرتد، کوئی نیچری کوئی لامذہب، کوئی کرسٹان، صرف سید احمد خاں ہی کو نہیں بلکہ اُن کے کالج کے مدرسوں کو، طالب العلموں کو، یہاں تک کہ کالج کے سقّے اور دھوبی اور چوکیدار اور باورچی کو۔ مگر جو عقل معاش رکھتے تھے اور اپنی اولاد کو معاش پیدا کرنے کا سلیقہ سکھانا چاہتے تھے وہ سید احمد خاں کی وہ اُن کے کالج کی مدح ہی کرتے تھے۔ بعض کو بعض عقائد میں کلام تھا اور بعض کو وہ بھی نہیں۔ تو میر صاحب نے اپنے جی میں سوچا کہ مجھ کو تو سید صادق کا حال دریافت کرنا منظور ہے۔ اُن کے خط سے تو کوئی بدعقیدتی ظاہر نہیں ہوتی۔ اب رہیں دو باتیں ایک علی گڑھ کالج کا پڑھنا دوسرے انگریزی وضع۔ سو علی گڑھ کالج بے شک سید احمد خاں نے کھولا، سید احمد خاں نے جمایا اور سید احمد خاں اُس کو چلا رہے ہیں۔ اور اِن کو کالج کے انتظام میں بھی بڑا دخل ہوگا لیکن وہ مدرّس نہیں لکچرار نہیں خدا جانے کس کے پاس کالج کی رپورٹ نظر پڑی تھی درسی کتابیں وہی تھیں جو دوسرے مدرسوں میں ہیں۔ تو سید احمد خاں کی وجہ سے طالب العلموں پر کیوں بدگمانی کی جائے۔ اور یوں خدا اُن کو بخشے اور لگو بندوں بے حساب بینے تو جس کو چاہو کافر بناؤ جس کو چاہو مرتد ٹھیراؤ۔ آدمی اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھے تو آپ سب سے بدتر ہو۔ ہم ہی ایسے کون سے عمل اچھے کر رہے ہیں کہ دوسروں پر حرف رکھیں۔ یہ تو لوگوں کی سراسر زیادتی ہے۔ ہاں انگریزی وضع دیکھ کر عورتیں ضرور بدکیں گی اور لوگوں کو بھی باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔ سو ایسی کیا تدبیر کی جائے کہ یہ بے لطفی پیش نہ آئے سید صادق سے تو مجھ کو یہ کہنے کا منصب ہی نہیں کہ تم بضرورت اِس کو ہمیشہ کے لئے یا تھوڑی دیر کے لیے بھی ترک کرو۔ اُنھوں نے اتفاقی طور پر خط میں اپنی کمیٹی کے پریزیڈنٹ کی ایک رائے اپنی نسبت نقل کی ہے پریزیڈنٹ نے ایک محل پر کہا کہ میں سید صادق کو ایسا ضابطہ اور مستقل مزاج آدمی سمجھتا ہوں کہ یہ

مشکل سے مشکل بات کو بھی جی میں ٹھان لیں تو چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے یہ اس کو پورا ہی کر اتاریں۔ یہ بات ضروری ہو کہ سید صادق ہمارے ساتھ فرزندانہ تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں اور وہ مجھ سے عمر میں بھی بہت چھوٹے ہیں مگر بزرگی بعقل ست نہ بسال۔ کہاں وہ بی اے پاس اور کہاں میں کہ مڈل کا امتحان دینا چاہوں تو نہیں دے سکتا۔ خدا نے کچھ ہم لوگوں کی طبیعتیں ہی ان چیزوں کے مناسب نہیں بنائیں۔ مدرسے کے ذرا ذرا سے لڑکے حساب کے ایسے ایسے پیچیدہ سوال چٹکی بجاتے میں حل کرتے ہیں کہ میں مہینوں غور کرتا رہوں تو نہ بنا سکوں۔ ہمارے وقتوں میں تاریخ اور جغرافیہ اور طبیعات اور ریاضی اور ہیئات کی باتیں کون جانتا تھا۔ فارسی میں زلیخا بہار دانش پڑھ لی۔ عربی میں ہدایت النحو، خاصے مولوی بن گئے۔ پس میں جو سید صادق کو عقل سکھانی چاہوں تو میری نادانی ہی۔ اُنھوں نے انگریزی وضع اختیار کی ہو تو سوچ سمجھ کر کی ہو گی اور کر لی ہو تو وہ اس کو چھوڑنے کیوں لگے۔ غرض ان سے تو ترکِ وضع کی اُمید رکھنی ہی فضول ہو اور جیسے سید صادق سے ترکِ وضع کی اُمید نہیں ویسے ہی اِدھر والوں سے بھی توقع نہیں کہ اس وضع کے آدمی کے ساتھ وصلت کو جائز رکھیں۔ کنبے والوں کا تو کچھ نہیں، ممکن ہو کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ لیکن بیٹی ذات کا سر پر ماں موجود ایک چھوڑ دو دو بہنیں۔ چھوٹی ہی سہی مگر ہیں تو بیاہی ہوئیں صاحبِ اولاد۔ کیوں کر ہو سکتا ہو کہ ہر ایک گھر کے بسانے کے پیچھے اتنے گھروں کو اجاڑ بیٹھوں اُدھر ایک تو پردیس اور پردیس سے بڑھ کر انگریزی وضع اور اِدھر صادقہ کی غم خواروں کی وجہ سے اس کی نسبت عام واہمہ۔ عجب تردد کا مقام ہو ع گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل۔

میر خسرو اسی سوچ میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں **میاں مشیر** آنکلے۔ مشیر سے اور میر خسرو سے دور کا رشتہ بھی تھا۔ دونوں ہم عمر اور کسی زمانے میں ہم مکتب بھی رہے تھے۔ دونوں میں گاڑھی دوستی نہ تھی تو چنداں اجنبیت بھی نہ تھی۔ صادقہ کا حال رشتہ دار تو رشتہ دار سرسری جان پہچان والوں سے

بھی کسی پر چھپا نہ تھا۔ میر خسرو کو متردد دیکھ کر چھوٹتے ہی مشیر نے پوچھا۔"خیریت تو ہے؟ آج تو کچھ بہت ہی پریشان معلوم ہوتے ہو۔"

میر خسرو۔"دیکھتے ہی ہو نہ۔ دنیا میں خانہ داری کی بھی مٹی ہی خوار ہے۔"

مشیر۔"ماشاء اللہ چشم بد دور۔ ظاہر حال تو پریشانی کی کوئی وجہ ہی نہیں اور یوں تو دنیا کے رگڑے جھگڑے چلے ہی جاتے ہیں۔ اگر کوئی کار خدمت اس نالائق کے قابل ہو تو تم کو میرے ہی سر کی قسم فرمانے میں ہرگز تامل نہ کرنا۔"

میر خسرو۔"جزاک اللہ۔ تم سے یہی توقع ہے۔ مگر بعض مواقع ایسے پیش آ جاتے ہیں کہ کسی کی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ تم کو میری بڑی لڑکی کا حال تو معلوم ہی ہے۔ علی گڑھ سے بلکہ علی گڑھ کا بھی کیوں نام لوں۔ بنارس سے اس کا پیام آیا ہے۔ سب باتیں اچھی ہیں لڑکا ذات کا سید ہے۔ بی اے پاس ہے خوش رو بھی ہے۔"

مشیر (بات توڑ کر)"از برائے خدا آنکھیں میچ کر منظور کر لو۔"

میر خسرو۔"ہاں میری بھی یہی رائے ہے اور منظور نہ کروں گا تو کیا کروں گا۔ کچھ یوں ہی سا خیال تو پردیس کا تھا سو اس کو بھی میں نے جانے دیا۔ ایک بڑی مشکل یہ واقع ہوئی ہے کہ لڑکا علی گڑھ کالج میں پڑھتا ہے عقیدے کی خبر تو خدا کو ہے مگر ظاہری وضع بالکل وہی سید احمد خانیوں کی سی ہے۔ اس کو کیا کیا جائے؟ بھلا اور نہیں تو لڑکی کی ماں کا راضی کرنا تو مقدم ہے۔ سو میں یہی بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مولویوں سے فتویٰ لوں وعظ کہلواؤں کیا کروں۔"

مشیر۔"مولویوں کی طرف سے تو ہاتھ دھو رکھیے۔ یہ مولوی یوں بات بات میں ایک دوسرے سے لڑتے بھی ہیں جھگڑتے بھی ہیں یہاں تک کہ سارے شہر میں کوئی ایک مولوی بھی ایسا نہیں نکلے گا جس کی نسبت کفر کے فتوے نہ لکھے گئے ہوں۔ مسلمانوں میں جتنے مولوی ہیں اتنے گروہ۔ ایک کے پیچھے ایک بلکہ ایک کے ساتھ ایک نماز پڑھنے تک کا روادار نہیں پھوٹ تو اس قدر ہے مگر سید احمد خاں کو

تو کوئی بھی اچھا نہیں کہتا۔ اور میری نظر میں تو ایک مولوی بھی نہیں آتا جو انگریزی وضع کے جواز کا فتویٰ دے۔ اور کوئی مسئلہ ہوتا تو میں جیسا کہتے فتویٰ لکھوا کر لا دیتا کچھ بڑی بات نہ تھی۔ ایک وقت کی دعوت کر دو، اور مولوی صاحب کو جیا ہو کھلاؤ نہیں، ان کا حصہ اُن کے گھر پہنچا دو پھر جیسا چاہو فتویٰ لکھوا لو، اور جب اور جتنی دیر چاہو وعظ کہلوا لو لیکن انگریزی کے نام سے تو سبھی مولوی بدکتے ہیں۔ جانتے ہیں نہ کہیں انگریزیت ایک دن دنیا جہان سے مولویوں کا کھوج اکھو کر رہے گی تو میری صلاح تو یہ ہے کہ مولویوں کا نام ہی نہ لو۔ اِن سے تو کچھ ہونا ہوانا نہیں۔ اپنی قوت بیانیہ کو کام میں لاؤ اور کسی قدر اپنا زور بھی دکھاؤ۔ ایسا بھی کیا ہے کہ تمھارا کہنا نہ چلے۔ بابا ہاں خوب خیال آیا فریق ثانی سے شرط کر لو کہ نکاح کے لیے اپنے ملکی لباس میں آئیں۔ آخر سمجھدار لوگ ہیں اتنی دیر میں کیا ہوا جاتا ہے پھر نکاح ہوئے پیچھے اُن کو اختیار ہے۔"

بات معقول تھی آخر میر خسرو کی یہی رائے قرار پائی کہ دھوم دھڑکا غل غپاڑا مہمان داری کچھ نہ کرو۔ اور چُپ چُپاتے نکاح کر دو۔ سیّد صادق آدمی ہے معقول پسند ضرور رضامند ہو جائے گا۔ بڑا رضامند ہونا صادقہ کی ماں کا ہے وہ ہاں کر لیں تو میں سید صادق کو خط لکھے بھیجتا ہوں، ایک دن کے لیے چلے آئیں اور نکاح پڑھا کر چاہیں بی بی کو ساتھ لے جائیں اور چاہیں یہیں رہنے دیں، جیسی اُن کی مرضی چنانچہ ایک دن موقع پا کر میر خسرو نے بی بی سے کہا "کیوں صاحب۔ وہ صادقہ کی بات کی کیا ٹھیری؟"

بی بی "ٹھیرتی ٹھیراتی کیا ہے کسی اس شہر والے کا پیام ہوتا تو میں سو جتن کرتی۔ اپنی آنکھوں سے لڑکے کو دیکھتی۔ گھر کا چال چلن دریافت کرتی۔ اصل حقیقت کھلتی ہی کھلتی۔"

میاں "خط سے بڑھ کر اور کیا حقیقت کھلتی ہے اس بے چارے نے کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی۔ اس قدر حال تو برسوں کے پاس رہنے سے بھی معلوم نہیں ہو سکتا اور خط کا ذمہ میں لیتا ہوں کہ اُس میں ایک حرف کی کمی بیشی ہی نہیں۔ بس جو روداد ہے سو یہ ہے۔ اب اس پر کہو کہ تمھاری کیا رائے ہے؟"

بی بی۔"یہ تصویر ہی دیکھ کر طبیعت رُکتی ہے۔ اور کیوں جی اگر کہے سُنے سے لڑکا مان جائے اور ہمارے یہاں کا جوڑا پہن کر آئے؟"

میاں"۔ممکن نہیں۔ ایسا تو بھول کر بھی خیال نہ کرنا۔ تم اُس کو کہتی ہو لڑکا! اجی ہم تم جیسے تو اُس کے ناخونوں میں پڑے ہیں۔ مجھ کو تو اس سے بات کرتے ہوئے بھی لحاظ آتا ہے۔ کیا بتاؤں کہ وہ کس رُتبے کا آدمی ہے۔ تمہارے شہر میں اُس کی لیاقت کے شاید دس آدمی بھی نہ ہوں گے۔"

بی بی"۔خیر تم آپ نہ لکھو تو کسی سے لکھوا بھیجو۔ دیکھو تو کیا جواب آتا ہے۔"

میاں"۔تم اِن لوگوں کے دستور قاعدے سے واقف نہیں ہو۔ یہ انگریزی مزاج کے لوگ ہیں۔ اپنی عقل کے آگے کسی کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے۔ ہمارے دیس کے مسلمانوں میں سب سے پہلے یہ وضع سید احمد خاں نے اختیار کی۔ ساری دُنیا ہی نے تو اُن کو چھیڑا، ڈرایا، دھمکایا، ملامت کی مگر آدمی ارادے کا اتنا تو پکا ہووے تب کسی کام کا بیڑا اُٹھائے۔ اُنھوں نے جو قدم بڑھایا تھا اُسی پر جمے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں کو اپنی وردی پہنا دی۔ اور یہ مناہی بھی جتھے کے ہیں۔ ان سے ترکِ وضع کو کہنا ان کو چڑانا ہے۔"

بی بی"۔تم تو کچھ ایسے ڈرتے ہو کہ خدا کی پناہ۔ داماد صاحب کیا آتے ہیں گویا ہمارے حاکم بن کر آتے ہیں۔ اچھا میں اپنی طرف سے لکھواتی ہوں۔"

میاں"۔خواہ مخواہ بھی؟ میں آج ہی انکار لکھ بھیجتا ہوں۔ تم بیٹھی لکھوایا کرنا۔"

بی بی"۔میری کیا جوتی کو غرض پڑی ہے۔ کرستان کو بیٹی دے کر کون اپنی ناک کٹوائے۔ اس مردوے کو یہ نہ سوجھا کہ میں کس مُنہ سے ایک بھلے مانس کے گھر پیغام دیتا ہوں۔ اس کی لیاقت کو لگاؤں جھلسا نگوڑا بے دین! انگریزوں کا جھوٹا کھانے والا۔ اپنی صادقہ کے بائیں پاؤں پر اس کو وار کے پھینک دوں۔ پادریوں کے یہاں بہتیری چماریاں بھری پڑی ہیں۔ ان میں گیا ہوتا جیسی روح ویسے فرشتے۔"

میاں"۔تم ایک مرد آدمی کو اس کے پیٹھ پیچھے ناحق اتنا کیوں فضیحت کرتی ہو جس کے گھر میں

بیری ہوتی ہے پتھر آیا ہی کرتے ہیں۔ نہیں کرنا منظور سیدھا جواب دے دیا۔"

بی بی "مرد آدمی۔ ایسے ہی مرد آدمی ہوتے ہوں گے؟ تمہارا بس چلے تو کنواں دیکھو نہ کھائی بیٹی کو آنکھ بند کرکے دھکا دے دو۔"

میاں "ہاں جی ہاں میں تو اولاد کا ایسا ہی دشمن ہوں۔"

بی بی "کیا دشمن کے سر میں سینگ ہوتے ہیں اور تم بے چارے کیا دشمنی کروگے؟ میں جیتی بیٹھی ہوں تمہاری دشمنی کو کب چلنے دیتی ہوں۔ بس آج سے اس کی بات میں دخل دیا تو تم جانوگے۔"

سیدانی کو جلال آیا تو کون روکے آخر بے چارے میر صاحب طرح دے کر ٹل گئے۔

نویں فصل

ماں صادقہ کی جدائی کے خیال سے کڑھتی اور میاں بی بی کو تسلی دیتے ہیں

اِدھر تو یہ جھگڑے پڑے ہوئے تھے اُدھر جس رات صادقہ نے پہلا خواب دیکھا اُس کے اگلے ہی دن سے ماں کو سامان خانہ داری سنبھالنا سمجھانا شروع کر دیا تھا۔ بلکہ ماں نے پوچھا بھی کہ کیا ہوا بات تو کہو میں نے تو تمہیں کبھی بھول کر بھی آدھی بات نہیں کہی اور کہتی کیوں؟ کیا میرا سر پھر انھا؟ تم ایسا کوئی کام ہی نہیں کرتیں۔ سارا گھر تم پر چھوڑ کر مہمان داخل دو روٹیاں میں بھی کھا لیتی ہوں۔ کبھی کچھ دخل دیا ہو تو تم ہی بتاؤ۔ رہے بھائی بہن۔ مجھ سے تو لڑ بھی لیں جھگڑ بھی لیں تم نے کچھ ایسا سدھار رکھا ہے کہ کوئی تمہارے حکم سے باہر نہیں۔ تم اٹھاؤ تو اُٹھیں اور بٹھاؤ تو بیٹھیں۔ باپ کا حال تم دیکھ ہی رہی ہو کب تمہاری صلاح کے ٹکڑا نہیں توڑتے۔ اور میری اِن کی تو کچھ اُفتاد ایسی طرح کی پڑ گئی ہے کہ بات بات میں رد و کد ہوتی رہتی ہے اور یہ اللہ بخشے تمہاری نانی کے ڈھنگ ڈالے ہوئے ہیں وہ کہا کرتی تھیں کہ جہاں تک ہو سکے مرد سے دبے ہی نہیں۔ سو تمہارے باپ ایسے ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں کہ اِن کو کچھ ہی کہہ لو اُلٹ کر جواب دینا

نہیں جانتے۔ اور تم ہو تو بیٹی مگر خاص کر تمھارا اتنا لحاظ کرتے ہیں کہ تمھارے ہاتھ سے پانی تک کے پینے کے روادار نہیں۔ تو بیٹی ایسا کیا قصور ہوا کہ تم گھر کی چیز بست مجھ کو دکھاتی سمجھاتی ہو؟"

صادقہ "اماجان۔ نہیں یہ بات نہیں۔ ہیں تو بال بال تم سب کی احسان مند ہوں اور اس گھر میں ایسی لالوں کی لال بن کر رہی ہوں کہ کیا کوئی بیٹی میکے میں رہے گی مگر اماجان اچھی بات ہے تم کو بھی ہر ایک چیز کا حال معلوم رہے۔ خدا جانے کیا اتفاق پیش آئے کوئی چیز درکار ہوئی وقت پر جا کر نکال تو لاؤ گی۔ اب تو تم اتنا بھی نہیں جانتیں کہ نمک کس کلھڑے میں ہے اور ہے بھی یا نہیں۔"

صادقہ کا جہیز تو بر سوں سے بنا ہوا طیار رکھا تھا اور صندوق اور کوٹھڑیوں کی کنجیاں اسی کے پاس تھیں اور یہی سارے گھر کی مالک و مختار تھی۔ ہمراز نے بہت دنوں سے اس کی جھولنیاں نمونے کے لیے منگوا بھیجی تھیں اب صادقہ نے واپس طلب کیں تو ہمراز نے جواب دیا کم بخت سنار ایسے وعدہ خلاف ہوتے ہیں کہ ہر روز آج کل کرتا ہے۔ اب تک تو دیں نہیں اب کل سے میں اس کے سر پر ایک آدمی بٹھاؤں گی اور اگلے جمعے تک ضرور ضرور آپ جھولنیاں لے کر آؤں گی میری جھولنیاں آلیں ان سے ملا لوں تب واپس کروں جمعے کے دن صادقہ سب کو دے دلا کر کھانا کھانے بیٹھی تھی کہ ہمراز جھولنیاں لیے ہوئے آپہنچی۔ وہ بہتیرا عذر کرتی رہی صادقہ نے زبردستی ہاتھ پکڑ کر کھانے پر بٹھالیا کھانے کے بعد ہمراز نے دونوں جوڑیاں نکال صادقہ کے آگے ڈال دیں کہ لو اپنی پہچان لو ہر چند صادقہ نے دیکھا کوئی تمیز نہیں ہوتی تھی آخر ہلکی جوڑی کو کہا کہ یہ ہمارے یہاں کی ہو گی ہمراز بولی "نہیں بھاری جوڑی تمھاری ہے بنواتی تو میں بھی اتنی ہی بھاری مگر اس وقت ہاتھ تلے روپئے نہ تھے۔"

صادقہ "پھر تم بھاری جوڑی رہنے دو۔"

ہمراز "آگ لگے مجھ بہنتی کو۔ تمھاری تم کو مبارک۔ الٰہی جھمکے کے بالے پہنے کبھی وہ بھی دن ہو گا کہ میں تم کو دولہن بنی دیکھوں گی۔"

صادقہ۔"تم نے آخر دعائیں مانگ مانگ کر اس دن کو بلا ہی بلایا۔"

ہمراز۔"سچ کہو؟ کہیں بات ٹھہر گئی کیا؟"

صادقہ۔"ٹھہری ٹھیرائی تو نہیں مگر میں نے اوپر تلے تین خواب دیکھے ہیں۔ اس کے بعد صادقہ نے اپنے خواب، اُن کی تعبیر، بنارس سے خط کا آنا، ماں باپ کی تکرار، سارا قصہ ہمراز کو کہہ سنایا۔ کہ تم چلتے ہوئے اماں سے کہتی جانا اور اُن کو سمجھا دینا کہ جہاں خدا کو منظور تھا میری تقدیر کا فیصلہ ہو چکا ہے، ابا جان سے لڑیں جھگڑیں نہیں۔ اور مذہب کے شبہے کو بھی دل سے نکال ڈالیں کہ یہ بات ہے بے اصل جو لوگ ایسی تہمت رکھتے ہیں ناحق ایک مسلمان کا گناہ سمیٹتے ہیں۔"

آدمی کی طبیعت کا بھی عجب حال ہے ذرا سے میں خوش ذرا سے میں آزردہ۔ صادقہ کی ماں یا تو صادقہ کے بیاہ کی دعائیں مانگتی تھی یا اب جو ہمراز نے صادقہ کا پیام جا کر دیا تو سنتے کے ساتھ منہ فق ہی تو ہو گیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اس سے پہلے ایک چھوڑ دو دو بیٹیاں بیاہ چکی تھی اور وہ خیر بہت آرام میں نہ تھیں تو چنداں تکلیف میں بھی نہ تھیں جیسی سبھی خانہ داریاں ہوتی ہیں ان کی بھی تھیں۔ مگر صادقہ کا بیاہا جانا تھا۔ ماں کو حقیقت میں معلوم نہ تھا کہ اس بیٹی کے ساتھ اُس کو کیسا تعلق ہے۔ یہ بیٹی اس کی بائیس برس کی رفیق تھی کہ ایک دن کو ماں سے جُدا نہیں ہوئی اور رفیق بھی ایسی کہ جب سے ہوش سنبھالا ماں کو پلنگ سے اُترنے نہیں دیا۔ دایہ گری یہ کرے۔ ماما گری یہ کرے۔ مغلانیوں کا کام یہ دے۔ بال بچوں کو نہلائے دُھلائے کپڑے بدلوائے۔ ان کی دوا دَرمن کھانے پینے کی خبر رکھے۔ گھری پڑی نیز سینے اٹھائے بیٹی کی بیٹی مصاحب کی مصاحب پھر اس کے بیاہ کے اٹکاؤ سے ماں کو بڑی بڑی ایذائیں پہنچی تھیں اس کے لیے ماں کا دل ایسا ہو گیا تھا جیسا پکا پھوڑا آم جاتا ہے۔ اب جو خدا خدا کر کے پیام بھی آیا تو پردیس کا۔ نہیں معلوم بنارس لے جائے گا یا ساتھ ساتھ لیے پھرے گا اور انگریزیت کا پٹنا الگ۔ کون جانے کہ دین پر بھی قائم رہے یا نہیں۔

غرض یہ روداد ماں کے رو دینے کو بس کرتی تھی۔ آخر میر صاحب کو باہر سے بلوایا۔ بی بی کو روتے دیکھ کر پوچھا

"خیریت تو ہی؟"

بی بی - "ہاں خیریت ہی ہی۔ مگر میری صادقہ مجھ سے چھٹی۔ یہ بنارس کا جو پیغام آیا ہی اس کے آنے سے پہلے صادقہ اسی مردوے کو خواب میں دیکھ چکی ہی اور اُس کو اس کا نام تک معلوم ہو گیا ہی اور اس نے یہ بھی خواب دیکھا ہی کہ گو اس کا ظاہر انگریزوں کا سا ہی مگر حقیقت میں مسلمان ہی صرف انگریزی کپڑے پہن رکھے ہیں۔ بس تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔"

میاں - "دیکھو میں تو تم سے کہتا تھا۔ تم ہی نے شبہہ کیا پھر اپنا دل کیوں تھوڑا کرتی ہو؟ اس دن کے لیے تو میں نے اور تم نے مدتوں ناک رگڑی ہی۔ اب خدا نے غیب سے سامان کیا ہی تو ہنسی خوشی اس کو رخصت کرو۔"

بی بی - "ہے ہے! صادقہ کو ہنسی خوشی رخصت کروں! میرا تو کلیجہ منہ کو چلا آتا ہی جس وقت سے ہمراز نے آکر کہا ہی بس ایسا معلوم ہوتا ہی جیسے کوئی دل کو مسوسے ڈالتا ہی۔ صادقہ بیٹی! تو پوتوں پھلے اور دودوں نہائے اور تو بوڑھ سہاگن ہو جیسے جیسے آرام تو نے مجھ کو دیئے ہیں ایک ایک کے بدلے ہزار ہزار سکھ دیکھے۔ خدا حافظ۔ خوش رہو آباد رہو۔ مگر ماں کو اپنی جدائی کا داغ دے چلیں۔ اب میں تمھاری صورت کو بیٹی ترسا کروں گی۔ برسوں سے تمھارے بیٹے بیٹے پر میں یہ بھی تو نہیں جانا کہ گھر کدھر ہی اور میں کدھر ہوں۔ اب تمھارے گئے پیچھے اس کھٹراگ کو کون سنبھالے گا؟"

غرض بیٹی کی جدائی کے خیال سے ماں کا دل بھر آیا تو کوئی آدھ گھنٹے میں جا کر سنبھلا تب میر صاحب نے کہا کہ تم نے ابھی سے صادقہ کو گیا ہوا کیوں فرض کر لیا ہی؟ کیا معلوم کہ طرف ثانی کا کیا ارادہ ہی۔ اس سے کہ انھوں نے خود پیام دیا ہی عجب نہیں بنارس میں رہنے کی مرضی نہ ہو اور ابھی پڑھ رہے ہیں تو علی گڑھ میں رہنے کا بھی کوئی موقع نہیں۔ اور رہا کہ بنارس ہی جانا ہوا تو یہاں سے وہاں تک برابر ریل ہی آج شام کو سوار ہو کر کل نمازِ عصر بنارس جا پڑھو۔ اور میں تو ایک سیدھی بات جانتا ہوں کہ جب آدمی اپنی

آنکھوں کے سامنے نہیں تو جیسا ٹکے ڈولی ویسا پردیس سچ کہا ہے آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ تمھاری ہی
دونوں لڑکیاں اسی شہر میں موجود ہیں۔ ہماری طرف سے شہر میں ہوئیں تو اور باہر ہوئیں تو رستہ آنا جانا خط پتر
تو ریل اور ڈاک اور تار کی بدولت ہم تو سارے ہندوستان کو اپنا ہی شہر سمجھتے ہیں۔ اور پھر یہ تو دنیا ہے کون
کس کے ساتھ رہا ہے اور کون کس کے ساتھ رہ جائے گا۔ اس کی مثال ناؤ سنجوگ کی سی ہے کہ جب تک ناؤ
دریا میں چل رہی ہے مسافر ایک جگہ مل بیٹھے ہیں۔ ناؤ کنارے لگی اور ہر ایک نے اتر اتر کر اپنا اپنا رستہ لیا۔
ناؤ کے مسافر ایک دوسرے سے بچھڑتے وقت نہ روتے اور نہ رنج کرتے، اس واسطے کہ وہ پہلے سے
سمجھے ہوئے تھے کہ یہ سنگ ساتھ پار ہونے تک کا ہے۔ ہم لوگ واویلا کرتے اور فریاد مچاتے اس لیے کہ ہم نے
غلطی سے ناؤ کو گھر فرض کر لیا ہے اور گھر بھی ہمیشہ ہمیشہ کا گھر۔ میرے ایک دوست ہیں ان کو فقیروں سے
بڑی ارادت ہے سو وہ اپنی ایک نقل بیان کرتے تھے کہ مجھ کو فقیروں سے ملنے کی ہمیشہ سے دھن رہی ہے۔
سالک ہو مجذوب ہو کسی رنگ میں ہو مجھے ایک بار اس سے ملنا ضرور۔ ہزاروں قسم کے فقیر نظر سے
گزرے۔ جو بات میں ڈھونڈتا تھا کہ بھلا اور کچھ نہ ہو تو فقیر سے مل کر تھوڑی دیر کے لیے دل تو
گداز ہو کسی میں نہ پائی بارے ایک دن خاکی شاہ ہمارے مکان کے تلے سے جا رہے تھے دو باتیں
ان میں بھی بڑی ہی عمدہ ہیں۔ ایک تو جمعے کے جمعے جنگل سے مسواکیں کاٹ لاتے ہیں۔ نماز کے بعد
جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جا بیٹھے جس کو ضرورت ہوئی اس نے مسواک اٹھا لی کسی نے از خود کچھ دے دیا
تو خیر ورنہ منہ سے نہیں مانگتے۔ بس یہی ان کی معاش ہے اور یوں کسی نے کچھ دینا چاہا تو کہہ دیتے ہیں
کسی اپاہج کو دو۔ میں تو کماتا ہوں اور کما سکتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ آندھی ہو مینہ ہو اندھیرا ہو اجالا ہو
پانچوں وقت جامع مسجد کی اول جماعت میں موجود۔ خیر تو ہمارے مکان کے تلے سے نکلے تو میں نے
سلام علیک کی۔ لگے پوچھنے کیوں صاحب کوئی درویش ملا؟ میں نے کہا تم کسی کو بتاتے ہی نہیں اور
مجھے خدا نے ایسی آنکھیں نہیں دیں کہ دیکھوں اور پہچان لوں۔ آہستہ سے لگے کہنے ان دنوں

ایک شخص آیا ہوا ہے۔ سقّوں کے بھیس میں ہے۔ لاہوری دروازے کے باہر نہر کے پل پر سبیل پلایا کرتا ہے
اُس سے تو ملو۔ خاکی شاہ تو اتنا کہہ کر چلتے ہوئے اور میں سیدھا نہر کے پل پر پہنچا۔ دیکھا تو واقع میں
ایک ادھیڑ سا شخص لوگوں کو کھڑا پانی پلا رہا ہے اور اس کا انداز کہے دیتا ہے کہ یہ سقا نہیں ہے آس پاس کے
سقّوں سے پوچھا تو سب نے انکار کیا کہ ہم تو اس سے واقف نہیں۔ غرض میں اس کی ٹوہ میں لگا رہا تو
معلوم ہوا کہ آٹے کی مشین میں دھیلا مشک کے حساب سے ہر روز ہزار ڈیڑھ ہزار مشکیں بھروائی جاتی ہیں
وہاں یہ بھی ڈہائی تین آنے کا پانی بھر آتے ہیں۔ رات کو یہ کام کرتے اور دن بھر سبیل پلاتے ہیں اور سبیل بھی
پنج کوئیوں کے پانی کی۔ میں نے اس شخص سے لگاوٹ کرنی چاہی تو ہاتھ نہ دھرنے دے۔ آخر میں نے
ایک دن پنج کوئیوں پر جالیا اور تخلیہ پاکر کہا کہ اگر تم کو کچھ خدا کا رستہ معلوم ہے تو اتنا مضائقہ کیوں
کرتے ہو۔ پانی پلانے میں فیاضی اور خدا رستہ بتانے میں بخل۔ یہ سن کر مشک تو کندھے پر سے اُتار کر
رکھ دی اور ہم دونوں زمین میں بیٹھ گئے تو کہنے لگے کیا ہیں۔ کیا تمھارے پاس رسول نہیں آیا ہے کیا تم پر
قرآن نہیں اُترا؟ اب کون سے رستہ بتانے والے کے منتظر ہو؟ خدا کا رستہ کھلا پڑا ہے اور سب کو معلوم ہے
اور تم کو بھی معلوم ہے۔ تم آپ تو رستے پر چلنا نہ چاہو اور رستہ بتانے والے کا یقین نہ کرو تو تم صرف بہانہ
ڈھونڈھتے ہو۔ کیا تم نے قرآن میں دوزخ کا حال نہیں پڑھا کلما القی فیہا فوج سالھم خزنتھا
الم یاتکم نذیر قالوا بلی قد جاءنا نذیر فکذبنا وقلنا ما نزل اللہ من شئ ان انتم الا فی ضلال کبیر
کہ جب اُس میں کافروں کی کوئی ٹولی جھونکی جائے گی تو دوزخ کے پہرے چوکی والے ان سے پوچھیں گے
کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں گیا تو جواب دیں گے ڈرانے والا آیا تو سہی مگر ہم نے اس کو
جھٹلایا اور خدا نے تو کوئی چیز اتاری نہیں تم ہی گمراہی میں پڑے ہو۔ تم جو خدا کا رستہ پوچھتے پھرتے ہو
تو اس کے یہی معنی ہیں کہ تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا یا پہنچا مگر تم کو اُس کے ڈرانے پر
قناعت نہیں اور چاہتے ہو کہ اس سے بہتر کوئی ڈرانے والا ہو۔ تو عزیز من یہ تو بہت ہی بُرا خیال ہے۔

اور کوئی مولوی سُن پائے تو ابھی کفر کا فتویٰ لکھ مارے۔ یہ سب شیطان کے دھوکے ہیں۔ ظالم نے کہاں دین کی آڑ میں جاکر غلّہ مارا ہے پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو وحی نازل ہوتی تھی بلا کم وکاست سب کو پڑھ کر سُنا دیتے تھے اور لکھوا دیتے تھے۔ چنانچہ اس کا مجموعہ قرآن میں موجود ہے۔ اس میں سے ایک لفظ بلکہ ایک حرف بلکہ ایک شوشہ گھٹا نہیں اور گھٹے گا بھی نہیں۔ ایک لفظ بلکہ ایک حرف بلکہ ایک شوشہ اس میں بڑھا نہیں اور بڑھے گا بھی نہیں۔ کیونکہ خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا اور فرمایا ہے وانا لہ لحافظون قرآن میں ہمارے لیئے روز قیامت تک پوری اور مکمل اور کافی ہدایت موجود ہے۔ وہ میرے دوست کہتے تھے کہ سفی کی یہ تقریر سن کر میں تو دنگ ہوگیا۔ اور میں نے اپنے جی میں کہا اللہ اکبر یہ تو کوئی بڑا شخص ہے اس سے بڑھ کر کوئی کیا درویشی کرے گا یہ تو علمی لیاقت ہے اور یوں اس شخص نے اپنے تئیں مٹی میں ملا رکھا ہے۔ آخر میں نے کہا تو پھر پیری مریدی کوئی چیز نہیں۔ تو اس کا ایسا معقول جواب دیا کہ بس تسلی کر دی۔ کہا ظاہر اور باطن دونوں کی اصلاح کا نام ہی دین۔ مثلاً طہارت ایک تو ظاہر کی ہے کہ آدمی کے جسم پر لباس پر اس کے بیٹھنے کھڑے ہونے کی جگہ پر گندگی غلاظت گھن کی کوئی چیز نہ ہو۔ اگر کسی نے غسل کیا وضو کیا صاف ستھرے کپڑے پہنے پاک جگہ میں کھڑا ہوا اس کا ظاہر درست ہوگیا۔ مگر خدا کی نظر میں وہ اتنا کرنے سے درست نہیں ہوا جب تک اپنے دل کو غصّے اور لالچ اور غرور اور حسد کی گندگی سے پاک نہ کرے تب ہو کہ قسم نہ کھائے جھوٹ نہ بولے فحش نہ بکے کسی کی غیبت نہ کرے۔ غرض دین کے یہ دو بڑے رکن ہیں ظاہر کی اصلاح اور باطن کی صفائی۔ قرآن میں دونوں کی تاکید ہے اور ایک ساتھ دونوں ہی کی تعلیم اور تعمیل ہونی چاہیئے۔ لوگوں نے غلطی یہ کی کہ دونوں شاخوں میں جدائی قائم کردی۔ مولویوں نے تو لیا ظاہر اور اس پر اتنا زور دیا کہ لوگ باطن کو بھول گئے۔ مشائخ نے باطن کو پکڑا اور ظاہر سے کی غفلت۔ نماز کے متعلق مولوی ان باتوں میں تو اختلاف کرتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی فاتحہ پڑھے یا نہ پڑھے آمین

پکار کر کہی جائے یا آہستہ، رفع یدین ہو یا نہ ہو۔ لیکن حضور قلب سے ان کے یہاں بحث ہی نہیں اور اگر اس کو شرط قرار دیا ہوتا تو عربی کی یوں مٹی ہی کیوں خوار ہوتی کہ کوئی دن کو عنقا شاید ڈھونڈے سے کہیں مل بھی جائے مگر عربی داں دوا کو بھی میسر نہیں آئے گا۔ خیر یہ تو مولویانہ نماز ہے کہ سمجھو یا نہ سمجھو کھڑے ہوئے رکوع میں گئے، سجدہ کیا، التشہد پڑھا، سلام پھیرا، نماز ہو گئی۔ مشائخ کہتے ہیں نماز نام ہے حضور قلب کا اور وہ اس سے نہیں ہوتا کہ قبلہ کی طرف منہ کیا، نیت باندھی، خیال جم گیا۔ اس کے لیے چاہیے برسوں کی ریاضت تاکہ آدمی کو خیال جمانے کی عادت پڑے۔ مگر ظاہر کی اصلاح ہو یا باطن کی صفائی، دونوں کا اصل الاصول اول درجے میں قرآن دوسرے درجے میں حدیث۔ بلکہ قرآن اور حدیث کو بھی یوں سمجھو قرآن متن ہے اور حدیث اس کی تفسیر۔ مولوی باطن پر زور نہ دیں مگر اُن کی تعلیم یہی دو چیزیں ہیں جن کے ذریعے سے حکم خدا اور رسول ہم تک پہنچا ہے۔ مشائخ چپکے چپکے کچھ ایسا گلچھڑا بیں گڑ پھوڑتے ہیں کہ ان کا کچھ بھید ہی نہیں کھلتا۔ اور انھوں نے سینہ بسینہ ایک تعلیم ایجاد کی ہے مولویوں کی تعلیم سے الگ۔ اور اُس کو انھوں نے اپنے گروہ کے ساتھ خاص کر رکھا ہے گویا وہ راز ہے جس کو خدا نے عام مسلمانوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہا۔ سو بھائی اپنی سمجھ میں تو آتا نہیں کہ خدا ایک، رسول ایک، قرآن ایک، دین ایک، پھر یہ میری تیری کیسی نتیجہ یہ ہے اور اس کے سوائے ہونا بھی کیا تھا کہ جو لوگ مولویوں سے ہدایت پاتے اکثروں کے معاملات اچھے نہیں اس لیے کہ اُن کے دلوں میں نیکی کا بیج نہیں بویا گیا۔ دین کے ساتھ ان کی نسبت ایسی ہی جیسے قانون کے ساتھ وکیل کی کہ مقنن کی اصل غرض سے تو اس کو مطلب نہیں وہ جس طرح بن پڑتا ہے اپنے موکل کو قانون کے لفظوں کی گرفت سے بچانا چاہتا ہے۔ دوسری طرف مشائخ کا گروہ رعایتی ہے جیسے بادشاہی چیلے کہ وہ خدا کے ساتھ ایک طرح کی خصوصیت جتاتے ہیں اور ان کے یہاں احکام شرع ظاہر معطل نہیں تو بے قدر ضرور ہیں۔ اس پر میں نے پوچھا تو آپ کو کسی سے بیعت نہیں۔ کہا ہی نہیں، اور ہو گی بھی نہیں، اور میں اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔ تم کو میرے بارے میں دھوکا ہوا ہے میں مختصر طور پر اپنا حال بیان کیے دیتا ہوں۔

اِس سے تم سمجھ لوگے کہ میں کیا ہوں۔ میں نے دیوبند کے مدرسے میں مدتوں طالب العلمی کی ہی اور درسی کتابیں سب میری نظر سے گزری ہیں مگر میری طبیعت واقع ہوئی تھی غیور۔ مولویت کی شان سے معاش پیدا کرنے کو میں پسند نہیں کرتا تھا اور مولویت کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ مجبور میں نے ریلوے پر کنکر کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ اس میں ایسی ناجائز کارروائی کرنی پڑتی تھی کہ کرتا ہوں تو طبیعت گوارا نہیں کرتی اور نہیں کرتا تو اُلٹا نقصان ہوتا ہی۔ ایک دن بڑے سویرے نماز صبح پڑھ کر میں کنکر کے ڈھیروں کو دیکھتا پھرتا تھا کہ اتنے میں معمول کے مطابق ریل طیار ہوئی۔ سٹیشن پر چھیاد ستو ہر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چہل پہل رہی یہاں تک کہ ریل روانہ ہوگئی۔ اس کا چلنا تھا کہ مجھے خیال آیا جس طرح اس ریل کی ابتدا اور انتہا ہی اسی طرح دُنیا کا آغاز و انجام ہی۔ جس طرح ریل کی گاڑیوں کے درجے ہیں فرسٹ کلاس، سکنڈ کلاس، انٹرمڈیٹ کلاس، تھرڈ کلاس۔ اسی طرح کیا دنیا کیا دین کُل باتوں میں لوگوں کے مدارج ہیں۔ کوئی امیر ہی کوئی غریب۔ کوئی بد ہی کوئی نیک۔ جس طرح اسٹیشنوں پر روانگی سے پہلے لوگوں کو ٹکٹ دئے جاتے ہیں جن میں ایک مقام خاص تک اُن کو سفر کرنے کی اجازت ہوتی ہی اسی طرح لوگوں کی تقدیریں ہیں عمر کے اعتبار سے رزق کے اعتبار سے اولاد کے اعتبار سے اور سب چیزوں کے اعتبار سے۔ جیسی نسبت سٹیم کو ریل کے انجن سے ہی ویسی ہی یا اسی کے قریب قریب انسان کی روح کو اُس کے جسم سے ہی جس طرح کوئی مسافر بیچ میں ریل پر سے اُترنے اور اپنی حد سے بڑھنے نہیں پاتا اسی طرح ہم سے جبراً اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ و لا یستقدمون[1] کی تعمیل کرائی جاتی ہی۔ غرض ان خیالات نے میرے دل پر ایسا ہجوم کیا کہ جہاں کھڑا تھا دوپہر تک وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر اپنی حالت پر آیا تو طلب دنیا کو جی نہ چاہا۔ اور اب میں اس حال میں ہوں جو تم دیکھتے ہو۔ چاہے اس کو فقیری سمجھو اور چاہے جنون۔ نہ مجھ میں خرقِ عادت ہی نہ کرامت اور نہ اس

---

[1] وعدے سے زیادہ نہ کم۔

حال میں رہنے سے میں اپنے تئیں کسی مدح کا مستحق سمجھتا ہوں۔ میں نے دُنیا کو ویسا ہی سمجھا جیسی وہ ہے اگر میں دُنیا سے کسی قدر الگ ہو گیا ہوں تو یہ میری کمزوری ہے اور میں اس شان کو بدلنے ہی والا ہوں تاکہ تمھاری طرح دوسروں کو دھوکا نہ دے سکوں۔

دسویں فصل

صادقہ کا بیاہ

یہ حکایت تمام کر کے میر خسرو نے بی بی سے کہا کہ مجھ کو یہ بات نا وسنجوگ پر یاد آگئی اور تمھاری سمع خراشی تو ہوئی مگر میں اُمید کرتا ہوں کہ تمھارے دل کو اس سے کسی قدر تسکین بھی ہوئی ہوگی کیوں کہ آدمی کو خدا نے ایسا ہی بنایا ہے کہ خیال کو اس کے رنج و راحت میں بڑا دخل ہے۔ تو آج میں سید صادق کو منظوری لکھے بھیجتا ہوں اور ہاں میری یہ بھی رائے ہے کہ تم دو بیٹیوں کو دُنیا کے دستور کے مطابق بیاہ چکی ہو اب وہ سب بکھیڑا کرنا کیا ضرور ہے صادقہ ایسی سمجھ دار بیٹی ہے کہ وہ بھی اسی کو پسند کرے گی اور سید صادق تو یقیناً حد سے زیادہ خوش ہوں گے۔

بی بی: "بکھیڑا کرنے ہی والا کون ہے؟ کرتیں تو صادقہ ہی کرتیں۔ اور آخر دونوں بہنوں کے بیاہ میں اندر باہر سارا انتظام انھوں ہی نے کیا تھا۔ مجھ سے تو کچھ ہونا ہوانا نہیں اور اب تو میرا دل ہی ٹھکانے نہیں بیٹی کو سر سے ٹالنا اور دھکّے دے کر گھر سے نکالنا ہے۔ دن کے بدلے چُپ چُپاتے رات کو ہو تو اور اچھا۔"

غرض میر صاحب نے سید صادق کو لکھ بھیجا کہ ہم نے آپ کی درخواست بخوشی منظور کی آپ نے اپنے خط میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ کسی کو رنج دینا گو وہ رنج بے اصل و بلا وجہ معقول ہی کیوں نہ ہو میں جائز نہیں رکھتا۔ آپ کی اس سلامت روی کے بھروسے پر مستورات کی یہ تمنّا ہے کہ حتی الامکان لوگوں کو

آپ اس کا موقع نہ دیں کہ آپ کی وضع ظاہر کی وجہ سے ہم کو رنج پہنچائیں۔ اور جو خیالات آپ نے خط میں
ظاہر کیئے ہیں اُن ہی سے ملتی ہوئی یہ بات بھی ہے کہ ہم شرعی نکاح چاہتے اور اس کے لیئے ہمہ وقت
طیار ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ کو پانچ ہزار مہر مثل کے قبول کرنے میں کچھ عذر ہوگا۔ راقم خیر سگالی
اس کے جواب میں سید صادق نے جیسے اُن کی عادت تھی پھر اپنے چند حکیمانہ خیال ظاہر کیئے کہ میں نے
دیدہ و دانستہ انگریزی لباس میں اپنی تصویر کھچوا کر آپ کی خدمت میں بھیجی اور مقصود یہ تھا کہ انگریزی
وضع اور تصویر کے بارے میں میرا خیال آپ پر ظاہر ہوا اور یہ نمونہ ہو میرے عام خیالات کا۔ اب تعجب بہت کچھ
فرو ہوگیا ہوگا اور جیسا کہ وقت کا تقاضا ہے لوگ خود بخود انگریزی وضع اختیار کرتے چلے جاتے ہیں
لیکن شروع شروع میں اس پر ایسا غل مچا نہ صرف عوام میں بلکہ عوام سے بڑھ کر خواص میں گویا انگریزی
کپڑے پہن لینا یا انگریزوں کی طرح یا اُن کے ساتھ میز پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا کفر و ارتداد ہے
اور اس کے فتوے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ زمانہ جو سب کی عقلوں کو ٹھیک بنا دیتا ہے اس غلطی کی بھی
اصلاح کرتا اور ہم دیکھتے ہیں کہ کر رہا ہے اور کسی قدر کر بھی چکا ہے تو کیا سید احمد خاں کو باؤلے کتّے نے
کاٹا تھا کہ ناحق بیٹھے بٹھائے اپنے تیئں انگشت نما کر لیا؟ نہیں نہیں۔ لیکن سید احمد خاں کے درد کو
ہر شخص نہیں پا سکتا۔ ان میں بڑی صفت یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے زمانے کی رفتار کو پہچانتے اور مسلمانوں کو
آگاہ کر دیتے۔ ان کی مثال مسلمانوں کے ساتھ ایسی ہے کہ گرمی کے دنوں میں ہمارے ہندوستان کے
بعض مقامات میں ایسی سخت لُو چلتی ہے کہ خدانخواستہ آدمی کو لگ جائے تو ٹھکانا نہ کھائے۔ ایسی ہی جگہ
ایک شخص نے مئی جون کی ساری رات لغویات میں بسر کی، صبح ہوتے سویا۔ دن چڑھتا چلا آتا ہے
اور وہ دھوپ میں کھلی چھت پر غفلت کی نیند پڑا سوتا ہے اور لُو کوئی دم میں چلی کی چلی۔ اس کا
ایک رفیق دردمند اس کو جھنجوڑتا اور چلاتا کہ خدا کے لیئے کیا غضب کرتا ہے اٹھ بھاگ۔ اور یہ شخص ہے
کہ اُلٹا اس رفیق پر جھنجلاتا کہ کیوں میری نیند خراب کرتا ہے۔ معلوم ہے کہ دھوپ کی تیزی اس کو سونے نہیں دے گی

اور بہ جاگئے اور اس کا اچھا جاگے - مگر اس کا بھی تو ڈر ہے کہ کہیں سوتے کا سوتا ہی نہ رہ جائے۔ اسی طرح
جو کچھ سید احمد خاں کہتے ہیں مسلمان اگر دُنیا میں رہنا چاہیں گے تو کریں گے اور اس سے
بڑھ کر کریں گے مگر ابھی نہیں - اچھی طرح مٹ لیں گے، پیٹ بھر کر خراب ہو لیں گے تب کہیں جا کر
سمجھیں تو سمجھیں میں جانتا ہوں اور افسوس کرتا ہوں کہ سب لوگ کیوں نہیں جانتے کہ سید احمد خاں کے
دل میں انگریزی وضع کی ذرا بھی وقعت نہیں اور وہ سب سے بڑھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ وضع ہماری ملکی
حالت کے بھی مناسب نہیں سگر ان کو اس وضع کے اختیار کرنے اور دوسروں کو اس کے اختیار کرنے کی
ترغیب دینے پر مجبور کیا ہی دو چیزوں نے - اول یہ کہ انگریز ٹھہرے حکام وقت - ان کی نسبت سے
ان کی کُل چیزوں میں وقار آگیا ہی، از انجملہ وضع میں بھی - تو مسلمان وہ وقار کیوں پیدا نہ کریں؟
دوسرے یہ کہ دنیاوی ترقی کے لیے جہاں تک ممکن ہو ہم کو چار و ناچار انگریزوں کے ساتھ سازگاری
رکھنی اور اُن کی پیروی کرنی ضرور ہی اور اس کی جہاں اور بہت سی تدبیریں ہیں ایک یہ بھی ہی کہ ہم ان کے
ساتھ ان ہی کی زبان میں گفتگو کر سکیں، انہیں کے طور پر رہیں کہ اس سے اختلاط میں آسانی ہوتی ہی -
اور ان دو غرضوں کے علاوہ ایک اہم مطلب اور ہی کہ مسلمانوں نے جو اپنے مذہب کو ہندوؤں کے دھرم کی
طرح چھوئی موئی بنا رکھا ہی ذرا ٹھیس لگی اور کُملایا اور یہ خیال ان کو پنپنے اور اُبھرنے نہیں دیتا - یہ اپنی
آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جو شخص لا اله إلا الله محمد رسول الله مُنہ سے کہتا اور دل سے اس کا
عقیدہ رکھتا اور عقیدہ نہ رکھے گا تو اس آزادی کے زمانے میں مُنہ سے کہتے ہی کیوں لگا ہی کوٹ پتلون
پہنے ہی اور مسلمان ہی - میز پر چھری کانٹے سے کھا رہا ہی اور مسلمان ہی - انگریزی زبان بول رہا ہی اور مسلمان ہی -
غرض اُس کا سارا ظاہر انگریزوں کا سا ہی اور مسلمان ہی - میں بھی ذاتی آسایش کے اعتبار سے تو
انگریزی وضع کو پسند کرتا نہیں مگر مصلحتوں کے خیال سے نہ صرف پسند کرتا ہوں بلکہ جن کی نیت بخیر ہی
اُن کو تحسین کا مستحق جانتا ہوں - مجھ کو معلوم ہی کہ اس وضع کے لوگ نفرت سے دیکھے جاتے ہیں

اور مذہبی خیالات کے تزکیے کو ابھی مدتیں چاہئیں اور میرا مطلب اُنس پیدا کرنا ہے نہ وحشت دلانا۔ تو آپ پورا اطمینان رکھیں کہ سوائے اُس زیب و زینت کے جو مردوں کو شایاں نہیں آپ مجھ کو اُسی شان میں دیکھیں گے جس شان میں آپ مجھے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ جو خوشی مجھ کو اپنی درخواست کے منظور کیئے جانے سے ہوئی اُس سے دو چند بلکہ زیادہ اس بات سے ہوئی کہ آپ شرعی طور سے اس کام کا سرانجام کریں گے۔ میں ان بیہودہ اور لغو اور لایعنی مصارف کا جو ایسے مواقع پر کیئے جاتے ہیں سخت مخالف ہوں اور اس دستور کو من جملہ اسبابِ افلاس مسلمانان سمجھتا ہوں۔ اور اگر میں کسی اجنبی محض مسلمان کے یہاں بھی سُن پاتا ہوں تو مجھ کو قریب قریب ویسی ہی ایذا ہوتی ہے جو اپنے ذاتی سرمایئے کے نقصان سے ہوتی۔ افسوس ہے کہ مسلمان جو ان دنوں سب سے زیادہ محتاج ہیں ایک پیسہ بھی جھوٹی شیخی اور نمود میں اگر ضایع کریں۔ مہر کے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ اگر مُسلمان مرد اور عورت میں نسبت مساوات کو قائم رکھیں جو شارعِ اسلام کو وللرجال علیھن درجۃ کے لحاظ سے اُن میں قائم رکھنی منظور تھی تو مہر جتنا کم ہو بہتر۔ لیکن ہم لوگوں نے اُس نسبت کو قائم نہیں رہنے دیا اور ملکی دستورات نے عورتوں کے بہت سے حقوق چھین لیئے ہیں اور سوائے اس کے کہ مہر زیادہ کیئے جائیں عورتوں کے باقی ماندہ حقوق کی حفاظت کی اور کوئی تدبیر نہیں۔ پانچ ہزار روپیہ اگرچہ میری حیثیت موجودہ سے زیادہ ہے مگر مجھ کو اُس کے قبول کر لینے میں کچھ بھی عذر نہیں۔ بات یہ ہے کہ میں نے آج تک اپنے والدین کی نافرمانی نہیں کی بلکہ میں نے اُن کے ہوتے اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں رکھا کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ والدین میرے سچے خیر خواہ ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں میری بہتری کے لیئے۔ تو میں نے اپنا دستور یہ رکھا کہ جو فرمایا تعمیل سے سروکار رکھا۔ کبھی یہ بھی تو نہ پوچھا کہ اس سے کیا غرض ہے۔ اب جو میں نے اس تعلق کا خیال کیا تو ساتھ ہی جی میں یہ بات بھی ٹھیرالی کہ میں یہ کام اپنی ہی پسند اور اپنی ہی تجویز سے

کروں گا۔ اور میں اس کو اپنا حق انسانیت سمجھتا ہوں معلوم نہیں کہ والدین اس سے اتفاق رائے کریں
یا نہ کریں لیکن اگر کریں بھی تاہم میں اس آزادی کے عمل میں لانے کو نافرمانی ہی سمجھتا ہوں اور
میں نے اپنے لیے اس جرم کی یہ سزا تجویز کی ہے کہ اپنے تئیں تمام حقوق فرزندی سے محروم رکھوں
اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت میری حیثیت کچھ بھی نہیں۔ مجھ کو کالج سے اسکالرشپ ملتا ہے اور وہ اتنا ہے
کہ میں اس سے اپنی مختصر خانہ داری کو بخوبی چلا سکوں گا۔ نوکریاں مجھ کو اب بھی ملتی ہیں۔ جب تک
امتحان کے مرحلے طے نہ کرلوں کوئی سی نوکری بھی اختیار نہیں کر سکتا اور معلوم نہیں کہ آئندہ
کیسے اتفاقات پیش آئیں گے۔ مگر دنیا باامید قائم ہے میں نے اسی غرض سے انگریزی پڑھی ہے کہ مجھ کو
معاش کی طرف سے فارغ البالی ہو اور ان شاء اللہ ہوگی اور ضرور ہوگی۔ پس اگرچہ پانچ ہزار میری
حیثیت موجودہ سے بہت زیادہ ہے میری حیثیت آئندہ سے کم اور بہت کم ہے اور چونکہ میں اس خیال کا
آدمی ہوں کہ برابر کے درجے میں مرد کو عورت کا عورت کو مرد کا پابند رہنا چاہیے عجب نہیں مجھ کو مقدار
مہر کے زیادہ کر دینے کا موقع ملے۔ اب میں نہیں سمجھتا کہ اس بارے میں زیادہ مراسلت کی ضرورت ہو۔
اور میں آج سے پندرہویں دن اپنے چند دوستوں کے ساتھ حاضر خدمت ہوں گا اور شرعی معاہدہ
ہو جانے کے بعد ایک ہفتہ رہ کر تنہا کالج کو واپس آؤں گا۔ اور جب تک امتحان سے فارغ ہونے کے بعد
میرا معاملہ یکسو نہ ہو اس انتظام کو جاری رکھوں گا۔ راقم۔ سید صادق۔ از بنارس۔

ایسا ہی ہوا کہ روز مقرر پر سید صادق اور ان کے دوست ہندوستانی بھلے مانسوں کے لباس میں
شام کو آئے۔ نکاح ہوا دونوں دوست اسی رات نو بجے کی گاڑی میں واپس گئے سید صادق ایک ہفتے تک
ٹھہرے رہے۔ ان میاں بی بی کے حالات بھی شروع سے آخر تک بڑے ہی بکار آمد اور دلچسپ ہیں۔
دونوں ابھی خاصی پکی عمر میں بیاہے گئے جب کہ دونوں سمجھتے تھے کہ بیاہ ہے کیا چیز۔ صادقہ کے خیالات
اس کی تعلیم کی وجہ سے اور صادق کے اس کی جبلی افتاد مزاج کے سبب ایسے ایک دوسرے سے

ملتے ہوئے تھے کہ وہ جو ایک جان دو قالب کہتے ہیں بس ان دونوں پہ صادق آتا تھا۔ دونوں کی غرض و غایت یہی تھی کہ جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے کو خوش رکھیں۔ بھلا پھر ان میں سازگاری ہوتی تو اور کن میں ہوتی؟ ایسا نہیں ہوا کہ راہ چلتے ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا ہو جیسا کہ عموماً ہوتا ہی بلکہ دونوں نے ایک دوسرے کو بقدرِ امکان جانا بوجھا۔ اور جانے سمجھے پیچھے میاں بی بی بننے پر راضی ہوئے۔ پس حقیقت میں ان کا ایجاب و قبول البتہ ایجاب و قبول تھا۔ وقت پر تو اعلان نہ ہوا مگر چھپانے کی چیز نہ تھی اور چھپاتے ہی کیوں آخر لوگوں کو معلوم ہوا اور معلوم ہوا تو گھر گھر اس کا چرچا تھا۔

گیارہویں فصل

دلّی کے مسلمانوں کی سوسائٹی

میر خسرو معمولی طور پر بیٹی کو بیاہنے تو شہر میں ان کے عزیز و اقارب دوست آشنا جان پہچان لاکر ہزار دو ہزار آدمی جانتے۔ یا اب گلی گلی کوچے کوچے ایک ڈھونڈو راسا پٹ گیا۔ مولوی تو ایسی باتوں کی ٹوہ ہی میں لگے رہتے ہیں، ان کو رسالوں کے واسطے مضمون، فتووں کے لیے مسئلہ، وعظ میں بیان کرنے کو قصہ ہاتھ آیا۔ سید صادق شروع سے اپنے پڑھنے لکھنے میں لگے رہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ان کو مسلمانوں کے مذہبی خیالات سے آگاہی نہ تھی۔ تھی اور بہت کچھ تھی مگر وہ اتنا ہی جانتے تھے کہ مذہبی تعصب مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کا مانع ہی۔ اب جو انھوں نے دلّی سے ایک تعلق پیدا کیا اور یہاں کے لوگوں نے زبردستی سر ہو ہو کر اپنے تئیں پہچنوایا تو انھوں نے جانا کہ شاید روئے زمین پر کہیں کے مسلمانوں کی مذہبی حالت ایسی ردی نہ ہوگی جیسی دلّی کے مسلمانوں کی۔ انھوں نے دیکھا کہ اس بدنصیب شہر کے بدنصیب مسلمانوں کو محاربات سلطنت اور ضعفِ سلطنت اور زوال سلطنت اور آخر کار ۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے جیسے جیسے صدمے پہنچے وہ اِن کو سینکڑوں برس تک پنپنے نہ دیتے

مگر یوں کہو خدا کی کچھ ایسی مہر کی نظر تھی کہ انگریز حاکم وقت ہوئے اور ماں باپ اولاد کی کیا پرداخت کریں گے جو انھوں نے رعیت کی پرداخت کی۔ اور ان کی عملداری میں رعیت اس قدر آسودہ ہوئی کہ کبھی کسی وقت میں نہ ہوئی ہوگی۔ لیکن مسلمانوں کی کچھ ایسی مت ماری پڑی کہ یہ لگے انگریزوں سے بدگمانی رکھنے۔ نتیجہ یہ ہوا اور اس کے سوائے ہونا بھی کیا تھا کہ دوسرے لوگ بازی لے گئے اور یہ مُنہ دیکھتے کے دیکھتے ہی رہے۔ بھلا کہیں خدا سے بندے کی ضد چلتی سُنی ہی؟ مٹ گئے، برباد ہو گئے، جیتے پھر بھی سب نہیں، ہزاروں میں ایک آدھ، وہ بھی دلی میں نہیں کہ بہ اپنی اُسی پُرانی لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہی کہ یہاں کے مسلمانوں پر خدا کا خاص غصہ ہی نعوذ باللہ من غضب اللہ اور وہ ابھی پورا نہیں ہوا۔ بلا سے یہ کہیں غارت ہو چکیں کہ مسلمانوں کے سر سے بلا ٹلے جس کم جہاں پاک مصیبت یہ ہی کہ آپ بگڑے سو بگڑے یہ نادان دوست دوسرے مسلمانوں کو بھی سنورنے نہیں دیتے مصرعہ میں تو ڈوبا ہوں مگر تم کو بھی لے ڈوبوں گا۔ یہ سچ ہی کہ بننا بگڑنا سب کچھ خدا کی طرف سے اور اُسی کے حکم سے ہی۔ لیکن خدا بھیڑیا یا شیر بن کر آدمیوں کو نہیں پھاڑتا پھرتا۔ اور نہ سانپ کے جون میں آکر ڈستا۔ بلکہ عادت الٰہی یوں جاری ہی کہ جو کچھ اُس کو کرنا ہوتا ہی ہمارے دل میں ویسے ہی خیال ڈال دیتا ہی۔ اور ہم ہی اپنے ہاتھوں سے اپنا فائدہ یا نقصان بھلائی یا بُرائی بہتری یا بدتری سب کچھ کر لیتے ہیں اور اپنے ہی تعلق سے تحسین یا ملامت کے مستحق ٹھیرتے ہیں۔ اور پھر انسان نرا پتھر بھی نہیں کہ جگہ سے سرکاؤ تو سرکے اور اٹھاؤ تو اُٹھے۔ بلکہ ایک حد تک فاعل مختار ہی۔ اور خدا نے کسی کو اس حد کا علم نہیں دیا تو خواہی نخواہی سارا بوجھ انسان ہی کو اُٹھانا پڑتا اور ہر صورت سے وہی ملزم ٹھیرتا ہی۔ تم ہی بتاؤ مسلمانوں کو بگڑا دیکھ کر مسلمانوں سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں۔ طالب العلمی کی وجہ سے سید صادق کے مزاج میں تو ایک طرح کی عزلت پسندی آگئی تھی اور حقیقت میں وہ ملاقات کا چور تھا۔ لوگوں کی جیسی عادت ہی طرح طرح کی اس کی توجیہات کرتے۔ کوئی کہتا مغرور ہیں، کوئی سمجھتا انگریزیت جیر گئی ہی ہندوستانیوں سے

نفرت رکھتے ہیں، کوئی خیال کرتا عقائد بگڑے ہوئے ہیں کیا منہ لے کر مسلمانوں میں بیٹھیں۔ لیکن چاہیئے کہ اس خیال سے اس کی ملاقات سے کنارہ کشی کریں کیا مذکور۔

دلّی میں کتنے لوگ ایسے بے کار پڑے پھرتے ہیں جن کو دنیا اور دین کا کوئی کام کرنے کو نہیں صبح ہوئی یہ خدا جانے کہاں رہے کوئی ڈیڑھ پہر رات جاتے جاتے بیوی کے ڈر سے گھر آئے چھینکے پر سے روٹی اُتار، مونڈھے تلے سے سالن کی پتیلی نکال، بچا کھچا کھا پی مُنہ لپیٹ پڑ رہے۔ سویرے آنکھ کھلے کیا خاک۔ غرض جیسے دیر کر سوئے تھے ویسے ہی دیر کر اُٹھے۔ مُنہ ہاتھ دھویا بالوں میں کنگھی کی۔ تیل ڈالا۔ سرمہ لگایا۔ پان کھا چھڑی رومال ہاتھ میں لے چلتے ہوئے۔ کسی کام سے نہیں، کسی خاص شخص کی ملاقات کو نہیں، جس کسی جان پہچان کے گھر جی چاہا جا موجود ہوئے۔ بلکہ جان پہچان کی بھی کیا ضرورت ہے۔ یہ معلوم ہونا کافی ہے کہ مردانی بیٹھک ہے تقریب ملاقات کو اتنا بس کرتا ہے کہ بندہ بہت دنوں سے آپ کی ثنا و صفت سن سن کر مشتاق ملاقات تھا مگر کل امروز ہوں بادقاقہ یہ مسرت تو آج حاصل ہونی لکھی تھی ہر چند ارادہ کیا نہ بن پڑا اس وقت اتفاق سے ادھر گزر ہوا تو طبیعت بے اختیار ہو گئی۔ اسم شریف؟

صاحب خانہ۔ کمترین کا اصل نام تو میر خورم علی خاں ہے۔ بچپن میں پیار سے چھٹّن صاحب کہتے تھے اور جہاں بیٹھا ہوں یہ میری سسرال ہے اور جب سے یہ تعلق ہوا ہے یہیں رہنے کا اتفاق ہوتا ہے یہاں لوگ مجھ کو شاہنشاہ دولھا پکارتے ہیں اور چونکہ اپنی بولی میں کچھ تگ تگ کے تُک بھی ملا لیتا ہوں میرزا دولھا کے نام سے مشہور ہوں۔"

نئے ملاقاتی (جن کا نام خواجہ سلطان تھا) "ماشاء اللہ جیسا سنتے تھے اُس کا ہزار چند پایا۔ ہائے ہائے زمانہ ہی قدر ہنر کا نہیں ورنہ آپ جیسے باکمال آدمی کے دروازے پر تو ہاتھی جھومتے ہوتے۔ کیوں حضرت وجہ معشیت تو یہی کرایہ وغیرہ سے ہو گی۔ آخر کتنے ایک کی آمدنی ہے؟"

شاہنشاہ دولھا میر خورم علی خاں موزوں۔ "اے جناب کیا آمدنی ہے۔ یوں تو نئی سڑک کے نکڑ سے لے کر چھوٹے دریبے تک کی لین کی لین یہ سب اپنی ہی جائداد تھی او متفرقات علاوہ لیکن طبیعت واقع ہوئی تھی لااُبالی، روپئے کو کبھی روپیہ سمجھا نہیں، وہ جائداد تو ہاتھ سے نکل گئی۔ اب گھر کے لوگوں کے نام چند دکانیں قاضی کے حوض پر رہیں اور سبزی منڈی میں چار ہزاری آپ نے سُنا ہو ایک باغ ہے، بس یہ کل کائنات ہے۔ کچھ خدا کی برکت سے گزر ہوئے چلا جاتا ہے۔ بزرگوں کے وقت سے مہاجن لگا ہوا ہے، جو ضرورت ہوئی کہلا بھیجا۔ آدمی ہے بھلا مانس کسی بات میں آج تک تو عذر کیا نہیں ورنہ میں تو اس ریوڑی کے چکر میں آکر سٹری ہو گیا ہوتا۔"

خواجہ سلطان۔ "نصیب اعدا۔ آپ کی تقدیر میں جو پلاؤ کی رکابی لکھی ہے سو ملے ہی گی قسمت پر شاکر رہیئے اور آخر آج تک ایک شان سے گزری ہے۔ ان شاء اللہ اسی طرح گزرے جائے گی۔"

موزوں۔ "جی ہاں میں تو فکر کو پاس نہیں آنے دیتا۔ دوست آشناؤں میں ہنس بول کر اپنا وقت گزار دیتا ہوں۔ مجھ کو خبر نہیں ہوتی کہ کس وقت صبح ہوئی اور کب شام ہوئی۔"

خواجہ سلطان۔ "بس کیا عرض کروں بجنسہ میری بھی یہی خصلت ہے سر مو تفاوت نہیں۔ گویا ہم دونوں کے مزاج ایک سانچے میں ڈھلے ہیں اور تعجب ہے کہ ہم دونوں میں آج تک معرفت کیوں نہیں ہوئی۔"

موزوں۔ "آپ صورت آشنا تو ہیں۔ بارہا چلتے پھرتے آپ کو دیکھا ہے طبیعت تو میری بھی آپ سے اُنس کرتی تھی۔ مگر وہی آپ کا فرمانا کل امر مرھون باوقاتہ۔ حضرت کا نام نامی؟"

خواجہ سلطان۔ "فقیر کو خواجہ سلطان کہتے ہیں۔ اور آپ کی پشت پر جو یہ کم بخت ہیجڑوں کی گلی کہلاتی ہے، اسی میں غریب خانہ ہے۔ میں تو پہلے میر عاشق کے کوچے میں رہتا تھا۔ مالک مکان کم بخت ایسا بے مروت کہ صرف سوا یا ڈیڑھ سال کا کرایہ اتفاق سے چڑھ گیا تھا، لگا سخت تقاضا کرنے مجھ کو ہوا ناگوار بھری برسات میں مکان چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ وقت پر اور کوئی مکان اپنے ڈھب کا ملا نہیں، آخر اسی مکان میں

آرہا- خانہ داری خدا کے فضل سے ذرا زیادہ ہی- مکان ہونا چاہیئے گنجایش کا اور آسایش تو اس میں خاصی ہی ؟“

موزوں”- آپ نے کچھ خیال ہی نہ کیا ہوگا- ورنہ چاہتے تو بہتیرے مکان اپنی ذات کے کرایئے ہوتے ؟“

خواجہ”- جناب بزرگ تو کچھ ایسے قناعت والے لوگ تھے کہ جو ملا کھا لیا جو میسر آیا پہن لیا- انھوں نے دُنیا میں بہت پاؤں پھیلانے چاہے ہی نہیں- رہا یہ عاجز تو والد مرحوم نے اپنے اوپر تکلیف سہی مگر میری آنکھ پر کسی طرح کا میل نہیں آنے دیا- اور میں نے اُن کی بدولت وہ عیش کیئے کہ جب کبھی یاد آجاتے ہیں رونئیں رونئیں سے دعا نکلتی ہی- اور اب بھی اُن ہی کی بدولت عیش نہیں تو خیر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہی تکلیف بھی نہیں- ہم دو ہی بھائی بہن تھے ہمشیر کو انھوں نے ایسی اچھی جگہ دیکھ کر دیا کہ ان کی سسرال سے بہت کچھ مدد ملتی ہی اور اِدھر میرے ایک برادر نسبتی رجواڑے میں نوکر ہیں، وہ اپنی بہن کی خبر لیتے رہتے ہیں اور نہ کیوں لیں اپنے اسی داتے بیئے ہوتے ہیں، قیامت میں تو کوئی کسی کو بخشوانے ہی کا نہیں- غرض آپ کی دعا سے مجھ کو تو کسی طرح کا تردد کرنا پڑتا نہیں- دونو وقت گھر میں گئے اور کھانا کھا لیا- خانہ داری کے جھگڑوں سے میری طبیعت اُلجھتی ہی اور میں نے گھر میں کہہ رکھا ہی کچھ بھی کرو میں جس وقت آؤں کھانا طیار پاؤں- سو وہ نیک بخت اس کا اہتمام رکھتی ہی جب تک والدہ زندہ رہیں وہ میری ضرورتوں کی خبر لیتی رہیں- اب اُن کی جگہ یہ عورت ہی بندۂ درگاہ نے نہ کبھی ہاتھ پاؤں ہلایا اور نہ جیتے جی ہلائیں ؟“

موزوں”- بس تو ہماری آپ کی صحبت خوب نبھے گی ۔

قیس جنگل میں اکیلا ہی مجھے جانے دو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو“

اِس کے بعد دونوں میں اور بہت سے سوال و جواب ہوئے اور پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے سے اتنے کھلے کہ سارا اگلا پچھلا حال انھوں نے اُن کا اور اُنھوں نے اِن کا کھود کھود کر دریافت کر لیا- بس ایک عورتوں کے نام پوچھنے کی نوبت تو نہیں آئی اور وہ بھی شاید اس سبب سے کہ موزوں کے گھر سے کھانے کے لیئے

بُلا دے پر بُلاوا چلا آتا تھا جب روزانہ دو دو وقتہ ملاقات کی قسما قسمی ہو کر دن کے ایک بجتے بجتے بمجبوری خواجہ سلطان رخصت ہوئے۔ گھر گئے اور وہی ٹھنڈی روٹی جما ہوا سالن جو اُن کی تقدیر کا تھا کھا، توے کا حقہ پی، پھر جو سوئے تو دو گھڑی دن رہے کی خبر لی جاگے اور پڑے پڑے سر اٹھا کر چُندھی چُندھی آنکھوں سے دھوپ کو دیکھا تو گھبرا کر اُٹھے اور یہ اُن کے نصیبوں کی دوسری صبح ہوئی اُٹھتے کے ساتھ پہلے گھر کی ماما پر خفا ہوئے کہ "صبح کا نکلا نکلا دوپہر پیچھے گھر آیا، تم کیا جانو کس کام میں تھا ذرا کی ذرا لیٹا، بندہ بشر ہی آنکھ لگ گئی تو تم سے اتنا نہ ہو سکا کہ جگا دیتیں مگر تم کو تو سوائے کھانا پکانے کے اور کسی کام کو ہاتھ لگانے کی قسم ہے، آواز دینے میں بھی کچھ زبان تھکی جاتی تھی۔"

ماما تو میاں کے پیچھے جھاڑو ہو کر چمٹتی مگر بی بی لقمہ توڑ بول پڑیں کہ "خیر ہے۔ خواہی نخواہی خدا واسطے ماما کے سر کیوں ہوئے؟ بچوں نے اتنی اودھم مچائی تو تمہارے فرشتوں کو خبر تک نہ ہوئی۔ ماما کیا تمہارے کان میں جا کر ڈھول بجاتی؟"

میاں۔ "پھر تم نے میری بات میں دخل دیا؟"

بی بی۔ "ہاں ہاں دیا اور سو دفعہ دیں گے۔ ہزار دفعہ دیں گے۔ تم ہمارے آدمی سب بولنے والے کون ہوتے ہو؟ منہ لگائی ڈومنی گائے آل تپال۔ ماماؤں کو نکالنا ہی جانتے ہو یا کبھی اتنی عمر میں کوئی ماما بلوا کر بھی دی ہے؟ ماما نہیں ہوتی تو مصیبت تو ہمارے دم پر پڑتی ہے، تمہارا کیا ہے آئے اور پکی پکائی نگلنے کو بیٹھ گئے۔"

میاں۔ "میں نے نکالنے کو تو نہیں کہا۔ ماما تم ہی خدا لگتی بات کہنا۔ ہاں اب کیوں بولو گی۔ مگر یہ بی بی شہ دے دے کر تم کو کسی اور کے کام کا تو رکھنے کی نہیں۔"

بی بی۔ "چلو جب تمہارے گھر والے نوکری کرنے جائے گی تو تم نہ رکھنا اور نہ تم یوں بھی کیوں رکھنے لگے تھے تم اللہ رکھے رکھو گے غلام، رکھو گے باندیاں۔"

میاں۔ "تم کچھ اپنے بھائی کے برتے پر اتراتی ہو گی تو میں کسی کا دیل نہیں بستا۔ وہ کچھ دیتے ہوں گے تو

تم کو دیتے ہوں گے۔ مجھ کو تو خدا نے تمھارے یا اُن کے نمک کا بھی شرمندہ نہیں کیا اور نہ کرے گا۔ خدا میرے دولھا بھائی کو سلامت رکھے جن کی بدولت میں چاہوں تو تم جیسی چار اور کر لاؤں۔"

بی بی"۔ نگوڑے بے غیرت! بہنوئی کے کھونٹے پر کودتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

وہ تو ماما ہی بی بی کو ٹال کر کوٹھے پر گئی نہیں تو خوجم صاحب کے پٹھے بی بی کے ہاتھ میں ہوتے اور بی بی کی چُٹیا خوجم صاحب کے ہاتھ میں۔ مگر ہی یہ کہ خوجم صاحب تھے بھی دل کے بہت ہی صاف۔ ان کا غصّہ پانی کی سی ایک لہر ہوتی تھی، ادھر آئی اُدھر اُتری۔ بی بی کوٹھے تک پہنچی بھی نہ ہوں گی کہ اُنھوں نے مُنہ ہاتھ دھویا، کنگھی کی، شام کی سیر کے کپڑے بدلے، پٹاری کھول پان بنایا اور بن ٹھن کر باہر کو چلے۔ چلتے چلتے پکار کر کہتے گئے "شام کو ٹکے کے کباب اور ایک آنے کی ملائی منگا رکھنا، دیکھنا بھولنا مت۔" اور دن تو نئے بانس سے کر قاضی کے حوض ہوتے ہوئے چاوڑی اور وہاں سے بڑے دریبے کے تین تو ضرور اور کبھی چار پھیرے بھی ہو جاتے تھے۔ آج جو کسی قدر دیر ہو گئی تھی تو دو ہی پھیروں میں جھٹپٹا ہو گیا اور بازار کے چلنے والوں کو کوٹھوں پر کا آدمی اچھی طرح دکھائی نہیں دیتا تھا۔ خوجم صاحب کو خیال تو آیا کہ میر موزوں سے وعدہ کیا ہے چلیں اُن ہی کے سر ہوں مگر گنجفے شطرنج کے پُرانے ٹھکانے بندھے ہوئے تھے۔ اِن کا معمول ناغہ کرنے سے اپنی بھی ایک طرح کی ہیٹی ہوتی تھی کہ کل برابر ماتیں کھائیں، سفو پیر زادی چڑھوانی، آج بھاگ کھڑے ہوئے۔ ناچار اپنے قدیم اکھاڑے پر جا موجود ہوئے۔ خوجم صاحب کا بیٹھ پیچھا ہی یہ بے چاہے اپنی طرف سے بہتیری ہی جلدی کرتے تھے۔ مگر بازی پر تو کسی کا بس نہیں چلتا، اڑی تو اڑی۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جو ہار اوہ پیچھا نہیں چھوڑتا کہ ایک بازی اور لے جاؤں تو جانوں۔ بھتنے کی چڈھی تو نہیں ہے کہ بنی آئی تو اب نہیں کھیلتے۔ غرض ہر چند قصد کرتے تھے بارہ بجے سے اِدھر کبھی چھٹکارا ہوا ہی نہیں۔ اور بی بی کے ساتھ اور بگاڑ ہی کا ہے کا تھا۔ مرد ہو کر نکھٹو، اور اس پر گھر کے رہنے سہنے کا یہ حال کہ مسافر بھی بھٹیاری کی سرائے میں شام سے آپڑتا ہے۔

اور سویرے لوٹے تو آدھی بجے اور نہیں تو ایک بجے دو بجے۔ لیکن ہم کو تو موقع نہیں ورنہ اُس نیک بخت کو ضرور سمجھا دیتے کہ کیوں اس غم میں گھُلی جاتی ہو۔ یہ شخص گھر ہی پڑا پڑا کیا کرے گا۔ سینے کا نہیں، پرونے کا یہ نہیں۔ ہاں دن بھر اس کو گُڑگُڑانے کو حُقّہ اور چبانے کو پان چاہیئے۔ تو تم جاننا پان تماکو ہی کا خرچ بچا۔ اور ہر وقت کے پاس رہنے سے دو برتن ہوتے ہیں تو وہ بھی کبھی نہ کبھی کھڑکھڑا ہی اُٹھتے ہیں۔ ایسے آدمی سے تو جتنی دیر الگ ہو اتنی دیر کوفت سے بچو۔ آنکھوں دیکھتے تو صبر نہیں ہو سکتا کہ ایک آدمی ہٹا کٹا، لنگڑا نہیں، لولا نہیں، اپاہج معذور نہیں، اندھا نہیں، بہرا نہیں، اور کمانے کے نام موئی ہتّی کا لا مُنہ نیلے ہاتھ پاؤں۔

خواجہ سلطان کے طور کے احدی بندے شہر میں بہتیرے ہی بھرے پڑے تھے اور یہ لوگ اگرچہ اور سب باتوں میں تو احدی ہوتے ہیں مگر چل پھر کر اپنے ڈھب کے آدمی ڈھونڈھ نکالنے میں بڑے چالاک۔ سید صادق کو تازہ وارد سُن کر دھر پہنچے۔ لیکن سید صادق میں اور ان میں کوئی وجہ مناسبت تھی ہی نہیں، کسی کی دال نہ گلی اور پہلی ہی ملاقات میں اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے۔ ان کے جلسوں میں ذکر آئے تو ہر طرح کے رہتے ہی ہیں۔ سید صادق کے بارے میں ان لوگوں کی یہ رائے تھی کہ آدمی ہے تو قابل ملاقات مگر خدا جانے علی گڑھ کے نیچری نے کیا پڑھ کر کان میں پھونک دیا ہے کہ یار لوگوں کے ہتّے پر چڑھنے والا نہیں۔ میر خسرو بھی اس کا ظاہر حال دیکھ کر کہہ گئے ہیں، اب پچھتائیں گے۔ بھئی ذرا ایسا مردہ دل کہ کتنی ہی گدگدی کرو خبر نہیں۔ اس نے تو ملّانوں کو بھی مات کیا ہے۔ آدمی کی صحبت سے بچتا ہے۔ اس سے نوکری چاکری کیا خاک ہو سکے گی۔ سو ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتا ورنہ ہم تو دو تین ملاقاتوں میں اس کو اپنے طور کا کر لیتے۔ اس کی جھجک دور کرتے۔ اس کو علم مجلس سکھاتے کہ اس کے دروازے پر بھی ایک جمگھٹ رہتا۔ عجیب کور مغز آدمی ہے کسی چیز کا مذاق نہیں۔ گنجفہ، شطرنج، چوسر، پتنگ، بٹیر، مرغ، ستار، شعر و سخن، غرض تماشا لے۔ میاں ہم نے اس کو ہر طرح سے ٹٹولا اس عزیز کے کان پر جوں بھی تو نہ چلی۔ خدا جانے کس ملک کا جانگلو پکڑ لایا ہے۔ ہاں صورت شکل تو ایسی پائی ہے کہ ہزاروں میں ایک۔ جی چاہتا ہے کہ بیٹھے دیکھا کیجیے۔ مگر تمہارا اس قرآن کی جگہ ہے بس دیوالی کی مورت

جان نہیں منہ میں زبان نہیں۔

خیر ان بلاؤں سے تو خدا نے سید صادق کا پیچھا چھڑایا اور آج کیا چھڑایا اس کا پیچھا اُس دن سے چھوٹا ہوا تھا جب سے یہ علی گڑھ کالج میں داخل ہوا کھیل تو لڑکوں کو وہاں بھی کھلائے جاتے ہیں اور ایسی تاکید سے کہ جیسا پڑھنے کا اہتمام ویسا بلکہ اس سے بڑھکر کھیلنے کا۔ مگر کھیل کھیل میں فرق ہے۔ ایک تو ہمارے یہاں کے کھیل ہیں جن میں سے اکثر بے سود اور بے سود ہوں تو خیر الٹے مضر بداخلاقی کی تمہید۔ کاہلی کی تعلیم۔ اور بعض میں جو کچھ دماغی فائدے نکل سکتے ہیں مثلاً گنجفے میں حافظے کی ترقی، چوسر شطرنج میں غور اور خوض کی عادت، تو ان میں بڑی قباحت یہ ہے کہ دنیاوی معاملات میں اِن سے مطلق مدد نہیں ملتی۔ اگر کوئی شخص گنجفہ اچھا کھیلتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اُس کو پتّوں کی یادداشت اچھی ہے۔ لیکن بازیوں کے ورق یاد رکھنے سے کتابوں کے ورق تو کیا صفحہ بلکہ دو چار سطریں بھی یاد نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح بڑے سے بڑا استاد شطرنج کے نقشے میں خوب طبیعت لڑاتا ہے مگر ایک سیدھا سا مقدمہ اس کے سامنے بیان کرو تو سمجھ نہیں سکتا۔ تدبیر سوچے گا کیا اپنا سر۔ غرض ہندوستانیوں کے جتنے کھیل ہیں سب نکمّے، موجب تضیع وقت۔ اب مدرسے کے کھیلوں پر نظر کرو تو نری جسمانی ریاضت اور تفریح طبع کے علاوہ دماغی زحمت کا کچھ دخل نہیں ہے کیونکہ اوقات درس میں جتنی دیر پڑھنے میں مصروف رہے بس دماغی محنت ہٰتیری ہولی اب کھیل میں بھی شطرنج کی طرح سوچنا پڑے تو دماغ کہاں تک اِس فشار کو وفا کر سکتا ہے۔ اور اگر جسم سے بالکل کام نہ لیا جائے تو جس طرح گھوڑا تھان پہ بندھے بندھے ہڈے موترے نکال لاتا، بادی میں بھر جاتا، دانہ گھاس اچھی طرح ہضم نہیں کر سکتا، تھوڑی دور چلنے سے ہانپنے لگتا، کوس دو کوس دوڑنا چاہو تو دوڑ نہیں سکتا۔ یہی حال آدمی کا ہے کہ اگر وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے کام نہیں لیتا تو اگر اور کوئی بیماری اس کو نہ بھی ستائے یہ کیا تھوڑی بیماری ہے کہ وہ اپاہج ہو جاتا ہے۔ اسی آرام طلبی کے نتیجے میں کہ ہماری عمروں کے اوسط گھٹتے اور ہماری نسلیں کم زور ہوتی چلی جاتی ہیں خیر کالج کے

پٹھانوں اور لوگوں کے ساتھ تو ہم ہندوستانی گرٹیں کیا مقابلے کریں گے اپنے ہی ملک کے دیہاتی کبھی
شہر میں آ نکلتے ہیں تو اُن کو دیکھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے کہ آہی یہ بھی آدمی ہیں جن کی کاٹھیاں لوہے کی
اور ہاتھ پاؤں پتھر کے ہیں معلوم ہے کہ ساگ بھاجی اور جوار باجرے کی روٹی کے سوائے اور کچھ میسر نہیں آتا۔
مگر یہ آنکھوں دیکھی بات ہے ایک دیہاتی سوسوا سومن کی چوبلدی گاڑی ہانکے بیٹے چلا جارہا تھا۔
شہر کی بھیڑ دیکھ کر بیل بدکے، گاڑی کا ایک پہیہ نالی میں جاتا رہا بیلوں نے بہتیر از ور مارا پہیہ جگہ کھسکا
گاڑی بان نے اُتر کر کمر کا سہارا لگا بات کی بات میں گاڑی کو ایسا دھکا دیا کہ بیچ سڑک میں۔ نہ دیہاتیوں کا
پانی نہ شہریوں کا ما ر اللحم۔ نہ ان کا چبینا اور نہ ہمارے بادام پستے۔ بے شک شہر اور دیہات کی آب ہوا میں
بھی بہت بڑا فرق ہے۔ مگر دیہاتیوں کی توانائی اور اُن کا ٹانٹا پن ہے محنت کی وجہ سے۔ شہر کی ایک تو
کثرت آبادی کی وجہ سے آب ہوا خراب اس پر محنت و مشقت ندارد جس کو دیکھو بدن پر بوٹی نہیں
اور بوٹی ہو تو کہاں سے ہو مارے چارے کو کبھی کھل کر بھوک نہیں لگتی اور مارے ہوکے کچھ بے اشتہا کھا لیتا ہے
تو ہضم نہیں ہوتا۔ اور جو ہم میں پہلوان کہلاتے ہیں سینہ اُبھرا ہوا ہے قبضے چڑھے ہیں، دیکھنے کو
موٹے تازے، داؤ پیچ بھی خوب رواں۔ مگر اصلی بل بوتا تو اِن میں بھی نہیں۔

اِس پر ایک حکایت یاد آئی ہے کہ جن دنوں قلعہ آباد تھا تو سلاطین کو سوائے اوقات گزاری کے
اور کوئی کام نہ تھا۔ نکمے بیٹھے بیٹھے اِن کو ایسے ہی مشغلے سوجھتے تھے کہ ستار بجا رہے ہیں بٹیریں لڑا رہے ہیں
یا شطرنج کھیل رہے ہیں یا اس کی دُھن ہے کہ کوئی ایسی قسم کا کھانا پکوائیے کہ کوئی پہچان نہ سکے۔
چنانچہ ایک صاحب عالم کو پہلوانوں کی کشتی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ بہت سے پہلوانوں کے راتب بندھے تھے
اور اُنھوں نے ایسی ایسی جوڑیں طیار کی تھیں کہ رجواڑوں میں جا جا کر کشتیاں مارتے تھے۔ ایک
مصاحب کو یہ سوجھی کہ ان دنوں دو لایتی میوہ فروش آئے ہوئے ہیں، کسی ولایتی کو ایک پہلوان سے لڑوایا جائے۔
صاحب عالم اس ایجاد کو سن کر پھڑک گئے اور فرمایا بھائی واللہ تخت کی قسم ہے۔ کیا بات پیدا کی ہے!

معمولی کشتیاں دیکھتے دیکھتے جی اکتا گیا۔ ولایتی کی کشتی میں مزہ تو خوب آئے گا۔ دیکھیں وہ پیچ کا کیا توڑ کرتا ہے۔ داروغہ جی دینا ان کو ایک دوشالہ۔ اور بھائی تم ہی اس کشتی کا اہتمام بھی کرنا۔ اور میں حضور میں بھی عرض کروں گا۔ سرفراز فرمائیں گے۔"

مصاحب: "پیر و مرشد سرفراز فرمانا کیسا بہت محظوظ ہوں گے اور خانہ زاد نے جو کچھ عرض کیا ہے حرف بحرف اس کی تصدیق ہو جائے گی۔ سرکار کو تو معلوم ہے کہ جناب عالیہ کے آپ خاصہ کی خدمت غلام کی خالہ جان کو ہے۔ وہ کل ہی کہتی تھیں کہ جناب بیگم صاحب بیٹھی تاش کھیل رہی تھیں دیکھتے کیا ہیں کہ حضور والا تشریف لیئے چلے آ رہے ہیں۔ جناب عالیہ کے ساتھ تخلیہ ہوا تو خالہ جان نے اپنے کانوں حضور کو سرکار کا نام لے کر فرماتے سنا کہ ساری وائیں او رنگ زیب کی سی ہیں۔ سپاہیانہ مزاج واقع ہوا ہے اور شوق بھی ہیں تو اس قسم کے اگر موقع ملا تو یہ لڑکا انگریزوں سے ملک آبائی اگلوا کر رہے گا۔"

اتنا کہنا تھا کہ صاحب عالم نے بڑے دنگل کی طیاری کا حکم دیا اور مصاحبوں کی بن آئی نہیں معلوم ظالموں نے کیا تدبیر کی۔ ایک اکھڑ وحشی ولایتی کو کچھ دے کر شاہی پہلوان کے ساتھ لڑنے کو راضی کر لیا۔ ولایتی کو ہم نے بھی دیکھا تھا سچ تو یہ ہے کہ مارے دہشت کے نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ آدمی کاہے کو تھا ایک دیو تھا۔ بالوں کی لٹیں کندھوں تک لٹکی ہوئیں۔ میلے کثیف کپڑے۔ چار چار پانچ پانچ گز سے مست دنبے کی سی بو ایسی سخت کہ ناک نہ دی جائے۔ پیٹھ پر سینگ کا مشکیزہ۔ ادھر جو تو سے اور ادھر مشکیزے سے چپر چپر کی آواز چلی آئے۔ خونخوار آنکھیں۔ ڈراؤنی صورت۔ لوگ جو اس کو بہلا پھسلا کر لائے تھے اس کے گرداگرد ایسے معلوم ہوں جیسے بڑے آدمی کے آگے پیچھے اور یہاں اکھاڑے میں پہلوان پٹرے جھوم رہے تھے۔ کوئی ڈنڑ پیل رہا ہے، اور کوئی تین سوا تین من کی جوڑی کے رومالی ہاتھ اس خوب صورتی اور صفائی سے ہلا رہا ہے کہ سارے تماشائیوں کی ٹکٹکی اسی پر بندھی ہے، کوئی لیزم کی کثرت کر رہا ہے، کوئی بنیٹھی کے کرتب دکھا رہا ہے۔ اتنے میں غل ہوا کہ

وہ پٹھان آیا۔ جوں اُس کو لاکر اکھاڑے کے پاس کھڑا کیا اُس کا پھیلاؤ دیکھ کر پہلوانوں کا رنگ فق ہوا۔ اب کسی کی ہمت نہیں پڑتی کہ موت کے مُنہ میں جائے۔ اور ولایتی ہے کہ زمین میں آلتی پالتی مارے ہینگ کے مشکیزے کا گاؤ تکیہ بنائے نظر حیرت و تعجب سے سب کو بیٹھا دیکھ رہا ہے اور ان پہلوانوں کو سمجھتا ہے کہ نٹوں کا تماشا کر رہے ہیں۔ اکھاڑے کا اُستاد اگرچہ تھا تو عمر سے اُترا ہوا۔ مگر اُس کا بدن ایسا مرتب تھا اور اُس کو ایسے ایسے داؤ گھات یاد تھے کہ یکایک کوئی اِس سے لڑنے کی ہامی نہیں بھرتا تھا مگر وہ خوب جانتا تھا

ع فرہی چیزے دگر آماس چیزے دیگر ست ؛ اُس نے چپکے سے صاحب عالم کے پاس جاکر عرض کیا کہ آج تک آپ کے اکھاڑے نے کسی سے نیچا نہیں دیکھا اور اُستاد کی برکت سے ہمارے یہاں کے پٹھے بھی اپنے وقت کے رستم و اسفندیار ہیں، لیکن سرکار راجہ بن جاتو کو قسائی کے بُغدے سے بھڑاتے ہیں۔ ساری عمر ہم نے سرکار کا نمک کھایا، حکم کی تعمیل میں مجال عذر نہیں، پچھڑ ریں گے تو نہیں مگر اس کے ہاڑ تو ملاحظہ کیجیے کہ کلائی دونوں ہاتھوں میں سمانی مشکل ہے۔ سرکار کو جان ہی لینی منظور ہے تو بسم اللہ اِس کا دبوچا ہوا آدمی ٹھکانے کا بھی تو نہیں۔ کھانے کا اونٹ کی پکڑ کو اس کی پکڑ سے کیا نسبت۔

صاحب عالم سمجھے تو سہی مگر سارے میں غل مچوا چکے تھے کس طرح کُشتی کو ملتوی کر دیتے؟ بارے لوگوں نے ولایتی سے کہا کہ آغا ان لوگوں میں سے جس کے ساتھ تمہارا جی چاہے کُشتی لڑو۔

آغا۔ ہم سب کے ساتھ لڑے گا۔

اب تو پہلوانوں کے دم میں دم آیا کہ خیر ایک کی دار و دو۔ اُستاد اور شاگرد سارے کا سارا اکھاڑا اکیلے کو پیٹ پڑا۔ جو جو داؤ پیچ یاد تھے سب ہی نے کھیلائے۔ آغا ہیں کہ قطب از جا نجنبد، لوہے کی لاٹ کی طرح گڑے ہوئے کھڑے ہیں۔ ان لوگوں نے نادانی یہ کی کہ آغا سے گتھ گئے۔ اُس نے موقع پایا۔ ایک تو اس بغل میں دابا اور دوسرے کو دوسری بغل میں۔ اِس نے تو اپنے نزدیک آہستہ ہی سے دبایا تھا مگر اُن میں کا ایک آج تک کوب سینے پھرتا ہے اور دوسرا مدتوں خون تھوکتا رہا۔ اب اچھا تو ہو گیا ہے مگر جاڑے کے دنوں میں

مارے پسلیوں کے درد کے بیچارے سے سانس نہیں لیا جاتا۔

خیر بنی آدم ہیں یہ ولایتی پٹھان تو اور ہی نسل کے ہیں اور اُن کی سی بات حاصل کرنی تو مشکل بلکہ محال ہی مگر اس کی عقلی دلائل موجود ہیں کہ اگر ہم اپنے طرز تمدن میں صفائی کے قاعدوں کی پوری پوری رعایت کریں اور جسمانی ریاضت کی عادت ڈالیں تو آئندہ کی نسلیں بہت بہتر ہو سکتی ہیں آ یہ سچ ہی کہ ہم لوگ گرم ملک کے رہنے والے ٹھیرے۔ ہم کو خدا نے محنت کے لئے پیدا نہیں کیا اور نہ ہم سے محنت کا تحمل ہو سکتا ہی۔ لیکن اگر شاقہ محنت نہ ہو تو جس قدر برداشت کی جا سکتی ہی وہ بھی سو دوا کی ایک دوا ہی اور پھر نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری۔ اور علی گڑھ کالج میں جو لڑکوں سے محنت لی جاتی ہی تو خدانخواستہ کچھ پتھر تھوڑا ہی ڈھلوائے جاتے یا لکڑیاں تھوڑا ہی چروائی جاتی ہیں۔ یہی کود پھاند دوڑ دھوپ جس میں اُن کے اعضا چست و چالاک رہیں۔ جس کو عادت نہیں اُس کو شروع میں ذری سی محنت بھی ناگوار گزرتی ہی لیکن آہستہ آہستہ ایک حد اعتدال تک عادت ڈالی جائے تو آرام سے زیادہ اس میں راحت ملتی ہی جس کو یقین نہ ہو ہماری خاطر سے زیادہ نہیں ایک چلّہ اس صلاح پر عمل کر کے دیکھے کچھ فائدہ معلوم نہ ہو تبھی اُلاہنا دینا۔ لیکن لوگوں نے اِس کو کچھ ایسا عیب سمجھ رکھا ہی کہ جہاں تک ہو سکتا ہی کوئی ہل کر اپنے ہاتھ سے پانی نہیں پینا چاہتا۔ اور طالب العلموں کے حق میں تو ایسی سختی ہی کہ گویا پڑھنے اور لکھنے میں بیر ہی اور اتنا نہیں سمجھتے جس کے بدن میں توانائی نہیں اُس کے دماغ میں طاقت نہیں، دل میں قوت نہیں، عقل میں تیزی نہیں، ذہن میں رسائی نہیں کبھی دیکھا ہی روگی ماں باپ کی اولاد چونچال تن درست ہو؟ کہیں سُنا ہی مرجھائی ہوئی ٹہنی کے پتے ہرے بھرے شاداب؟

غرض سید صادق نے کھیل بھی کھیلے تھے مگر وہی کھیل جن سے مقصود تھی ریاضت اور تفریح اور وہ بھی قاعدے سے اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ، اُستادوں کے ساتھ، سرکاری عہدہ داروں کے ساتھ۔ اس کو نہ یہاں کے کھیل آتے تھے اور نہ وہ ایسے جلسوں کو پسند کر سکتا تھا۔ پس حقیقت میں نہ وہ ہندوستانی

سوسائٹی کے قابل تھا اور نہ ہندوستانی سوسائٹی اس کے لائق۔ اُس کی طبیعت ڈھونڈھتی تھی وہی کالج کی صحبتیں کہ پڑھنا ہی تو، اور باتیں ہیں تو، اور کھیل ہے تو، تمام وقت کسی نہ کسی شغل میں مصروف ہے اور شغل بھی مفید اور دلچسپ۔ تعلیم کی تعلیم اور تفریح کی تفریح۔ ہندوستانیوں میں اگر ایسے مذاق ہوتے تو یہ روز بد ہی کیوں پیش آتا۔ سید صادق کو معلوم تھا کہ طالب العلمی کے بعد ہندوستانی سوسائٹی کو اوڑھنا بچھونا بنانا پڑے گا اور اسی غرض سے اُس نے خانہ داری ہی کا تعلق پیدا کیا تھا۔ مگر یہ ایک تعلق سوسائٹی کا کام تو نہیں دے سکتا۔ بلکہ اس کے ہوتے سوسائٹی کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔ پس چار و ناچار اس کو لوگوں سے ملنا پڑتا تھا۔ آدمی کہاں تک کتاب دیکھے اور کب تک عورتوں کی طرح گھر کی چار دیواری میں بند رہے۔ دلّی جیسے شہر میں سید صادق کو معدودے چند اپنے ہم خیال بھی کیوں نہیں مل سکتے تھے آخر برسوں سے انگریزی تعلیم ہو رہی ہے اور یہ تو ممکن ہی نہیں کہ آدمی مشن سکول میں نہ سہی کہیں بھی انگریزی پڑھے اور اُس کے خیالات بالکل ویسے کے ویسے ہی رہیں جیسے فی زمانا عام مسلمانوں کے ہیں۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ بعض اپنے خیالات کو ظاہر نہیں کرتے یا ان کو ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اور بعض بھڑ بھڑیا ہوتے ہیں کہ جو اُن کے دل میں ہے وہی اُن کی زبان پر ہے۔ لیکن اتفاق سے سید صادق کو آنے کے ساتھ اُن ہی لوگوں سے سابقہ پڑا جن کو اس کے سے خیالات چھو بھی نہیں گئے تھے۔ یہ تو کیوں کر کہیں کہ سید صادق کو ہندوستانی سوسائٹی کا حال معلوم نہ تھا۔ وہ ہندوستانی سوسائٹی میں پیدا ہوا، ہندوستانی سوسائٹی میں اس نے پرورش پائی اور وہ بھی ہندوستانیوں میں کا ایک ہندوستانی تھا مگر اس نے ہوش سنبھالا علی گڑھ کالج میں۔ پس سوسائٹی کے متعلق اس کی معلومات بیشتر کتابی تھی کہ وہ اخباروں میں کتابوں میں ہندوستانیوں کے حالات پڑھتا رہتا تھا۔ اب جو لوگوں سے ملا جلا تو جانا کہ جو کچھ جانتا تھا اُس کو واقعات سے اتنی بھی تو نسبت نہیں جتنی چھٹانک کو سن سے۔ اِس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ مسلمانوں نے مذہب کا یہ حال کر رکھا ہے کہ اس میں اور دنیا میں اس طرح کا بیر ہے کہ دونوں جمع ہو ہی نہیں سکتے خصوصاً انگریزی

عمل داری ہیں۔ خدا نے تو بندوں کی مصلحت اس میں سمجھی کہ انگریزوں کو وقت کا بادشاہ کر کے دنیاوی عزت اور دنیاوی دولت کی کنجیاں ان کے حوالے کر دیں کہ جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ باوجودیکہ نصاریٰ اہل کتاب بھی ہیں ان کے ساتھ کھانا پینا، عیسائی مذہب کی عورتوں سے نکاح کرنا کہ دنیا میں میل جول اور دوستی ملاقات کے یہی طریقے ہیں، قرآن میں ان سب باتوں کی اجازت صاف صاف موجود ہے نصاریٰ کی مدح بھی ہے اور یہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ امن اور انصاف اور آسائش اور آزادی غرض ہر طرح کی راحت جیسی ان کی عمل داری میں ہے نہ کبھی ہوئی اور نہ اب کسی دوسری عمل داری میں ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے مسلمان ہیں کہ ان کے سائے سے بھاگتے ہیں۔ ان کی زبان سے نفرت، ان کے علوم سے نفرت، ان کی وضع سے نفرت، ان کی طرز و روش سے نفرت جس کا ضروری نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان روز بروز مفلس اور ذلیل ہوتے چلے جاتے ہیں جتنے ذریعے معاش کے دنیا میں ہیں اور ہو سکتے ہیں سبھی میں تو مسلمان دوسری قوموں سے ہیٹے ہیں۔ کیا نوکری کیا تجارت کیا زمینداری کیا دستکاری کیا کچھ کیا کچھ اور جو دو چار نے اس امر کو سمجھا ہے اور اب پچھتاتے اور اپنی دنیاوی حالت درست کرنی چاہتے ہیں اُن کو اپنے ہی بھائی بند چین نہیں لینے دیتے کہ دُنیا کے پیچھے دین کو چھوڑ بیٹھے۔ عاقبت خراب کی، ان کا پانی پینا روا نہیں، ان سے رشتہ ناطہ کرنا درست نہیں۔ اور جو لوگ اس طرح مُنہ بھر بھر کے دوسروں کو بُرا کہتے ہیں وہ اگر اپنے نفس کا احتساب کریں تو پائیں گے کہ ان ہی کے خیال کے مطابق دوسروں کی آنکھ میں ناخنہ ہے تو ان کی اپنی آنکھ میں ٹینٹ، دوسروں کو خارش ہے تو ان کو کوڑھ، دوسروں کو خفقان ہے تو ان کو جنون اور جنون بھی مطبق۔ مگر خدا نے دلوں پر مُہر لگا دی ہے۔ ان کو دوسروں کے عیب دیکھنے سے فرصت نہیں کہ اپنے عیوب پر نظر کریں۔ اپنی نجات سے ایسے مطمئن ہیں کہ عشرۂ مبشرہ کو بھی ایسا اطمینان نصیب نہ ہوا ہو گا کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود بشارت کے بھی وہ لوگ مرتے دم تک خدا کی بے نیازی سے ڈرتے ہی رہے اور ان کو شاید کبھی بھول کر بھی خیال نہیں آتا کہ ہم کو بھی خدا کے یہاں چل کر کچھ جواب دہی کرنی ہے۔ اصل میں تو

کبر یا حسد یا طمع دنیا یا حب جاہ یا اسی طرح کی کوئی اور خباثت باعث ہوتی ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حیلہ بنا رکھا ہے گویا تمام بندگان خدا کے اعمال کی باز پرس ان سے ہوتی ہے اور یہ خود مرفوع القلم ہیں۔ نفسی نفسی کی بستی سے نکل مارے شیخی کے اُمتی اُمتی کی معراج پر جا دھمکے اور یہ نہ سمجھے کہ یہاں سے پاؤں پھسلا تو پھر اسفل السافلین سے ورے کہیں آدمی کا ٹھکانا ہی نہیں۔ اور اگر خدا نے دل ہی ایسا دیا ہے کہ پیغمبری نہیں محتسبی کی خدمت نہیں مسلمان بھائی کی غلطی دیکھی نہیں جاتی تو خشونت کیوں اور دل آزاری کس لیئے۔ اور صاف صاف بات تو یہ ہے کہ جب اس کو پیشہ ٹھیرا لیں اور معاش کے لیئے اسی پر دھرنا دے کر بیٹھیں تو بدگمانی نہ ہوتی ہو تو ہو۔ دوسروں پر اثر ڈالنے کے لیئے ضرور ہی خلوص۔ اور شائبۂ غرض کے ہوتے اول تو خلوص ہو ہی کیوں اور ہو تو آدمی فرشتہ ہے، ورنہ نیکی برباد گناہ لازم۔ غرض مذہب بھی عجب تماشے کی چیز ہے۔ اس کی عینک آنکھوں سے لگا لو تو دوسروں کے تُس لٹھے اور شہتیر دکھائی دینے لگیں۔ اور اپنے پہاڑ اول تو دکھائی نہیں دیں گے اور دکھائی دیں گے بھی تو رائی یا خشخاش یا بہت غور سے دیکھو تو جیسے تل۔ کبر اور خود پسندی کو اگر درخت فرض کریں تو مذہب سے بہتر اس کے لیئے کوئی کھاد نہیں۔ ادھر ڈالا اور ادھر بھان متی کے درخت کی طرح پتے پھول پھل سب کچھ طیار موجود۔ مذہب ایجاد تو ہوا بدی کی بیخ کنی کے لیئے، افسوس ہے کہ اُس کو بدی کا پردہ دار بنایا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ پولیس چوروں کا تھانگی۔ مگر انسان کی سرشت ہی اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ وہ اپنی بدی سے نہیں چوکتا یہاں تک کہ مذہب میں بھی۔ مگر ایک دن آئے گا کہ اس کی ساری شرارتیں اس پر اور جن کو اپنے زعم میں دھوکا دے رہا ہے اُن پر ظاہر ہوں گی۔ یخدعون اللہ والذین اٰمنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون[1] آدمی بھی ایک طرح کا سربند لفافہ ہے اور خدا نے اس کو ایسی مضبوطی سے بند کیا ہے کہ دوسرے تو اس کے اندر کا حال کیا جان سکتے ہیں خود بھی اپنے دل کے

[1] اپنے نزدیک اللہ کو اور مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں اور نہیں دھوکا دیتے مگر اپنے تئیں اور اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

کو نے کھدر روں سے اچھی طرح واقف نہیں۔ مرے پیچھے یہ لفافہ کھولا جائے گا اور اُس وقت معلوم ہوگا کہ خط میں
کیا لکھا ہے۔ اب تو جس کا جی چاہے لفافے کو خوش نما بنا کر لوگوں کو گرویدہ کرے مگر یہ لفافہ ہی کے دن کا۔
کفن کے میلے ہوتے دیر بھی لگتی ہے اور یہ تو آج قبر میں رکھا اور تیسرے دن بھانڈا پھوٹا۔

بارھویں فصل

صادق اور مذہب

سید صادق کا خیال یہ تھا کہ جو لوگ دنیا میں پھنسے ہیں وہ تو خیر مگر جو دین کے پیشوا کہلاتے ہیں
اُن کے مذہبی خیالات ضرور اونچے اور عمدہ اور پاکیزہ ہوں گے۔ اور اس کا ارادہ بھی تھا کہ طالب العلمی کو
اُس کی حد تک پہنچا کر جب میں سوسائٹی میں آؤں گا تو ایسے ہی لوگوں سے صحبت رکھوں گا۔ اگرچہ ہم اُس کی
اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اُس نے طلب دین کو دنیا کے بعد رکھا کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
اس نے اپنے نزدیک دُنیا اور دین کو دو سمجھ رکھا تھا حالانکہ اسلام کا بڑا اصول یہ ہے کہ دین اور دُنیا میں
بو اور گل کی نسبت ہے۔ دین کوئی علیحدہ چیز نہیں۔ دنیا کو نیکی کے ساتھ برتنے کا نام دین ہے اور بس۔
لیکن وہ ایک نوجوان آدمی تھا اُس کی دینی معلومات بہت محدود تھی۔ ہم نے بھی بوڑھے ہو کر
اتنی بات سمجھی اور اگر اس کے کان میں کسی نے ڈالی ہوتی تو وہ بھی سمجھتا مگر ڈالنے والا ہی کون تھا؟
سو میں ننانوے آدمی تو اس خیال کے ہیں کہ دُنیا اور دین ایک دوسرے کی ضد میں جیسے آگ اور پانی۔
بہرکیف سید صادق کو ابھی مذہب سے ایک طور پر قطع نظر ہی سا تھا کہ دلّی کے لوگوں نے زبردستی
اس کے ساتھ مذہبی چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ وہ اس کے پاس آتے اسی غرض سے تھے۔ اس کو جو آداب
مجلس کالج میں سکھائے گئے تھے وہ یہ تھے کہ بے تقریبی سے ملومت اور ملاقات میں اس کا ضرور
لحاظ رکھو کہ جس سے ملنے جاؤ اُس کی فرصت کا وقت تاک کر جاؤ کہ اُس کا کسی طرح کا حرج نہ ہو،

اور ضرورت سے زیادہ اُس کے وقت کو مشغول نہ کرو، اور کسی کے ذاتی اور خانگی معاملات میں جیسے عقائد مذہبی وغیرہ
گو وہ تمہارا کیسا ہی دوست کیوں نہ ہو ہرگز بھول کر بھی دخل نہ دو۔ مگر جو لوگ اس سے ملنے کو آتے تھے وہ کسی
تقریب کے محتاج نہ تھے، جس وقت جی میں آیا بے تکلف آموجود ہوئے۔ کنڈی کھٹکھٹائی یا نام لے کر پکارا
اور پھر ڈٹے تو ایسے ڈٹے کہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتے اور پہلی ہی ملاقات میں ہارے سوالوں کے تُو تُو کر دیا۔
کوئی راز نہ تھا جس کی ہندی کی چندی نہیں پوچھی۔ یہ بہت ہی زچ ہوتا تھا اور باوجود ضبط کرنے کے
کسی کسی وقت ناخوشی بشرے سے بھی ظاہر ہو ہو جاتی تھی مگر ملنے والوں کی دور بلا۔ وہ اس کی کھسیانی
ہنسی کو مذاق میں اُڑا دیتے تھے۔ اور مصیبت یہ تھی کہ آپ ہی تو کھود کھود کر بد کر اس کی رائے دریافت کرتے
اور اگر ایک حرف بھی اُن کے خلاف اس کے مُنہ سے نکل جاتا تو کافر بناتے، مرتد ٹھیراتے، اور سارے شہر میں
اس کا ڈھونڈورا پیٹتے سو الگ۔ اور اُس وقت تک اس کی اپنی دینی معلومات بھی کچھ ایسی اعلیٰ درجے کی نہ تھی
اور اعلیٰ درجے کی ہو بھی کیسے سکتی تھی۔ اُس کی عمر ہی کیا تھی اور جو تھی اُس میں بہ ہمہ تن کالج کی پڑھائی میں
مصروف رہا اور ہمہ تن مصروف نہ رہتا تو جیسے جیسے امتحان اس نے پاس کیے اس کے اچھے سے بھی ہونے نہ پاتے۔ پس وہ
ایک عقلی مذہب رکھتا تھا جو بات اس سے پوچھی جاتی اپنی رائے سے کچھ نہ کچھ اُس کا جواب دے دیتا اور اسی کی پچ کر کے
اُسی پہ جما رہتا۔ اتنی غلطی تو اُس کی بھی تھی کہ اُس کو عقل پر زیادہ اعتماد تھا بایں ہمہ پاس ہو کر اُس کو
یہ تو سمجھنا چاہیئے تھا کہ دنیا ہی کی باتوں میں بڑے بڑے عقلمندوں کو دیکھتے ہیں ایک کہتا ہے ہست تو دوسرا
کہتا ہے نیست۔ اس سے بڑھ کر انگریزوں کی عقل و دانش کا کون معتقد ہوگا اور ہزار عقلمندوں کے عقلمند
پولیٹیکل گروہ جو سلطنت کا انتظام چلا رہے ہیں۔ سو ان کا تو حال یہ ہے کہ ایک کہتا ہے دن تو دوسرا کہتا ہے رات۔
ہاؤس آف کامنز یا پارلیمنٹ کا کونسا اجلاس ہے جس میں تو تو میں میں نہیں ہوتی۔ آج لبرل زور پکڑتے ہیں
تو کل کانسرویٹو بازی لے جاتے ہیں۔ یونینسٹ، پارنلائٹ، گلیڈسٹونین، ہم کو تو کم بختوں کے نام بھی
نہیں آتے، کتنے فرقے پیدا ہو پڑے ہیں کہ ایک کی ایک سے نہیں بنتی۔ یا مثلاً ڈاکٹر جو مسیحائی خدائی کا دعوے

کرتے ہیں بیماریوں کو تو اپنے بس میں کر ہی چکے اب موت کے پیچھے پڑے ہیں کہ کسی طرح اس کو اپنے قابو میں لائیں۔ بیماریوں کو بھی دیکھا وہی پھوٹ وہی خلاف۔ ایک کہتا ہے بعضی بیماریاں اُڑکر لگتی ہیں اُٹھوں نے زور دے دے کر قرنطینہ چلوایا۔ دوسرے معتقد ہیں کہ تعدیۂ امراض کوئی چیز نہیں صرف واہمہ ہی واہمہ ہے غرض ان عقلمندوں کے ہاتوں جان ایک مصیبت میں ہے کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں۔ تو جب دنیا کے معاملات میں جو اکثر مشاہدے پر مبنی ہیں عقل انسانی کا یہ حال ہو تو دین کی باتوں میں جو انسان کی آئندہ زندگی سے متعلق ہیں عقل انسانی اگر غلطی کرے یا سرے سے سمجھے ہی نہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ بس سید صادق میں یہ بڑی کسر تھی کہ وہ ہر جگہ عقل دوڑانی چاہتا تھا جو بات اس کی سمجھ میں نہ آتی اُس کو جھٹلانے لگتا۔ ایک طور پر اس کا کہنا بھی سچا تھا کہ انسان جو مکلّف ہوا تو اسی عقل کی وجہ سے ہوا اگر اس میں عقل نہ ہوتی تو یہ بھی اور جانوروں کی طرح کا ایک جانور تھا، عذاب ثواب دونوں سے بری۔ آدمی کے پیچھے جو عاقبت کا جھگڑا لگا تو اسی سے لگا کہ اس کو عقل دی گئی ہے۔ نیک و بد کی تمیز رکھتا ہے تو جس عقل کی وجہ سے اتنی ساری ذمہ داری گلے پڑی اسی کو دین میں معطل کرکے بٹھا دیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا نے تو بنایا آدمی اور ہم بنیں جانور۔ اُس نے تو دیں آنکھیں اور ہم باندھ لیں اوپر سے پٹی۔ دوسرے قرآن میں یہود اور نصاریٰ اور مشرکین اور دوسرے دوسرے غلط عقائد والوں کے ساتھ مناظرے ہیں مباحثے ہیں اور خدا جگہ جگہ ان لوگوں کو بل لا یشعرون افلا یعلمون افلا یعقلون کا الزام دیتا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دین کے لیے علم و عقل کو ہادی بنانا چاہیئے۔ اِدھر یہ لوگ جو اس سے مذہبی تکراریں کرنے آتے تھے وہ کہتے تھے دین کے آگے عقل کا نام ہی نہ لو۔ اگر نری عقل سے کام چلتا تو خدا کتابیں ہی کیوں اُتارتا، پیغمبر ہی کس لیے بھیجتا؟ شیطان سے بڑھ کر بھی کوئی عالم ہوگا کہ وہ سب فرشتوں کا اُستاد تھا خدا نے آدم کو پیدا کر کے کل فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ شیطان اپنے علم کے غرّے میں آکر لگا حجتیں کرنے انا خیر منہ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین[1]

---

[1] میں آدم سے بہتر ہوں آپ نے مجھ کو بنایا آگ سے اور اُس کو بنایا مٹی سے۔

علم وعقل کا انجام یہ ہوا کہ ہمیشہ ہمیشہ کو راندہ گیا۔ جب دونوں کے اصول اس قدر مختلف ہوں تو ان میں اتفاق ہو کیا خاک۔ نتیجہ یہ تھا کہ بات بات میں تکرار، بات بات میں حجت۔ اگرچہ صادق کی مت مسلمانوں کے متعارف فرقوں میں سے کسی فرقے سے ملتی ہی نہ تھی مگر اس کو اپنے سے زیادہ مسلمانوں کا باہمی اختلاف ناگوار تھا کہ ان میں جزئیات اور فروع اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے اختلاف کے سبب اس قدر پھوٹ تھی کہ ایک رسول کی امت ہونا کیسا اِن کا بس چلے تو ایک خدا کے بندے ہونا بھی ان کو منظور نہیں۔ ان ہی اختلافات کی بدولت ایک مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتے۔ آئے دن دیوانی اور فوجداری کے مقدمے دائر ہوتے رہتے ہیں آگے تو خیر نبدی ہوئی سو ہوئی لگے لگائے رشتے ناطے چھوٹتے چلے جاتے ہیں۔ تو کیوں کر کہیں کہ ان کا مذہب ایک ہی۔ اور اگر جدا جدا مذہب ہوتے تو اس سے بڑھ کر اور کیا کرتے جو اب کر رہے ہیں؟ سید صادق یہ حکایت بیان کرتے وقت یقین جان کر مانا رو دیا کہ ایک مسجد کا امام تھا غیر مقلد اور نمازی کھچڑی یعنی بعض مقلد بعض غیر مقلد۔ اِن دونوں فریقوں میں جہاں رفع یدین اور آمین بالجہر اور الصاق السوق اور سینے پر ہاتھ باندھنے کے اختلافات میں ایک مسئلہ مختلف فیہ یہ بھی ہی کہ غیر مقلد سجدے کے بعد جلسۂ استراحت کرکے دوسری رکعت میں کھڑا ہوتا ہی اور مقلد جلسۂ استراحت نہیں کرتا۔ مقلد مقتدیوں نے حجت نکال کھڑی کی کہ امام کی اطاعت فرض ہی نہ کرو تو نماز باطل۔ ہمارا امام جلسۂ استراحت میں ہوتا ہی کہ ہم کھڑے ہو جاتے ہیں تو اس امام کے پیچھے ہماری نماز کیسے ہو سکتی ہی۔ چاہا کہ امام کو معزول کریں۔ غیر مقلدوں نے کی اُس کی حمایت۔ مقدمہ لڑا اور لڑا نا ہی تھا۔ حاکم تھا انگریز۔ اُس نے فہم مقدمہ کی غرض سے نماز کی نقل کرائی اور جہر کی تعیین کے لیے زیر و بم کی سُروں میں آمین کہلوا کر سُنی۔ سید صادق کہتے تھے کہ بدقسمتی سے میں بھی گواہی میں پکڑا گیا تھا۔ مقدمہ ہو چکنے پر فریقین نے مٹھائیاں بانٹیں اور میں نے مارے رنج کے کھانا بھی نہیں کھایا۔ مجھ کو یاد تھی وہ بات کہ کسی بیہودہ تھیٹر والے نے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نقل کرنی چاہی۔ مسلمانوں کو علم ہوا تو اس سرے سے اُس سرے تک ایک غُل سا مچ گیا۔ ملکہ

کان تک خبر پہنچی اور سختی کے ساتھ ممانعت کر دی گئی۔ اللہ اللہ ملکہ کو عیسائی ہو کر اسلام کا اتنا پاس اور خود مسلمانوں کا یہ حال! کیا فرق ہو سکتا ہے پیغمبر صاحب کی نقل میں اور نماز کی نقل میں؟ وہ رسولِ خدا ہیں تو یہ فرضِ خدا ہے۔ مگر مسلمان ہی اپنے دین کی ہنسی اُڑوانا چاہیں تو اس کا کیا علاج۔

سید صادق مذہبی تکرار کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اور اس کو معلوم تھا کہ یہ تکرار با توں سے شروع ہو کر بہت جلد مکّوں اور لاتوں پر جا پہنچتی ہے اور خدا جانے کیا اسرار ہے کہ اور تکراریں تو رفع ہو بھی جائیں مگر مذہبی تکرار کبھی مٹتی سُنی ہی نہیں۔ اس کو کامل یقین تھا کہ مسلمانوں کے تنزل کے جہاں اور اسباب ہیں اُن میں سب سے بڑا سبب مذہبی اختلاف ہے کہ یہ اُن میں یکدلی اور اتفاق کے پیدا ہونے کا مانع ہے اور چاہے مسلمان دنیاوی علم و لیاقت ایجاد و صنعت دستکاری و حرفت استقلال و محنت تفتیش و تلاش کل صفتوں میں اہل یورپ سے بڑھ بھی جائیں مگر بدون اتفاق کے فلاح قومی ہونی نہیں۔ تو اس نے اپنے تئیں بڑی لغزش کی کہ آتشِ اختلاف مسلمانوں میں پہلے ہی سے سلگ رہی تھی میں نے آ کر اُس کو بھڑکا دیا۔ اُس نے ملاقات میں کمی کرنی چاہی مگر لوگ زبردستی اُس کو پیٹتے تھے اور کبھی وہ یہ بھی خیال کرتا تھا کہ گو اس وقت میں نے اختلاف کا ایک پہلو اختیار کر رکھا ہے مگر میرا اصل مطلب تو رفع اختلاف ہے اور اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تو مسلمانوں کے رستے میں سے ایک بڑا پہاڑ ٹل جائے گا اور وہ آسانی کے ساتھ ترقی کر سکیں گے۔ سید صادق تو بڑی سوچ سمجھ کا آدمی تھا اُس نے دلّی میں تعلق کرتے وقت اس بات کا خیال کیا تھا کہ وطن کیا چیز ہے اور مستقل سکونت کے لیے آدمی کو کسی خاص جگہ کا پابند ہونا مناسب بھی ہے یا نہیں۔ اور ہے تو میں کونسی جگہ کو اختیار کروں۔ آخر اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ تمدن سے مقصود اصلی ہے آسایش، اور وہ جیسی شہر میں میسر آ سکتی ہے دیہات میں ممکن نہیں۔ شہروں میں ہر قسم کا آدمی موجود، ہر طرح کی چیز مہیا، بے شک دیہات میں بھی خاص خاص فائدے ہیں جو شہریوں کو نصیب نہیں جیسے آب و ہوا کی عمدگی، دیہاتیوں کی سادہ اور بے تکلف زندگی، اُن کی شرافت۔ یعنی غور سے

دیکھا جائے تو انسانی فطرت کا رنگ اہل دیہات میں زیادہ جھلکتا ہے بہ نسبت اہل شہر کے۔ ہیں تو دیہاتی بھی آدم ہی کی اولاد مگر پھر بھی ان لوگوں میں اتنی خرابیاں نہیں ہیں جتنی شہریوں میں مگر ویسے ہی دیہات میں عقلی ترقی کے سامان نہیں۔ شہریوں کے ناشائستہ حالات روی خیالات دیکھ کر سید صادق کا دل دیہات کی طرف کو جھکتا تھا مگر طالب العلمی کا روگ ایسا اُس کے پیچھے لگا تھا کہ یہ شوق بے شہر کے پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ پس اُس نے قطعی فیصلہ کرلیا کہ رہوں گا تو شہر میں۔ یوں تو وہ خود بھی شہری تھا مگر اُس نے اپنی تجویز سے پیاہ کیا کہ مارے غیرت کے آپ ہی آپ بنارس رہنے کا بھی عہد کرلیا۔ بنارس چھوڑا تو اس کی نظر دلّی پر پڑی کہ یہ بھی بڑا اور بادشاہی شہر ہے۔ مدتوں دارالسلطنت رہا ہے۔ شاہ جہاں نے پہلے اس کا نقشہ جما لیا اس کے بعد لوگوں کو بسنے کا حکم دیا تو اس کی آبادی بہت ہی خوش قطع واقع ہوئی ہے۔ لال قلعہ اور جامع مسجد اور چوک یہ تین چیزیں تو اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اور یوں شہر سے لے کر قطب صاحب تک چھ سات کوس کے گردے میں ایسی ایسی عمارتوں کے بے شمار کھنڈر پڑے ہیں کہ دیکھ کر خدا یاد آتا ہے بڑے بڑے باکمال لوگ اس سرزمین میں ہو گزرے ہیں اور اگرچہ بہار کا موسم نکل گیا مگر ایسا بھی کیا ہے کہ ہوا میں ذراسی بھی مہک باقی نہ ہو۔ زبان جیسی یہاں کی مستند ہے کہیں کی ہو نہیں سکتی۔ لوگوں کی وضع بھی بھلے مانسوں کی سی ہے۔ منہ پر مقطع ڈاڑھیاں نیچے نیچے انگرکھے، تنگ موہری کے پاجامے ٹخنے کھلے ہوئے مسجدیں بکثرت اور سب آباد۔ دین کے اعتبار سے اگر دلّی کو ہندوستان کا مکہ مدینہ کہیں تو کچھ بے جا نہیں۔ لُٹی کھسی کئی دفعہ مگر رونق وہی کی وہی ۱۸۵۷ء کے غدر کا البتہ بڑا جھکولا پہنچا مگر یہی سری کا شہر تھا کہ قنوج اور بیجاپور کی طرح اُجڑا نہیں۔ خیر صوبہ پنجاب کا صدر مقام نہیں نہ سہی دلّی تو ہے۔ اس سے بہتر رہنے کے لیے اور کونسی جگہ ہوگی۔ اور ابھی میرے رہنے سہنے ہی کا کیا ٹھکانا ہے میں نے نام گنوانے کے لیے تو اتنی عمر ضائع نہیں کی۔ محنت سے پڑھا ہے، امتحان پاس کیے ہیں تو اسی دن کے لیے کہ بڑی سے بڑی نوکری کروں امیر ہو جاؤں، خوش حالی سے زندگی بسر کروں اور لوگوں کو دکھاؤں کہ عمدہ تعلیم پانے کے یہ نتیجے ہوتے ہیں تو

نوکری پیشہ کی جہاں نوکری وہیں اس کا وطن مگر پھر بھی آدمی کو چاہیئے کسی ایک جگہ کا ہو رہے چلے پھرے اپنے ٹھکانے آ لگے۔ اور دنیا بامید قائم آخر میں کبھی نہ کبھی پنشن لوں ہی گا تو اگر ساری عمر اٹھاؤ چولھا بنا پڑا پھرا اُس وقت بڑی دقت پیش آئے گی اور ابھی سے سامان جمع کر چلوں گا تو آسائش ملے گی غرض کوئی نہ کوئی مقام مستقل سکونت کے لیے متعین کرنا ضرور ہے کہ وہاں کے لوگوں کے ساتھ خصوصیت پیدا ہو اور وقت پر اُن سے ہمدردی اور مدد کی توقع کی جائے۔

ایسے ایسے خیالات سے سید صادق نے دہلی کی بود و باش جی میں ٹھیرائی تھی مگر وہاں کے مذہبی اختلافات دیکھ کر تو اس کو بڑی ہی وحشت ہوئی اور اس کی طبیعت دو چار دن کے لیے آ نکلنے میں بھی مضائقہ سا کرنے لگی۔ مگر دل برداشتگی کے ساتھ ایک بڑا فائدہ بھی ہوا کہ اس کو مذہب کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ اس کی سی عمر اس کی سی لیاقت کے آدمی کو یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ مذہبی اختلافات سے بالکل بے خبر تھا۔ علی گڑھ کالج جس میں اس نے پڑھا تھا کھولا تو گیا دنیاوی تعلیم کی غرض سے مگر مسلمانوں نے زبردستی مذہبی بدگمانیاں کر کے شروع سے اس کے ساتھ مخالفت کی اور جب تک مسلمانوں کی مذہبی بر چول کی عادت نہیں جاتی اور وہ کیا جائے گی علی گڑھ کالج کی نسبت بدگمانیاں ہوتی ہی رہیں گی۔ پس مجرد علی گڑھ کا طالب العلم ہونا دلالت کر رہا ہے کہ وہ اختلاف کے ہنگامے میں شریک تھا تو تماشائی ضرور تھا اور ویسے ہی تماشائیوں کی سی اس کی توجہ بھی تھی۔ اب جو ہر قسم کے لوگوں سے خود اس کو سوال و جواب کرنے پڑے تو اس نے دیکھا کہ مباحثے اور مناظرے کے لیے طیار نہیں۔ اس نے دینیات کی کتابیں دیکھنی شروع کیں مطلق اسلام کی طرف سے تو اُس کو اطمینان تھا کہ اس سے زیادہ سادہ اور سلیس اور آسان اور قریب الفہم اور فطرت انسانی کے ٹھیک مطابق کہ یہی سب باتیں مذہب کی حقانیت کی شناخت ہیں اور کوئی مذہب نہیں۔ اسلامی فرقوں کے باہمی اور اندرونی اختلافات میں اس کی عقل البتہ چکر میں تھی کہ یہ کیا آپس میں لڑے مرتے اور ایک دوسرے کو کافر اور مرتد بنانے ہیں۔ اس نے اپنی طرف سے بہتیرا چاہا کہ کوئی ایسا منصف مزاج آدمی ملے جو اپنی کہے

اور دوسرے کی سُنے اور بالمشافہہ گفتگو ہو ہوا کر حق معلوم کر لیا جائے لیکن کسی کو اس ڈھب کا نہ پایا - دو دو
باتیں بھی سیدھی طرح نہیں ہونے پاتیں کہ فریقین آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور اُن میں فوجداری ہوئے بغیر نہیں رہتی ؎

تو گوئی خروسان شاطر بجنگ　　در افتادہ باہم بمنقار و چنگ

پس کتاب بینی کے سوائے اور کیا چارہ تھا - مگر کتابیں بھی تو اکثر اِن ہی لوگوں کی لکھی ہوئی تھیں اور بعض تو
اِن میں اس قدر بے تہذیب کہ اگر کسی غیر مذہب والے کی نظر پڑ جائیں تو اسلام کے مقابلے میں اس کو
ایک حجت ہاتھ آئے - اور مذہب اسلام اس قدر عمدہ مذہب ہو کر جو نہیں پھیلتا اور دوسرے مذہب والے
اس کثرت سے اس کو اختیار نہیں کرتے جس کثرت کے ساتھ اُن کو اختیار کرنا چاہیئے کیا خبر ہے کہیں ایسی ہی
کتابوں نے اُن کو نہ بھڑکا دیا ہو - ایک پادری صاحب تو ہم سے کہتے تھے کہ مجھ کو دریافت کرنا منظور تھا کہ
اسلام میں کہاں کہاں پانی مرتا ہے - سُنی شیعوں کا اختلاف میں سُنا ہوا تھا میں نے دونوں کی ایک ایک کتاب
منگوا کر دیکھی - اسلام کی آدھی بُرائی شیعوں نے بتائی تو دوسری آدھی سُنیوں نے - تو صادق نے بھی یہی غلط راستہ
اختیار کیا اور بجائے اس کے کہ اطمینان ہو تسلی ہو ، اور شکوک بڑھتے گئے - کیونکہ ان لوگوں کے مناظرے کا معمولی
طرز یہ تھا کہ کسی نے اِن میں ایک عیب نکالا تو انھوں نے اُس میں ویسے ہی یا اس سے بھی سخت دو نکال کھڑے کیے
تو یہ وہی بات ہوئی کہ حامد نے محمود کو چھیڑا کہ تیری آنکھ میں ناخنہ ہے محمود کو لازم تھا کہ اپنی صاف اور بے عیب آنکھ
لوگوں کو دکھا کر حامد کو جھوٹا کرتا ، وہ لگا حامد کی آنکھ کا ٹینٹ دکھلانے - اس سے آنکھ والوں کی نظر میں محمود تو ویسا کا
ویسا ہی عیب دار رہا اور حامد بھی اس کے ساتھ ہی گیا مذہب میں اس طرح کی چھان بین ہی ٹھیک نہیں - اس سے
طبیعت تنگی ہو جاتی ہے - اور شک اور مذہب میں ہی بیر -

تیرھویں فصل
عقلی مذہب

صادق نے کتابیں تو دیکھنی شروع کیں اسلامی فرقوں کے اندرونی اور باہمی اختلافات کی وجہ سے

اور وہ جا پھنسا دوسرے مذاہب کے جھگڑوں میں۔ اور اب ہم نے اس کا یہ تماشا دیکھا کہ عقل کی بھول بھلیوں میں بھٹکا بھٹکا پھرتا تھا اور نکلنے کا راستہ نہیں سوجھ پڑتا تھا۔ اس پر ایک وقت ایسا بھی گزرا کہ وہ دوسرے کسی مذہب ہی کا معتقد نہ تھا اور دل میں کہتا تھا کہ شروع سے آدمی مذہب کے خیال کے پیچھے پڑے ہیں اگر مذہب حق فی الواقع میں کوئی چیز ہوتا تو اب تک انسان کی نظر سے مخفی نہ رہتا اور ساری دنیا میں کبھی کا ایک مذہب ہو گیا ہوتا۔ دنیا جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے مذہبوں کا شمار بڑھتا چلا جاتا ہے تو جس چیز کو اتنی مدت ڈھونڈا جائے اور ڈھونڈا بھی جائے تو ایسی کاوش سے کہ کوئی فرد بشر اس کی جستجو سے فارغ نہیں اور وہ نہ ملے تو اس کے یہی معنی ہیں کہ اس چیز کا وجود ہی نہیں دنیا میں ہزاروں مذہب ہیں اور ہر ایک مذہب والا اپنے ہی تئیں برسرِ حق سمجھتا ہے اور حال یہ ہے کہ نیک اور بد بھی جگہ ہیں۔ کیوں کر مان لیں کہ ایک شخص خدا سے ڈرتا اور غریبوں پر ترس کھاتا اور کسی کو ایذا نہیں دیتی چاہتا معاملے کا صاف دیانت دار امانت گزار مزاج میں شیخی نہیں غرور نہیں۔ وہ صرف اس سبب سے کہ خاص طور کے عقیدے نہیں رکھتا اور نہیں رکھتا تو اس وجہ سے کہ وہ سچے دل سے اُن کو ٹھیک نہیں سمجھتا کیوں کر مان لیں کہ ایسا شخص جہنمی ہو ابدالآباد کے لیے مستوجب عذاب الٰہی۔ اور خدا کو بھی کس نے دیکھا ہے۔ یہی نہ کہ دنیا میں کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی اور بنانے والے کون؟ ہم ہی آدمی، تو جو چیز ہم میں سے کسی نے نہیں بنائی جس نے بنائی وہی خدا۔ یہ دلیل ظاہر میں تو بڑی مضبوط معلوم ہوتی ہے لیکن اس کو منطق کی کسوٹی پر کس کر دیکھا جائے تو ٹھیک نہیں اترتی۔ کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی۔ اس کی جگہ ہم کو یوں کہنا چاہیئے کہ آدمی کے بنانے کی کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی۔ دو ہی لفظوں کی کمی بیشی میں بات کیا سے کیا ہو گئی۔ نہ دعویٰ رہا اور نہ دلیل۔ اور کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی اس میں تو خدا بھی آ گیا تو گویا ہم ایک ہی سانس میں خدا کو مانتے اور اس سے مکرتے بھی ہیں جو شخص کسی چیز کے آپ سے آپ ہو جانے پر اچنبھا کرتا ہے بڑا اچنبھا یہ ہے کہ وہ خدا کے ہونے پر اچنبھا کیوں نہیں کرتا۔ اور دنیا میں اگر مثلاً ایک بات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہے تو دو سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہیں ہے۔ ہم ہزاروں

لاکھوں آدمیوں کو مبتلائے مصیبت دیکھتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ مصیبت اُن کی کسی بدکرداری کا نتیجہ نہیں ہے، جیسے کور مادرزاد۔ یا ایک عام مصیبت موت ہی کی ہے جس پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کام خدا کے نہیں ہیں اور نہیں ہونے چاہئیں۔ اور فرض کرو کہ خدا ہے تو مجرد خدا کا ہونا چاہتا ہے کہ دین نہ ہو کیونکہ اگر خدا ہے اور اُس نے جیسا چاہا دنیا کو بنایا تو وہ دنیا کے خلاف کیوں چاہنے لگا اور اگر چاہے تو اُس کی ایسی مثال ہوگی کہ ایک شخص گھڑی بنائے اور بنا کر اُس میں ایک کیل ٹھوک دے کہ چل نہ سکے۔ ہم کو بے ہماری درخواست کے پیدا کیا اور چند در چند ضرورتیں اور خواہشیں ہمارے پیچھے لگا دیں، پھر ہم کو اُن سے روکنے اور باز رکھنے کے معنی کیا ہیں؟

یہ ہیں سید صادق کے چند خیالات جو اُس نے عقل کی راہ نمائی سے بہم پہنچائے تھے اور جن کو ہم نے نقل کفر کفر نباشد کے بھروسے پر مجبوری ڈرتے ڈرتے اور لرزتے لرزتے لکھ دیا ہے۔ خدا گناہوں کو معاف کرے اور ہمارا مقصد اس بات کا دکھانا ہے کہ عقل بھی کیسی پاجی چیز ہے کہ خدا ہی نے تو اس کو بنایا اور خدا ہی نے اس کو سمجھنے کی طاقت دی۔ اگر خدا کا فضل دستگیری نہ کرے تو یہ عقل آدمی کو اوندھے منہ دوزخ میں جا گرائے۔

اور پھر جو یکبارگی پلٹا کھایا تو سوچا کہ چاہیے خدا کے کرنے سے ہو اور چاہے آپ سے آپ ہو انسان کی ہستی ہی کیا ہے۔ بہت سے بہت جیا تو ساٹھ ستر برس۔ اور سینکڑوں ہزاروں میں شاذ و نادر کوئی ایک سینکڑا بھی گھسیٹ لے گیا تو کس طرح کہ بے لکڑی کے سہارے کے چار قدم چلا نہیں جاتا، پاؤں ڈالتا کہیں ہے اور پڑتا ہے کہیں، سر ہے کہ جھکتے جھکتے گھٹنوں میں آ لگا ہے، آنکھوں سے دھندلا دکھائی دیتا ہے، کانوں سے اونچا سنائی دیتا ہے، کچھ عجیب طرح کی بولی بولتا ہے کہ نہ اُردو ہے نہ فارسی نہ عربی، دنیا کی زبانوں میں کسی سے نہیں ملتی، اپنے منہ سے تو سیدھی بات نہیں نکلتی اور لوگ نہیں سمجھتے تو اُن پر جھنجلاتا ہے۔ بات ابھی کہی ہے اور ابھی ذہن سے اُتر گئی، ہوکا بڑھ گیا ہے، ہر چیز کو جی چاہتا ہے کہ کھاؤں، دانت نہیں چبائے کاہے سے، اور گھڑیوں پلپلا پلپلا کر کوئی چیز حلق سے اُتار بھی لی تو ہاضمہ نہیں۔ اب گھر والوں کا دم ناک میں ہے۔ پوتیاں پڑپوتیاں

ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور پکار پکار کر دعائیں مانگتی ہیں کہ بڈھا کہیں مر چکے تو پاپ ٹلے۔ اس پر پوت بہو بولی "نوج بوا تم اس طرح منہ بھر بھر کر بڑے میاں کو کیوں کوستی ہو؟ یہ مر جائیں گے تو قیامت کے بوریئے کون سمیٹے گا؟"

اتفاق سے نواسی آئی ہوئی تھی مہمان، آخر تو خون کا جوش ہوتا ہی، اس سے سہار نہ ہو سکی اور لگی کہنے "لو خدا سے ڈرو! یہ سب ان ہی کے دم قدم کا ظہور ہے اور یہ سارے اللے تللے ان ہی کی کمائی میں ہو رہے ہیں۔ باوا کو تو ایک پیسہ لانا بھی نصیب نہیں ہوا۔ تم لوگ جس ہنڈیا میں کھاؤ اسی میں چھید کرو۔ نانا ابا نے تو آپ اپنی مٹی خوار کر رکھی ہے۔ اماں خدا ان کو بہشت نصیب کرے اسی تمنا میں مر گئیں، میں نے سینکڑوں دفعہ ہاتھ جوڑے وہ اس گھر سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ورنہ میں تو ان کو اپنی آنکھوں پر بٹھاؤں اور اپنے ہاتھ سے ان کی ٹہل کروں لیکن ہم تو سدا کے بدقسمت ہیں، ہماری تقدیر ایسی کہاں تھی کہ بزرگوں کی خدمت کرتے۔"

پوت بہو "ہاں بوا سچ کہتی ہو۔ ہم تو ایسی ہی نمک حرام ہیں۔ ہماری طرح آٹھ پہر گھر میں رہو تو جانو کہ بڈھے نے سارے گھر کو سر پر اٹھا رکھا ہے۔ ان کو تو دن رات کی تمیز باقی نہیں۔ سوئے پڑے ہیں تو امن ہے۔ ادھر آنکھ کھلی اور پکارنا شروع کیا۔ کڑاکے کے جاڑے، آدھی رات اور جھاوٹ برس رہا ہے اور لونڈی کی طلب ہے۔ نہ جاؤ تو تمھارے بھائی جان لڑنے کو موجود۔ تم چاہو شوق سے لگا دینا ہم سے تو یہ بوڑھے نبچے نہیں پالے جاتے۔"

غرض بڑے میاں اپنے گھر میں ہیں تو اس قدر عزت کے ساتھ۔ جن کو عقل سکھائی اب وہ منہ در منہ کہتے ہیں کہ تم سترے بہترے ہو گئے ہو۔ جن پر حکمرانی کی اب بات بات میں ان سے دبنا پڑتا ہے۔ جن کی خدمتیں کیں اب وہ پانی پلاتے ہوئے بڑبڑاتے ہیں۔ اپنا پیسہ اور آپ ہی دست نگر۔ غرض زندگی ہے موت سے بدتر۔ اپنے پر عذاب دوسروں پر وبال۔ آہی کبھی ہو بھی چکے گی۔ اور فرض کیا کہ آدمی کی بڑی سے بڑی عمر بھی ہوئی اور اس کو بڑھاپے کی ایذائیں اور تکلیفیں بھی پیش نہ آئیں تو بھی ساری مزہ داریاں ایک طرف اور مرنا ایک طرف۔

دُنیا میں یہی تو سب سے زیادہ عجیب بات ہی کہ بھلی بھی گزر جاتی اور بُری بھی گزر جاتی یعنی انجام سب کا ایک ہی ہے

کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے　　خاک میں جب دم ملے دونوں برابر ہو گئے

پس حقیقت میں آدمی خواب سا دیکھ رہے ہیں، کوئی اچھا کوئی بُرا۔ آنکھ بند ہوئی جس کو کہنا چاہیئے کہ آنکھ کھلی تو کچھ بھی نہ تھا ے

وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

اس قسم کے خیالات ہجوم کرتے تو سید صادق کو دنیا کی طرف سے ایسی بے دلی پیدا ہوتی تھی کہ کہاں کا امتحان اور کیسی نوکری، کس کی بی بی اور کدھر کے تعلقات، سب کو چھوڑ۔ الغرض ان دنوں سید صادق اناڑی کی ترازو بنا ہوا تھا کبھی ادھر کا پلّہ جھک گیا کبھی اُدھر کا۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ عقل سے اُس کی بساط سے زیادہ کام لینا چاہتا تھا اور خدا کو اُسے یہ دکھانا منظور تھا کہ ہم نے تمھاری جتنی عقل سب کو دی (بہتیرے تم سے کم بہتیرے تم سے زیادہ) اور نہ مذہب کے لیئے اتنی عقل کی ضرورت۔ اور جتنی کی ضرورت ہی اُس سے ہم نے مرد اور عورت اور عالم اور جاہل اور شہری اور دیہاتی کسی کو محروم نہیں رکھا۔ اور یوں آپ اپنے اوپر کوئی چیز لازم کر لو تو تمھاری خوشی، پھر تم سے ویسی ہی باز پرس ہوگی۔ تمھارے دنیاوی امتحانوں میں بھی بعض چیزیں اختیاری ہوتی ہیں چاہے اِن میں امتحان دو اور چاہے نہ دو۔ لیکن اگر خود دینا چاہو گے تو نمبروں میں رعایت نہ ہوگی ورھبانیۃ ابتدعوھا[۵] ما کتبناھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا فاتینا الذین امنوا منھم اجرھم وکثیر منھم فاسقون

دین کا وہ درجہ جو ضروری ہی ایسا سہل رکھا گیا ہی کہ ہر ایک آدمی اُس کو بدون کسی زحمت کے پاس کرسکتا ہی۔ اس پر بھی لوگ فیل ہوتے ہیں۔ مذہب کا کچھ ایسا خواص ہی کہ جتنا اچھا نو دتنا ہی کرکرا، جوں جوں نتھارو توں توں گدلا۔ اور اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہی کہ دین ہی اور بڑھیوں کا اور مکتب کے

[۵] اور عیسائیوں نے ایک رہبانیت نکال کھڑی کی جو ہماری طرف سے اُن پر فرض نہ تھی۔ رہبانیت سے اُن کی غرض خدا کی رضا جوئی تھی اور بس تو اُن سے اس کا نباہ جیسا کہ چاہیئے تھا نہ ہو سکا پس جو ان میں ایمان لائے تھے اُن کو اجر ملے اور اکثر تو بدکار ہیں۔

بتدی بچوں کا یعنی بوڑھی عورتیں اور مکتب کے بتدی بچے دل کے بھولے اور طبیعت کے صاف ہوتے ہیں جس طرح کورا کپڑا رنگ کو خوب پکڑتا ہے بھولے دل و صاف طبیعتیں دین کی باتوں کو جلد قبول کرتی ہیں اور العلم حجاب اکبر[1] جو کہا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ بہت سیانپت بھی آدمی کو گمراہ کر دیتی ہے۔ غرض سید صادق پر دین کے اعتبار سے کچھ وقت اُسی طرح کا گزرا جیسے بنی اسرائیل چالیس برس جنگل میں بھٹکتے پڑے پھرے۔ بہتیری اٹکلیں دوڑاتے اور ہر روز صبح سے شام تک چلتے، آخر کار پھر کر وہیں آکھڑے ہوتے جہاں سے چلتے تھے۔ مگر تھا کیا۔ طلب بھی صحیح اور تلاش بھی سچی۔ اس سوچ میں اس کا یہ حال ہو گیا تھا جیسے کوئی مبہوت دیکھتا ہے اور نظر نہیں آتا، سنتا ہے اور سمجھتا نہیں۔ بہتیری کوشش کرتا کہ یہ خیال دل سے دور ہو مگر سوتے جاگتے ہمہ وقت یہی تصور پیش نظر تھا۔ کسی چیز میں طبیعت نہیں لگتی، کسی بات سے جی نہیں بہلتا۔ کتاب لے کر بیٹھتا ہے ہر چند طبیعت پر زور دیتا ہے مطلب معلوم نہیں ہوتا۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں اس کو خبر نہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے ستۂ ضروریہ میں خلل پڑنے لگا اور چند روز سے اس کو خوف رہا کہ کہیں ایسا نہ ہو مجھ کو جنون ہو جائے اور سارا پڑھا لکھا غارت ہو۔ نیند تو اس کی مدتوں سے اچٹی ہوئی سی تھی ہی ایک رات آخر شب اسی خیال میں پڑا کروٹیں بدل رہا تھا کہ اس نے بیقرار ہو کر دعا کی کہ اے خدا اگر واقع میں تو خدا ہے جیسا تمام اہل مذاہب تجھ کو مانتے ہیں تو مجھ کو اس ورطۂ حیرت سے نکال اور حق بات میرے دل میں ڈال۔ ابھی پورے لفظ بھی اس کے منہ سے نہیں نکلے تھے کہ برابر کے پلنگ سے صادقہ نے آواز دی "کیا تم جاگتے ہو؟"

صادق۔ "ہاں جاگتا ہوں۔ کیوں خیر ہے؟"

صادقہ۔ "میں نے ابھی ایک بڑا لمبا سا خواب دیکھا ہے جیسے تم کسی قیمتی کپڑے کی ایک نہایت سفید شیروانی پہنے ہو ایسی کہ میں نے آج تک ایسا سفید کپڑا دیکھا نہیں۔ جا بجا اس پر سیاہی گری ہوئی ہے اور تم داغوں کے چھڑانے کی فکر میں ہو اور تم کو ایک طرح کا رنج اور رنج کے ساتھ ناامیدی بھی ہے کہ ہائے کیسی عمدہ شیروانی تھی اب اس کے دھبے کیا چھوٹیں گے۔ تم نے بہتیرے جتن کیے اور جس نے جو تدبیر بتائی آزمائی، دھبے پھیلتے

---

[1] علم بجائے خود بڑا پردہ ہے۔

اور پہلے سے زیادہ بدنما ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ تم نے انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر چاہا کہ شیروانی کو اُتار پھینکوں۔ اتنے میں تو ایک بزرگ نے مجھ سے کہا کہ یہ دھبے مٹی سے چھوٹیں گے۔ مجھ کو اس کا طریقہ معلوم ہے میں تمہارے ہی ہاتھوں سے اس کو صاف کرا دوں گا اور شیروانی جیسی اصل میں تھی ویسی ہی نکل آئے گی گھبراؤ نہیں اس کے بعد تو سوتے ہی میں خود بخود خواب کی تعبیر میری سمجھ میں آئی کہ شیروانی تمہارا دل ہے اور سیاہی کے دھبے تمہارے مذہبی شکوک ہیں اور مٹی سے مراد ہے خاکساری۔ پھر کیا دیکھتی ہوں کہ جیسے تم میں اور ان بزرگ میں اُسی طرح کی مذہبی بحث ہونے لگی جیسی تم لوگوں سے کیا کرتے ہو۔ جوں جوں بحث ہوتی جاتی ہے شیروانی کے دھبے ہیں کہ مٹتے اور کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سب داغ دور ہو کر شیروانی اچھی خاصی اُجلی نکل آئی گویا اُس پر سیاہی گری ہی نہ تھی۔ اور تم اس کو پہن کر بہت ہی خوش ہوئے ہو اور کہتے ہو کہ بس اب میں اسی کو پہنے رہوں گا اور جو دیکھتا ہے شیروانی کی تعریف کرتا ہے کہ سبحان اللہ کیا کپڑا ہے اور دھوبی نے کیسا اچھا دھویا ہے۔ وہ بحث جو تم میں اور اُن بزرگ میں ہوئی مجھ کو لفظ بلفظ یاد ہے اور میرا قاعدہ ہے کہ جاگتے میں بھولوں نہیں مگر خواب کی بات مجھ کو بھولا نہیں کرتی۔ وہ بحث اتنی لمبی ہے کہ اسے بیان کرنے بیٹھوں تو کئی دن میں ختم ہو مگر خواب میں تو یہ ماجرا جہاں تک میں خیال کرتی ہوں شروع سے آخر تک آدھ گھنٹے میں طے ہو ہوا گیا تھا!

صادق تو مذہب کے معاملے میں بے چین تھا ہی سُنتے کے ساتھ اُٹھ بیٹھا اور چاہا کہ اسی وقت سے اپنا زہر اُگل چلے۔ اس پر صادقہ بولی کہ صبح صادق ہو چکی ہے میں نماز پڑھ لوں تم بھی ضرورتوں سے فارغ ہو لو پھر طمینان سے باتیں کریں گے۔ اور یہ جھگڑے ایک دن کے تو نہیں ہیں جتنی باتیں میں نے خواب میں دیکھی ہیں کئی ہفتوں میں جا کر طے ہوں تو ہوں۔

صادقہ نے اپنی معمولی نماز پڑھی، قرآن کی تلاوت کی اور خانہ داری کے متعلق جو کچھ کہنا سننا تھا کہا سُنا۔ اور سید صادق ہیں کہ پہلے سے آ کر تیار بیٹھے ہیں۔ بارے جب صادقہ سب باتوں سے فراغت پا چکی تو صادق سے مخاطب ہو کر بولی کہ خدا کے ہزاروں لاکھوں بھید ہیں جن میں آدمی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی

اُن میں سے ایک بھید خواب ہے اور خاص کر میرا خواب کہ میں بچپن سے خواب دیکھتی ہوں جیسا کہ سب دیکھتے ہیں۔ میرے خوابوں میں تین باتیں بڑے اچنبھے کی ہیں۔ ایک تو میں نے آج تک جھوٹا خواب نہیں دیکھا، آگے کی خبر نہیں۔ دوسرے جو خواب دیکھا اکثر تو خواب ہی میں اُس کی تعبیر بھی دکھائی دے گئی اور خواب میں نہ دکھائی دی تو جاگتے ہی سمجھ میں آ گئی اور وہ اب تک غلط نہیں نکلی، آگے کی خبر نہیں۔ غرض مجھ کو اب تک کسی سے تعبیر پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی، آگے کی خبر نہیں۔ تیسرے یوں سینکڑوں باتیں دیکھتی ہوں سنتی ہوں اور بھول بھی جاتی ہوں مگر خواب کی ایک بات بھی آج تک مجھ کو نہیں بھولی، آگے کی خبر نہیں۔ نہ صرف میں اپنے خوابوں کے معاملے میں حیران ہوں بلکہ جو سنتا ہے حیران ہوتا ہے۔ بعض خیال کرتے ہیں کہ اس کے سر پر کچھ ہے حالانکہ خوابوں کے سوائے میں کوئی بات اپنے میں نہیں پاتی۔ اور تم نے بھی کوئی بات نہیں پائی ہوگی اور ان شاء اللہ پاؤ گے بھی نہیں۔ میں نے ہر چند چاہا کہ مجھے خواب دکھائی دیا کریں بلکہ دعا بھی کی مگر خدا جانے کیا مصلحت ہے کہ خواب آئے بدون نہیں رہتے۔ بعض ان خوابوں کی وجہ سے مجھ کو بڑی مقدس سمجھتے ہیں اور جہاں تک میں خیال کرتی ہوں میں ایک معمولی طور کی عورت ہوں۔ ہاں نماز روزہ جیسا کچھ بن پڑتا ہے کرتی رہتی ہوں اور میں بہتیری عورتوں کو جانتی ہوں جو نماز روزے میں مجھ سے کہیں بڑھ کر ہیں مگر خدا جانے کیا بات تھی کہ بچپن سے مجھ کو جھوٹ سے، بیٹھ پیچھے لوگوں کو بُرا کہنے سے، چغلی سے، لڑائی جھگڑے سے، غرض کسی کو کسی طرح ستانے ایذا پہنچانے سے دلی نفرت رہی۔ میری اتنی عمر ہونے آئی میں نہیں سمجھتی کہ میں نے کسی کو ناراض کیا یا کسی کا دل دُکھایا ہو۔ میں سچ کہتی ہوں کہ میں خدا سے زیادہ اس کے بندوں سے ڈرتی رہی، اس واسطے کہ میں جانتی تھی کہ خدا بڑا بے نیاز اور غفور الرحیم ہے، اگر میں اس کا کوئی قصور کروں گی تو اس سے معافی کی امید ہے۔ بندے محتاج اور اسی سبب سے دل کے تنگ ہیں، اگر ان کا کوئی حق میری گردن پر رہ گیا تو مجھ سے اس کا بدلہ نہیں اُتارا جائے گا۔ ماں باپ، بھائی بہن، رشتہ دار، پاس پڑوس، جان پہچان میں اُمید کرتی ہوں ان میں سے کسی کو میرا شاکی نہیں پاؤ گے کیونکہ میں سب کو رضامند رکھنے کی کوشش میں لگی رہی ہوں جب شادی بیاہ کا چرچا ہوا

میں نے اچھی طرح جی میں ٹھان لیا کہ جس طرح ہو سکے تم کو راضی رکھنا اور رہے تمہاری مرضی کے تنکا نہ توڑنا۔ بار ہا مجھ کو شبہ ہوا کہ میں جو بندوں کے حقوق کو خدا کے حقوق پر مقدم رکھتی ہوں میری یہ بات کہیں خدا کو بُری نہ لگے بارے رات جو میں نے خواب دیکھا اور جو میں اب تم سے بیان کرنا چاہتی ہوں اُس سے دل کو پوری تسکین ہو گئی اور اب میں نے سمجھا کہ یہی اصل دین داری تھی۔ میں اُس پروردگار کے صدقے جاؤں جس نے اپنے فضل سے مجھ کو اس کی سمجھ دی۔ اب میرا خواب سُننا چاہو تو اس کے دو رستے ہیں ایک تو یہ کہ جیسی جیسی باتیں تم میں اور ان بزرگ میں ہوئی ہیں میں اُن کو قلم بند کردوں یا میں بولتی جاؤں اور تم لکھتے جاؤ۔ یا میں تمہارا پہلا سوال لکھ کر تمہارے حوالے کیے دیتی ہوں تم اس کو دیکھنا مت جب میں بیان کردوں تو میرے لکھے ہوئے سے ملا لینا اگر مطابق پاؤ تو جاننا کہ سارا خواب سچا ہے اور جو کچھ میں کہتی ہوں ان بزرگ سے سُنی ہوئی کہتی ہوں"

صادق۔ "سارا خواب لکھنے میں تو بڑی دیر لگے گی مجھ سے اتنا صبر نہیں ہو سکتا۔ اور پہلا سوال لکھنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ تمہاری نسبت ایسا شبہ نہیں ہو سکتا کہ تم اپنے دل سے بنا کر ایک بات بیان کرو گی اور جھوٹ موٹ لکھ دو گی کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے اور اس بحث میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہوں گی جو میں جانتا ہوں کہ تمہاری سمجھ سے باہر ہیں۔ بس مطلق جواب سے تمہارے خواب کی تصدیق ہو جائے گی"

صادقہ۔ "لیکن یہ چاہو کہ میں اور باتوں کی طرح خواب کو دوہرا دوں تو یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ چھوٹے چھوٹے خواب تو خیر۔ ایسے بڑے خواب جن کے بیان کرنے میں وہی لفظ نقل کرنے پڑتے ہیں جو میں نے خواب میں سُنے تھے ذرا مشکل سے ادا ہوتے ہیں۔ پھر دماغ پر ایک طرح کا بوجھ پڑتا ہے جس کی کیفیت میں بیان نہیں کر سکتی۔ اتنا بڑا نہیں مگر اسی طرح کا ایک خواب میں پہلے ماموں کے لیے دیکھ چکی ہوں۔ اُن کا امتحان ہونے والا تھا اور بہت پریشان تھے مجھ کو خواب میں پہلے سے سوالات معلوم ہو گئے اور میں نے اُن کو وقت سے پہلے لکھ کر بھیج بھی دیئے تو بڑی مشکل سے لکھے گئے تھے۔ بس مجھ سے زبانی بھی کہلواؤ گے تو کئی دن لگیں گے اور میں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ اس دماغی بوجھ کی برداشت نہیں کر سکوں گی"

صادق "یہ تو زبانی بیان کرنے سے لکھنا ہی بہتر ہوگا کہ خواب کی تحریری یادداشت بھی رہے گی۔"
صادقہ "ہاں میں بھی لکھنے ہی کو زیادہ پسند کرتی ہوں۔ تم میرے پاس بیٹھے رہو اور میں تمھارے روبرو لکھتی جاؤں۔ تم ساتھ کے ساتھ دیکھتے جانا۔ میرا لکھنا بیان کی جگہ ہوگا اور تمھارا دیکھنا سننے کی جگہ۔"
صادق "یہ ٹھیک ہے اور اس کو سوال و جواب کے طور پر لکھو۔ یعنی جو کچھ میں نے کہا ہو سوال اور جو اُن بزرگ نے فرمایا ہو جواب۔"

اس کے بعد صادقہ نے اپنا خواب قلم بند کرنا شروع کیا۔ وہ پہلے تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کرکے اور بعض اوقات ماتھے پر ہاتھ رکھ کر یاد کرتی اور پھر اُس کو لکھتی۔

چودھویں فصل
صادقہ کا مذہبی خواب
خدا اور اُس کی وحدانیت اور صفات کا عقلی ثبوت

سوال۔ پہلے مجھ کو اس سے تو مطمئن کیجئے کہ خدا ہے۔
جواب۔ اطمینان کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک اطمینان تو آدمی کو اپنی آنکھوں کے دیکھے کا ہوتا ہے، ایک اطمینان دوسرے کے کہے کا ہوتا ہے، ایک اطمینان عقلی گواہی کا ہوتا ہے کہ دیکھا نہیں سُنا نہیں مگر دل ہے کہ آپ ہی آپ تسلیم کرلیتا ہے کہ ہاں یہ بات اسی طرح پر ہے۔ لوگ عید کے چاند میں اختلاف کرتے ہیں کہ ہوا یا نہیں تو اس صورت میں اطمینان کے دو ذریعے ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہ مطلع صاف ہو اور ہم اپنی آنکھ سے واضح طور پر چاند دیکھ لیں یا ہم آپ نہ دیکھیں تو معتبر آدمی جنھوں نے واضح طور پر چاند دیکھا ہے گواہی دیں۔ یا مثلاً دُنیا میں ہزاروں شہر ہیں جن کے دیکھنے کا ہم کو اتفاق نہیں ہوا مگر تاریخ جغرافیے کی کتابوں میں ان کا بیان، نقشوں میں ان کا نام و موقع لکھا ہوا موجود ہے اور بہت سے آدمی ان میں ہو بھی آئے ہیں تو ہم کو اطمینان ہے

کہاں یہ شہر اپنی جگہ روئے زمین پر ہیں۔ تو اس طرح کا اطمینان خدا کے بارے میں نہ کسی کو ہوا اور نہ کسی کو ہو۔ لیکن اطمینان کا تیسرا ذریعہ یعنی عقلی گواہی ابھی باقی ہے اور اکثر صورتوں میں اس سے بھی ویسا ہی اطمینان ہو جاتا ہے اور ہونا چاہئے جیسا آنکھوں دیکھے سے مثلاً ایک گھڑی ہمارے سامنے پیش کی جائے تو اکثر ہم خیال نہیں کرتے لیکن کریں تو اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ آپ سے آپ نہیں بن گئی بلکہ کسی کے بنانے سے بنی ہے۔ رہی یہ بات کہ کیوں ہمارے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی اس کا سیدھا سا جواب ہے کہ خدا نے ہمارے دل ایسے ہی بنائے ہیں جیسے آنکھ رنگ کو، ڈول کو، نزدیک دور کو، ناک بو کو۔ زبان مزے کو۔ کان آواز کو۔ جلد بدن سرد و گرم کو سخت نرم کو پہچانتی ویسے ہی عقل چیز سے بنانے والے کو پہچانتی ہے نہیں ہو سکتا کہ آنکھ صحیح و سلامت ہو اور آدمی چیز کا رنگ روپ نہ پہچانے۔ اسی طرح ممکن نہیں کہ انسان معمولی عقل بھی رکھے اور اس کا مقر نہ ہو کہ دنیا کے کارخانے کا کوئی نہ کوئی بنانے والا ہے جس کو خدا کہتے ہیں۔ ہمارے ظاہری حواس ایک حد تک کام دیتے ہیں اور اس حد سے بڑھ کر معطل۔ نہ آنکھ سینکڑوں کوس کی چیز نہیں دیکھتی، کان سینکڑوں کوس کی آواز نہیں سنتے۔ اسی طرح عقل کے کام دینے کی بھی ایک حد ہے۔ ہم دنیا کے کارخانے کو دیکھ کر عقل کے ذریعے سے اتنا جانتے ہیں کہ اس کا کوئی بنانے والا ہے اور ایک ہے، عیب سے پاک، نقصان سے منزہ۔ قادر ہے، علیم ہے، حکیم ہے، رحیم ہے، الغنی جتنی عمدہ سے عمدہ صفتیں خیال میں آسکتی ہیں وہ ان سب سے متصف ہے کیونکہ ان سب باتوں کا پتہ ہم کو اسی دنیا کے کارخانے سے ملتا ہے۔ مثلاً اگر کئی خدا ہوں تو ایسی تو کیا بات ہے کہ ان میں کبھی خلاف ہو ہی نہیں سکتا اور اختلاف ہوا تو لڑائی ٹھہری ضرور ہے کہ ایک ہارے اور ایک جیتے تو جو ہارا وہ بیچارہ خدائی سے معزول بندوں کی لڑائی نے دنیا کا کیا حال کر رکھا ہے۔ اگر کئی خدا ہوں اور آپس میں لڑنے لگیں تو ان کی ٹکر کو کون سنبھالے۔ غرض دنیا کے کارخانے کا انتظام دلالت کر رہا ہے کہ یہ ایک رائے کا محکوم ہے اور یہی حال ہے خدا کی کل صفتوں کا۔ بس عقل کے ذریعے سے ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ خدا ہونا چاہیئے اور ایسا ہونا چاہیئے

اور وہ ہے اور ایسا ہی ہے۔ اتنی ہی معرفت انسان کو ہے اور اتنی ہی ہو سکتی ہے اور اتنی ہی اُس سے طلب کی جاتی ہے۔ انسان اس سے آگے قدم رکھنا چاہے تو وہ اس ارادے میں اس سے زیادہ کامیاب نہیں ہوگا جیسے وہ آنکھ سے پس دیوار دیکھنا چاہے یا سینکڑوں کوس کی چیز کو بے مدد دوربین دیکھنا چاہے۔ پہلی اور مکروہ غلطی جو انسان سے ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ یا تو عقل سے بالکل کام لینا نہیں چاہتا یا چاہتا ہے تو اُس کی بساط سے بڑھ کر کام لینا چاہتا ہے۔

سوال۔ تو کیا سارے آدمی جو خدا کے قائل ہیں ایک ہی درجے کی معرفت رکھتے ہیں۔

جواب بے شک۔ مگر یقین یقین میں فرق ہے۔ اب دیکھو کہ مثلاً موت ہی ایک چیز ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسری یقینی چیز ہو نہیں سکتی۔ لیکن لوگوں کا کیا حال ہے کہ اس تصور کو ذہن میں آنے ہی نہیں دیتے اور آنے دیتے ہوتے تو دنیا کا یہ رنگ نہ ہوتا۔ پس موت کے یقین کے معنی یہ ہیں کہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی سب آدمیوں کا حال یکساں نہیں ہے۔ بعض شاید دن رات میں ایک لمحے کے لیے موت کا بھی خیال نہیں کرتے اور بعض کا شاید کوئی منٹ موت کے خیال سے خالی نہ ہو۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حال میں لکھا ہے کہ انھوں نے گھر میں ایک سرداب کھدوا رکھا تھا۔ سلطنت کے مشاغل سے فارغ ہو کر بالالتزام ہر روز کچھ دیر کے لیے موت کا خیال تازہ رکھنے کی غرض سے سرداب میں جا کر لیٹتے۔ زیارتِ قبور کی بھی اصل غرض یہی ہے کہ قبروں کو دیکھ کر آدمی موت کو یاد کرے اور سمجھے کہ ایک نہ ایک دن میری بھی یہی نوبت ہونی ہے۔ لیکن آدمی ایسا بے حیا ہے کہ عبرت کی جگہ بزرگوں کے مزاروں پر میلوں کے جمگھٹے ہوتے ہیں یا خدائے حیّ و قیوم کی عوض عاجز مُردوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ قبر پر تو قبر، ہم نے تو لوگوں کے جنازے کے ساتھ دیکھا ہے کہ کچھ تو رنج میں ہیں اس واسطے کہ میت مر جانے سے اُن کی کچھ غرضیں فوت ہوتی ہیں۔ کچھ تقسیم ترکہ اور مراسم غمی کی سوچ میں ہیں۔ کچھ اُلاہنا اُتارنے کے لیے ساتھ ہوئے ہیں کہ کل کلاں کو کوئی یہ نہ کہہ بیٹھے کہ اتنا قریب کا رشتہ، ایسی محبت ملاقات، چار قدم میت کو کندھا لگاتے یا مٹی دینے نہ بن پڑا۔ کیا مضائقہ جینا مرنا سبھی کے ساتھ ہے۔ میت کے ساتھ بھیڑ بھڑکا تو

بہتیرا کچھ ہی مگر دوں کو ٹٹولو تو کسی ایک کو بھی اس کا خیال نہیں کہ یہ ہوا تو کیا ہوا کہ ہم ہی جیسا ایک آدمی سب کچھ تھا یا ایک پھونک نکل گئی تو کچھ نہ تھا۔ اور یہی منزل ہم سب کو درپیش ہی نہیں معلوم کس وقت بلاوا آئے اور یہ سارا ڈھونڈا ادھر کا ادھر رہ جائے۔ بعینہ یہی حال ہی خدا کی معرفت کا کہ اس سے انکار تو نہیں ہو سکتا کیونکہ انسان کی بناوٹ ہی اس قسم کی واقع ہوئی کہ خدا کو مانے بدون اُس کو چارہ ہی نہیں مگر بعض تو ایسا ماننا مانتے ہیں کہ گویا خدا کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور بعض اس حد سے نہیں بڑھتے کہ انکار کرتے نہیں بن پڑتا اور ان دو حدوں کے درمیان بے شمار مدارج ہیں۔ کوئی ہمہ وقت مستغرق، کوئی اس سے کم کوئی اس سے بھی کم یہاں تک کہ کوئی بالکل بے فکر

سوال - خدا کے ماننے سے اُس کا نہ ماننا زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے جب ہم کو ایسا خدا ماننا پڑتا ہے جو آپ سے آپ موجود ہو گیا ہے تو کیوں نہ ہم دنیا ہی کو مان لیں کہ وہ آپ سے آپ موجود ہو گئی ہے۔

جواب - یہ اعتراض ہے انسان کے دل کی بناوٹ پر کہ کیوں دنیا کے آپ سے آپ موجود ہو جانے کو قبول نہیں کرتا اور کیوں خدا کے ماننے سے اس کی تسکین ہو جاتی ہے۔

سوال - تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فرد بشر خدا سے منکر نہیں اور منکر ہو نہیں سکتا پھر مشرک اور بت پرست اور دہریئے یہ کیا ہیں؟

جواب - بے شک جس طرح کوئی آدمی جانور نہیں ہو سکتا، درخت نہیں ہو سکتا، پتھر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کوئی آدمی خدا سے منکر بھی نہیں ہو سکتا۔ آدمی ہونا اور خدا کا قائل ہونا لازم ملزوم ہیں جب تک آدمی آدمی ہے وہ خدا کا بھی ضرور قائل ہے ایسا ہو نہیں سکتا کہ آدمی ہو اور خدا کا قائل نہ ہو تم مشرکوں کو منکر خدا سمجھتے ہو۔ ہم لوگ تو ایک ہی خدا کو مانتے ہیں اور مشرک کئی خدا کے قائل ہیں تو اُن کو منکر خدا کیوں کر کہا جا سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ لوگ خدا کا مصداق قرار دینے میں اور اُس کی صفات میں غلطیاں کرتے ہیں۔ چاہیئے خدا سمجھنا کسی کو اور سمجھ لیتے ہیں کسی کو۔ چاہیئے سمجھنا کیسا اور سمجھ لیتے ہیں کیسا۔ اسی وجہ سے وہ منکر خدا سمجھے جاتے ہیں۔ اور ایک اعتبار سے الزام ہے بھی واجبی۔

سوال - آپ کو معلوم نہیں ہزاروں آدمی ہیں جو سرے سے خدا ہی کے قائل نہیں۔

جواب - مجھ کو معلوم نہ ہو مگر جتنے لوگوں کو منکرِ خدا خیال کیا جاتا ہے اُن میں سو پیچھے ایک بھی مشکل سے منکرِ خدا نکلے گا۔ اُن میں بہت سے ایسے لوگوں کو گن لیا جاتا ہے جو سرے سے اس طرف توجہ ہی نہیں کرتے وہ کھانے پینے سو رہتے اور جانوروں کی طرح اپنی زندگی کے دن بسر کر دیتے ہیں۔ اُن میں بہت سے ایسے لوگوں کو گن لیا جاتا ہے جو اس سبب سے کہ اُنھوں نے اچھی طرح غور نہیں کیا خدا کے بارے میں طرح طرح کی غلطیاں کرتے ہیں۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ لوگ خدا کے حکم کی وجہ سے بھی نافرمانی اور سرکشی کرتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص معاذ اللہ منکرِ خدا ہو یا اُس کی جناب میں گستاخی کرے یا اس کا حکم نہ مانے تو دنیا میں اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ نہ اُس پر بجلی گرتی، نہ وہ ہیضہ کر کے مرتا، نہ اُس کے گھر میں آگ لگتی۔ اس سے اور بھی مغالطہ واقع ہوتا ہے اور کوئی کوئی نالائق خدا کے ساتھ کھیل کرنے لگتے ہیں لیکن یہ اُن کا خدعِ نفس ہے جب اُن پر کوئی مصیبت نازل ہوتی تو خدا کے آگے گڑگڑانے لگتے اور اصلی فطرت کھل پڑتی ہے فرعون پر کیا گزری تھی کہ وہ دنیاوی خوش حالی کے غرے میں آ کر موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب ہی کرتا رہا جب لگا ڈوبنے اور اپنی درماندگی اُس پر ثابت ہوئی تو چار و ناچار ترک کر خدا کا اقرار کرنا پڑا۔ اور بول اُٹھا[1] اٰمنت انہ لا الٰہ الا الذی اٰمنت بہ بنو اسرائیل و انا من المسلمین۔ اور ایک فرعون پر کیا موقوف ہے ہر شخص بجائے خود فرعون ہے اگر سوچے اور سمجھے چنانچہ انسان کی طبیعت کو خدا سے بہتر کون جان سکتا ہے تصنیف مصنف نیکوکند بیاں وہ انسان کے بارے میں فرماتا ہے اور یہی مضمون دوسرے لفظوں میں کئی جگہ قرآن میں آیا ہے[2] حتیٰ اذا کنتم فی الفلک و جرین بھم

[1] اب مجھ کو بھی یقین ہو گیا کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں وہی خدا ہے اور اب میں بھی اسی کو مانتا ہوں [2] یہاں تک کہ جب تم ناؤ میں بیٹھتے ہو اور وہ لوگوں کو بادِ موافق کے ساتھ لے کر روانہ ہوتی ہے اور لوگ خوش ہوتے ہیں یکایک ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے اور ہر طرف سے لہریں آنے لگتی ہیں اور خیال ہوتا ہے کہ اب تو گھر گئے تو خدا سے بڑے خلوص کے ساتھ دعائیں مانگنے لگتے ہیں کہ اگر ہم کو اس بلا سے نجات ہو تو ہم تیرا بڑا احسان مانیں۔ پھر جب خدا ان کو نجات دے دیتا ہے تو خشکی میں پہنچ کر ناحق ناروا بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ لوگو یہ بغاوت تمھارے ہی حق میں مضر ہے دنیا کی زندگی میں اس سے فائدہ اٹھا لو پھر آخر کار تم کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے اس وقت ہم تم کو بتا دیں گے کہ تم دنیا میں کیا کرتوت کرتے رہتے ہو۔

بریح طیبۃ وفرحوا بھا جاء تھا ریح عاصف وجاء ھم الموج من کل مکان وظنوا انھم احیط بھم

دعوا اللہ مخلصین لہ الدین لئن انجیتنا من ھذہ لنکونن من الشاکرین فلما انجاھم

اذا ھم یبغون فی الارض بغیر الحق یا ایھا الناس انما بغیکم علٰی انفسکم متاع الحیوۃ الدنیا

ثم الینا مرجعکم فننبئکم بما کنتم تعملون سُنتے ہیں کہ جو مجرم بڑے چالاک و رسیانے ہوتے ہیں
اُن کو شراب پلا دیتے ہیں کہ عقل فساد پر سے اُن کا اختیار اُٹھ جائے اور وہ نشے کی حالت میں سارا کچا حال
ظاہر کر دیا کرتے ہیں۔ تو جو شخص خدا سے انکار کرنے کا مجرم ہو اُس کی شراب ہے مصیبت کہ جب مصیبت
پڑے گی اور اس کو اپنا عجز معلوم ہو گا ممکن نہیں کہ وہ اقرار نہ کرنے لگے۔ اور یہ شراب کسی کو زندگی میں نہ
پلائی گئی تو مرتے وقت ضرور پلائی جائے گی وجاءت سکرۃ الموت بالحق تو ایسا انکار کیا سند ہو سکتا ہے۔
مصیبت پڑے اور خدا یاد نہ آئے تو جانیں۔ اور یہی تو حکمت ہے کہ بزرگان دین نے تکلیف و رایذا اور تنگ حالی میں
رہنے کو پسند کیا ہے کہ اس سے بہتر کوئی تازیانہ غفلت ہو نہیں سکتا۔ آدمی ہو اور خدا سے منکر ہو ایسا ہی جیسے
پتھر ہو اور اوپر سے گرایا جائے اور زمین پر نہ گرے۔

سوال- اگر آدمی منکر خدا ہو نہیں سکتا تو پھر شرک اور بُت پرستی پر اتنا شور و شغب کیوں اور اس قدر غیظ و غضب کس لیے
جواب- بس یہی بی اے پاس کیا ہے سارا یہ لکھ کر صادقہ جھینپی۔ مگر سید صادق نے کہا میں جانتا ہوں کہ یہ
تم نہیں کہہ رہیں بلکہ دوسرے کے کہنے کی نقل کر رہی ہو بے شک بے تامل وہی لفظ لکھو جو اُن کے مُنہ سے نکلے
اور جب میں برسر غلط ہوں تو اُن بزرگ کو بہ اور اس سے زیادہ کہنے کا حق ہے تو صادقہ ذری کی ذری
رُک کر لکھ چلی) میں کہہ چکا ہوں کہ میں بت پرستوں اور مشرکوں کو منکر خدا نہیں سمجھتا۔ اس عقیدے
کے لوگ خدا کو تو مانتے ہیں مگر خدائی کے مصداق کی تعیین میں غلطی کرتے ہیں۔

سوال- اچھا پھر اس میں خدا کا کیا حرج ہے۔
جواب- خدا کا تو ذاتی کچھ بھی حرج نہیں۔ اگر ساری دُنیا اُس سے منحرف ہو بیٹھے اور اُس کی خدائی کی

قائل نہ ہو تو بھی وہ خدا ہے، اور تو بھی وہ دنیا جہان کا خالق ہے اور تو بھی وہ دنیا جہان کا پروردگار ہے اور تو بھی وہ علیم ہے، اور تو بھی وہ قادر ہے۔ مثلاً روز روشن میں آفتاب بڑا چمکتا ہوا اگر ساری دنیا آفتاب سے آنکھیں موند لے اور کہے کہ آفتاب نہیں اور یہ روشنی آپ سے آپ ہو رہی ہے یا آفتاب کے سوائے کسی اور چیز کی ہے تاہم آفتاب آفتاب ہے۔ مگر ہاں ہم جو چیز بناتے ہیں ہر ایک چیز کی کوئی نہ کوئی غرض و غایت ہوتی ہے مکان بناتے ہیں رہنے کے لئے، کپڑا بناتے ہیں ستر عورت اور سردی گرمی سے بچنے کے لئے۔ اسی طرح خدا نے جو ہزاروں لاکھوں قسم کی مخلوقات دنیا میں پیدا کی ہر ایک مخلوق کے پیدا کرنے کی کوئی غرض و غایت ضرور ہے بعض مخلوقات کی بعض اغراض کو انسان سمجھتا بھی ہے اور اکثر کو نہیں سمجھتا شاید آگے کو سمجھے یا نہ سمجھے اور دنیا جو ترقی کر رہی ہے، نئے نئے علوم ایجاد ہوتے چلے جا رہے ہیں، نئے نئے فنون نئی نئی کلیں نئی نئی صنعتیں اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ آدمی مخلوقات عالم کی اغراض و غایات سے واقفیت پیدا کرتا چلا جا رہا ہے معلوم نہیں خدا کو کس حد تک انسان کا واقف کرنا منظور ہے۔ انسان نے سٹیم (بھاپ) اور الکٹریٹی (قوت برقی) اور چیزوں کے کیمیائی خواص اور کیا اور کیا معلوم کر کے اپنے کتنے کام نکالے ہیں، اور کیا سب آدمی ہم مسلمانوں کی طرح جاہل اور بدنصیب ہیں، اہل یورپ کو دیکھو کہ ہم کو ان کے مقابلے میں اپنے تئیں جانور کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کیا کچھ کر گزرے اور کیا کچھ کر رہے ہیں اور کیا کچھ آگے کو نہ کریں گے۔ تو خدا نے جو انسان کو ایک خاص طرح کا مخلوق بنایا ہے اس کو عقل دی اس عقل کی بھی غرض و غایت ہونی ضرور ہے اور وہ نہیں ہے مگر علم یعنی اپنے تئیں جاننا اور اپنے سوائے اور چیزوں کو جاننا کیوں کہ اگر وہ جانے گا نہیں دنیا میں اپنے اختیارات کیوں کر عمل میں لائے گا، دنیا کی چیزوں میں تصرفات اشرف المخلوقات کس طرح بنے گا، خلافت الٰہی کا بار کس برتے پر اٹھائے گا؟ پس علم انسانی کی ابجد یہ ہے کہ وہ اپنے تئیں جانے اور اپنے تئیں جاننا تو خدا کو جاننا من عرف نفسہ فقد عرف ربہ تو جس مصلحت سے خدا نے انسان کو پیدا کیا، جس مصلحت سے اس کو عقل دی، اسی مصلحت سے خدا یہ بھی چاہتا ہے کہ انسان اپنے تئیں جانے اور اپنے تئیں جانے گا تو خدا کو جانے گا پر جانے گا۔ اگر انسان کے پیدا کرنے سے خدا کا کچھ حرج تھا تو انسان کے اپنے تئیں

نہ جاننے یعنی خدا کو نہ جاننے سے بھی اُس کا حرج ہو تو اس میں قباحت کیا ہے۔ خدا کو جاننا شرطِ انسانیت ہے۔ اگر انسان نے اتنی موٹی بات بھی نہ جانی کہ میں اپنے ارادے سے پیدا نہیں ہو گیا، اپنے ارادے سے زندہ نہیں ہوں، اپنے ارادے سے مروں گا نہیں، میرے کیے سے دنیا چل نہیں رہی، تو اُس نے جانا ہی کیا اور وہ جانے ہی گا کیا، یعنی خدا نے اس کو بنایا انسان اور اس نے بننا چاہا جانور اور جانوروں میں سے گدھا اور گدھے سے بھی بدتر۔ غرض جس طرح خدا نے انسان کو انسان بنایا، اُس کو آنکھ دی کہ دیکھے، کان دیئے کہ سُنے، ناک دی کہ سونگھے، زبان دی کہ مزہ لے، ویسے ہی اسی طرح خدا نے انسان کو عقل دی کہ اُس سے کام لے اور عقل کا پہلا کام ہے کہ خدا کو پہچانے۔ پس اگر خدا انسان سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو پہچانے تو وہ حقیقت میں اپنے حکم کی تعمیل چاہتا ہے کہ میں نے اس کو انسان بنایا ہے، یہ انسان بنے۔ مسئلہ ہے ذرا نازک، بہت غور کرنے سے ذہن نشین ہوتا ہے۔ تین باتیں ہیں، خدا کو نہ ماننا۔ خدا سے غافل ہونا۔ خدا کے مصداق کی تعیین میں غلطی کرنا۔ میرے نزدیک پہلی قسم بحث سے خارج ہے۔ یعنی ممکن نہیں کہ آدمی خدا کا قائل نہ ہو جیسے ممکن نہیں کہ آنکھ صحیح و سالم ہو اور نہ دیکھے، کان صحیح و سالم ہوں اور نہ سُنے۔ ہاں دوسری دو قسمیں کثیر الوقوع ہیں یعنی لوگ اکثر خدا سے غافل ہیں اور مصداق خدا کی تعیین میں غلطی کرتے ہیں بلکہ مصداق خدائی کی تعیین میں غلطی کرنا یہ بھی ایک طرح کی غفلت ہی ہے۔ ذرا بھی تامل کو کام میں لاؤ تو اس غلطی کی اصلاح ہو جاتی ہے اور دل بولنے لگتا ہے کہ یہ عناصر، یہ اجرام فلکی، یہ فرشتے، یہ پیغمبر، یہ بزرگان دین، یہ قبریں، یہ بت، یعنی خدا کے سوائے جتنی چیزیں ہیں ان میں سے کسی کو خدا بننے کی صلاحیت نہیں۔ اس کو دین کہو تو، فطرت اللہ کہو تو، انسان کی خلقی طور کی بناوٹ سمجھو تو، بات ایک ہی ہے۔ وہ جو تنکے کی اوجھل پہاڑ سُنا ہو بس وہی حال دین کا ہے۔ لوگوں نے بات کا بتنگڑ بنا رکھا ہے ورنہ ہو لے کچھ بھی نہیں۔ اگر دو اور دو کا چار ماننا، چار تسلیم کرنا، چار سمجھنا انسان کے لئے کوئی تعریف کی بات ہے تو بے شک اس کا خدا کو ماننا، خدا کو تسلیم کرنا، خدا کو پہچاننا بھی تعریف کی بات ہونی چاہیئے۔ خدا کو ماننا، تسلیم کرنا، پہچاننا تو تعریف کی بات نہیں ہاں نہ ماننا، نہ تسلیم کرنا، نہ پہچاننا یعنی

بداہت کا انکار البینۃ الزام کی بات ہی۔ غرض آدمی منکر خدا تو ہو نہیں سکتا مگر یہ کہ وہ دیوانہ اور مسلوب العقل ہو اور دیوانہ و مسلوب العقل ہوا تو وہ بے چارہ معذور و مرفوع القلم ہی۔ ہاں انسان سے خدا کے بارے میں غفلت ہو سکتی، خدائی کے مصداق کی تعیین میں غلطی ہو سکتی اور ہو سکتی کیا کثرت سے ہوتی ہی۔ اور اسی غفلت کے دفعیے اور اسی غلطی کی اصلاح کے لیے پیغمبر کے آنے کی ضرورت تھی اور وقتاً فوقتاً پیغمبر آتے رہے۔

سوال۔ اگر یہی دین ہی تو کچھ بھی نہیں۔

جواب۔ دین یہی ہی اور یہی بہت کچھ ہی اور یہی سب کچھ ہی۔

سوال۔ ہر ملک اور ہر زبان کے کتب خانوں میں دینی کتابوں کے انبار کے انبار لگے پڑے ہیں تو آپ کے نزدیک یہ سب فضول ہی اور اختلافِ دین نے جو دنیا میں ایک فساد برپا کر رکھا ہی کہ آدمی آدمی کو کھائے جاتا ہی۔ یہ سب بے اصل محض ہی۔

عقل انسان کی نارسائی

جواب۔ سنو صاحب۔ اس طرح کی پریشان گفتگو سے تو کچھ ہونا ہوانا نہیں۔ پہلے ہمارے آپ کے درمیان دو باتوں کا قرار داد ہو جائے۔ اول یہ کہ انسان کی عقل اور اس کے علم کو آپ محدود سمجھتے ہیں یا نہیں

سوال۔ ذرا اس کی تصریح کیجیے

جواب۔ میرا مطلب یہ ہی کہ خدا نے جو انسان کو علم دیا ہی اور علم حاصل کرنے کے لیے اس کو عقل عطا فرمائی ہی یا یوں ہی نہ سہی کہ خدا نے دیا ہی اور خدا نے عطا فرمائی ہی بلکہ انسان جو عقل رکھتا ہی کیا وہ اس درجے کی قوت ہی کہ ہر ایک بات کی اور ہر ایک چیز کی کُنہ کو دریافت کر سکتی اور اس کا علم جامع اور شامل اور کامل ہی اور کوئی چیز کوئی واقعہ انسان کی عقل کی گرفت سے خارج نہیں۔

سوال۔ چونکہ زمانہ روز بروز ترقی کرتا اور نئے نئے علوم نئے نئے فنون ایجاد ہوتے چلے جا رہے ہیں عقل انسان کے لیے کسی حد کا قرار دینا مشکل ہی۔

آسائش کے لیے سجایا گیا ہو ؎

جو خمانہ ہستی میں ہو انسان کے لیے ہو آراستہ یہ گھر اسی مہماں کے لیے ہو

یہ مخدوم ہو اور ہوا اور پانی اور حیوانات اور نباتات غرض دنیا اور جو چیز دنیا میں ہو سب اس کی خادم۔ اس کی ساخت۔ اس کی صورت دلالت کرتی ہو کہ یہ آمر ہو اور دوسری مخلوقات مامور یہ روئے زمین کا بادشاہ ہو اور دوسری مخلوقات اس کی رعایا۔ دیکھتے نہیں کہ دوسرے جانور سرنگوں رہتے ہیں اور یہ سربلند۔ یہ سب کچھ ہو مگر پھر بھی عاجز و ناتواں ہو۔ حکومت ہو مگر گئے دن کی ۹ دن کی شل ہو۔ دو دن کی کوتوالی اور پھر وہی کھرپا اور جالی۔ سارا کھیل ہوا کا ہی پھونک نکلی اور وہی مٹی کی مٹی وقعت کے ازلی ابدی ہونے کو دیکھو اور پھر انسان کی ہستی پر نظر کرو تو اس کی ہستی محض نمود بے بود معلوم ہوتی ہو **قطعہ**

ایسی ہستی عدم میں داخل ہو نے جوان ہم نہ طفلِ شیر ہوئے

ایک دم تھی نمود بود اپنی یا سفیدی کی یا اخیر ہوئے

یعنی مانندِ صبح دنیا میں ہم جو پیدا ہوئے تو پیر ہوئے

اور پھر مختصر ہو تو خیر ہونے کے ساتھ بے ثبات ناغیر منیقن اور انسان کے اختیار سے خارج۔ یہ ہو وہ ہستی جس پر ہم لوگ بھولے اور پھولے پھرتے ہیں۔ بات تو یہ ایسی صاف ہو کوئی احمق سے احمق اور ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا مگر صرف انکار نہ کرنے سے کام نہیں چلتا۔ اس خیال کو سوچ سوچ کر ایسا راسخ کرنا چاہیئے کہ ہمہ وقت نہیں تو اکثر اوقات پیش نظر رہے۔ دنیا کے واقعات اپنے طور پر ہوتے رہتے ہیں ہم مانیں یا نہ مانیں تسلیم کریں یا نہ کریں سمجھیں یا نہ سمجھیں جتنا غور کرو گے بنیاد ماندہ دربے حقیقت اور ناچیز ہونا تم پر کھلتا چلا جائے گا۔ واقعاتِ نفس الامری کے تسلیم کرنے کے سوائے دین ہم سے کچھ اور نہیں چاہتا۔ دین کا لب لباب یہ ہو کہ ہم کو آدمی بنایا گیا ہو۔ اور ہم آدمی بن کر دنیا میں رہیں۔

سوال۔ آپ تو کچھ اس طرح کی تقریر کرتے ہیں کہ شکوک و اعتراضات کے پہلو ہی پر نہیں آنا چاہتے۔

جواب۔ میں تمھارے شکوک و اعتراضات کے پہلو پر نہیں آنا چاہتا۔ یا تم شک و اعتراض کی گنجائش نہیں پاتے۔ بھلا اس وقت تک جو کچھ میں نے کہا اس میں سے کوئی بات تم کو تسلیم نہ ہو تو بیان کرو کہ میں تمھارا شک رفع کردوں۔

دینی خیالات کا سلسلہ

سوال۔ میں تو یوں جاننا چاہتا ہوں کہ دین ہے کیا چیز؟

جواب۔ اگرچہ میں اس کا جواب دے چکا ہوں مگر خیر پھر سہی۔ انسان کا جہاں تک اس کی عقل کی رسائی ہے اپنی حقیقت کو جاننا اسی کا نام دین ہے۔

سوال۔ اور اگر نہ جانے؟

جواب۔ نہ جانے کیا؟ یعنی اس میں جاننے کی صلاحیت نہ ہو یا صلاحیت ہو اور جاننا نہ چاہے۔ اگر جاننے کی صلاحیت ہی نہیں تو وہ بے چارہ مرفوع القلم ہے اور اس سے بحث نہیں۔ اور اگر جاننے کی صلاحیت ہے اور جاننا نہیں چاہتا تو اس کی مثال ایسی ہے کہ آنکھیں ہیں اور دیکھنا نہیں چاہتا۔ مگر اس کے نہ دیکھنے سے دنیا تو تاریک نہیں ہوئی جاتی۔ اور اسی لئے پیغمبر بھیجے گئے ہیں کہ جن کو آنکھیں دی گئی ہیں پیغمبر اُن کو دکھائیں اور وہ دیکھیں

سوال۔ یہ تو اچھا دین ہے جس میں خدا رسول کا نام تک نہیں!

جواب۔ یہ تمھاری سمجھ کا پھیر ہے جب آدمی نے اپنی حقیقت کو جانا اُس نے خدا اور رسول اور خدا رسول کے احکام اور شریعت اور عاقبت غرض دین کی سب باتوں کو جانا من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے یہی تو معنی ہیں اپنی حقیقت کو جاننا دین کا ایسا جامع خلاصہ ہے کہ اس سے جامع تر کوئی خلاصہ ہو نہیں سکتا۔ اور باقی جو کچھ کتابوں میں اور جو کچھ لوگوں کے دلوں میں اور لوگوں کے مونہوں میں ہے سب اسی خلاصہ کی تفصیل ہے

سوال۔ میں نہیں سمجھتا کہ خود شناسی کو خداشناسی اور دینداری سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

جواب۔ خداشناسی اور دینداری ضروری نتیجہ ہے خودشناسی کا۔

سوال۔ یہ کیوں کر؟

جواب۔ ہاں یہ اس طرح پر کہ آدمی اپنے تئیں جانے گا تو وہ اپنے میں اور دوسری مخلوقات میں فرق بھی کرے گا۔ وہ دیکھے گا کہ دنیا میں ادنیٰ درجے کی مخلوقات جمادات ہیں جہاں پڑے ہیں پڑے ہیں۔ ان میں نہ بالیدگی ہے نہ حرکت ہے نہ کسی طرح کا احساس ہے اور نہ اپنا مثل یا اپنا قائم مقام پیدا کرنے کی صلاحیت۔ ان سے اونچے درجے پر نباتات ہیں کہ وہ از خود ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہیں تو نہیں جا سکتے مگر اُن میں نمو ہے اپنا مثل پیدا کرنے کی صلاحیت ہے اور احساس بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں بھی کسی قسم کی جان ہے۔ اُن سے اوپر چلو تو حیوانات ہیں کہ نمو اور اپنا مثل پیدا کرنے کی صلاحیت کے علاوہ اپنے ارادے سے چلتے پھرتے ہیں۔ اُن کا احساس بھی نباتات کے احساس سے اعلیٰ درجے کا ہے یہاں تک کہ اُن کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں بھی ایک طرح کی عقل ہے۔ سب سے اول درجہ یا افضل درجہ حضرتِ انسان کا ہے۔ جسمانی بناوٹ پر نظر کرو تو جانوروں سے بھی گئے گزرے ہوئے۔ زور میں توانائی میں چستی میں چالاکی میں بلکہ احساس میں بھی۔ مگر ایک عقل پا گئے ہیں جس نے تمام روئے زمین پر اپنا سکہ بٹھا رکھا ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں (اس لفظ پر صادقہ ذرا کی ذرا جھجکی) کہ جتنی مخلوقات ہم دیکھتے اور جانتے ہیں اِن میں سے کوئی خدا ہوتا تو کون ہوتا؟

سوال۔ خدا ہوتا ہی کیوں؟

جواب۔ تم تو لگے پھر ساری بحث کو دوہرانے۔

سوال۔ ہاں میں دوہراتا ہوں اس غرض سے کہ ہر پہلو سے سمجھ لوں۔

جواب۔ بہت منطقی احتمالات نکالنے کی جگہ نہیں ہے۔ سمجھنا چاہو تو سیدھی سی بات ہے نہیں معلوم کہ خدا ہے یا نہیں ابھی اس کو رہنے دو یہ دنیا تو ہے اور ہم بھی ہیں۔ آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے اور عقل ہے جس سے سمجھتے ہیں۔ اس کے دنیا آپ سے آپ بن گئی ہو ہمارا دل نہیں ہٹکتا اور خواہی نخواہی عقل تقاضا کرتی ہے کہ اس عظیم الشان کارخانے کا بنانے والا کوئی نہ کوئی تو ہے۔ اور یہ ہی تو اسی کارخانے کا انتظام دلالت کرتا ہے کہ وہ علیم ہے، قدیر ہے، حکیم ہے، یعنی مستجمع تمام صفاتِ کمال ہے۔ لیکن جن چیزوں کو ہم دیکھتے اور جانتے ہیں اُن میں سے

اگر ایسا کوئی ہوتا تو ہم میں سے کوئی ہوتا۔ لیکن ہم کو اپنی حقیقت تو معلوم ہے کہ باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے عاجز و بے اختیار ہیں۔ پس چار و ناچار ماننا پڑتا ہے کہ خلاقِ عالم ایک ہستی ہے جس کو نہ ہم آنکھ سے دیکھ سکتے اور نہ اُس کی حقیقت کو بزورِ عقل دریافت کر سکتے ہیں بس خدا شناسی کے بارے میں انسان کی پرواز یہیں تک ہے۔ اس سے زیادہ نہ اُس نے جانا اور نہ اس زندگی میں اس سے زیادہ جان سکتا ہے۔ اور اس سے زیادہ جاننے کی کوشش کرنا سعی لاحاصل بلکہ ممنوع ہے۔ چنانچہ خدا نے قرآن میں صاف صاف فرما دیا ہے ولا تقف ما لیس لک بہ علم جس چیز کا علم تم کو نہیں دیا گیا یعنی جس چیز کے جاننے اور معلوم کرنے کی تم کو صلاحیت ہی نہیں دی گئی اُس کے پیچھے نہ پڑا کرو اور سمجھ لو کہ وہ چیز تمہارے بس کی نہیں۔ تو اُس کے پیچھے پڑنا ناحق اپنے ایمان کو ڈانوا ڈول کرنا ہے۔ مگر الانسان حریص علیٰ ما منع انسان کا طرز مزاج ہی کچھ اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ جس بات سے منع کرو وہ اور بداگر اُسے کرنا چاہتا ہے۔ کچھ تو اس کے مزاج میں خود سری ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کسی کا محکوم ہو کر رہے۔ اور کچھ یہ بھی ہے کہ دیکھیں خلافِ حکم کرنے میں ہوتا کیا ہے آدمؑ کی یہی رکان تو شیطان کو معلوم ہو گئی تھی کہ اُس نے آدم کو بہلا پھسلا کر گیہوں کے کھانے پر آمادہ کیا جس کی خدا نے آدمؑ کو سخت مناہی کی تھی۔ آدمی کے بچوں ہی کو دیکھو کیسے چلبلے اور بے چین ہوتے ہیں۔ کتنا ہی منع کرو کسی چیز کو چھیڑے بدون نہیں رہتے۔ وہ چیزوں کو توڑتے پھوڑتے اور اکثر اپنے تئیں نقصان پہنچا لیتے ہیں مگر باز نہیں آتے۔ خدا کے ساتھ بھی انسان کا یہی معاملہ ہے وہ جانتا ہے کہ خدا ہے۔ عادت کے مطابق اس سے صبر نہیں ہو سکتا اور چاہتا ہے کہ اور چیزوں کی طرح خدا کو بھی جان لوں مگر خدا اور چیزوں کی طرح کا نہیں ہے لیس کمثلہ شئی

سوال۔ بس اتنی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر کسی آدمی کا ذہن اس طرف منتقل نہ ہوا اور وہ سرے سے خدا کو جانے اور مانے ہی نہیں تو اس میں حرج کی کیا بات ہے۔

جواب۔ اس شبہے کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ تم نہ پیغمبر ہو نہ محتسب اور نہ دُنیا کے ٹھیکہ دار تم کو دوسرے لوگوں کے جاننے نہ جاننے، ماننے نہ ماننے سے کیا سروکار؟ وہ جانیں اور اُن کا کام جانے۔ تم اپنی کہو کہ

تم جانتے اور مانتے ہو یا نہیں۔ دوسرے یہ کہنا کہ کسی آدمی کا ذہن اس طرف منتقل نہ ہو وہ سرے سے خدا کو جانے اور مانے ہی نہیں، فرض غلط ہے۔ نہ ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ آدمی ہو اور خدا کو نہ جانے اور نہ مانے۔ آدمی ہونا اور خدا کو جاننا ماننا لازم و ملزوم ہیں۔ ہاں جاننے ماننے میں فرق ہے۔ کوئی تو اس طرح کا جاننا ماننا جانتا مانتا ہے کہ ہر چیز میں اُس کو خدا ہی خدا دکھائی دیتا ہے ؎

ہر چہ آید در نظر غیر تو نیست یا توئی یا خوے تو یا بوے تو

اور کوئی اس طرح کا جاننا ماننا جانتا مانتا ہے کہ مصیبت پڑے پر اس کو خیال آجاتا ہے۔ کوئی ہمہ وقت اُس کی یادگاری میں لگا ہے۔ کوئی اس سے کم۔ کوئی اُس سے کم۔ یہاں تک کہ کوئی خدا کا بندہ ایسا بھی ہو کہ اُس نے شاید ساری عمر میں گنتی کی دفعہ اُس کو یاد کیا ہو گا۔ مگر کیا ہو گا ضرور دللآخرۃ اکبر درجات واکبر تفضیلا کے یہی تو معنی ہیں۔

سوال۔ اگر انسان خدا کے جاننے ماننے پر مجبور ہے تو دین کا اتنا سارا غل غپاڑا کیوں ہے؟

جواب۔ غل غپاڑا نہیں ہے، اس لیے کہ آدمی خدا کا قائل نہیں بلکہ اس لیے کہ عالم اسباب میں رہنے کی وجہ سے خدا کے مصداق کی تعیین میں غلطی کرتا ہے اور اس لیے کہ خدا کی یادگاری اُس حد تک نہیں کرتا جس حد تک اُس کی یادگاری کی ضرورت ہے۔

مذہب کی ضرورت

سوال۔ ضرورت کس کو ہے یاد کرنے والے کو یا خدا کو؟

جواب۔ خدا کو کیوں ضرورت ہونے لگی ہے اُس کی ذات تو بے نیاز ہے ضرورت ہے یاد کرنے والے کو ضرورت ہی نہیں جہان کو۔

سوال۔ اسی ضرورت کو تو میں سمجھنا چاہتا ہوں۔

جواب۔ بات یہ ہے کہ دنیا کو ایک طرح کی مشین (کَل) سمجھو اور خدا کو بلا تشبیہ اس کا انجنیر کہ اُسی نے وہ مشین ایجاد کی، بنائی اور وہی اُس کو چلا رہا ہے۔ موجوداتِ عالم اس مشین کے پُرزے اور ساز و سامان ہیں۔

دُنیا کی مشین کے پُرزوں میں سے آدمی بڑا ضروری اور چلتا ہوا پُرزہ ہے بظاہر ہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل آپ سے آپ پڑی چل رہی ہے اور پُرزے از خود اپنا کام دے رہے ہیں اور انجنیر کوئی چیز نہیں اور نہ اُس کو کل میں کسی طرح کا دخل ہے۔ لیکن واقع میں انجنیر ہی سب کچھ ہے اور وہ نہ ہو تو ساری کل ٹھنڈی اور بیکار۔ مشین میں بہت سے آدمی لگے ہیں مگر انجنیر کے سوائے کسی کو اتنا سلیقہ نہیں کہ ایک پیچ ڈھیلا پڑ جائے تو اُسے کس کر کل کو چلتا کرے۔ آدمی جس کو ہم نے دنیا کی مشین کا ضروری اور چلتا ہوا پرزہ قرار دیا ہے، ضروری اور چلتا ہوا ہونے کے علاوہ خطرناک بھی ہے کہ بگڑے تو دوسرے پرزوں کو نقصان پہنچائے۔ اور اُس کو چلتا ہوا رکھنے کے لیے ایک خاص طرح کے آئل ذیل کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بدون وہ کام نہیں دے سکتا۔ یہ آئل ہے یاد الٰہی۔ بہت لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں کہ وقت کا حاکم آدمیوں کو درست رکھتا ہے۔ وہ ان کو چوری نہیں کرنے دیتا، خوں ریزی نہیں کرنے دیتا، فساد نہیں کرنے دیتا، آپس میں لڑنے جھگڑنے نہیں دیتا، ورنہ دنیا میں ایک کو ایک بسنے نہ دے۔ سچ ہے حاکم وقت کو بھی امن کے قائم رکھنے میں بڑا دخل ہے مگر حاکم وقت کہاں تک اپنا ربط و ضبط بٹھا سکتا ہے؟ مثلاً یہ تمھاری دلّی دو پونے دو لاکھ کی بستی ہے حاکم وقت بہت کرے گا بہت کرے گا فرض کرو کنسٹبل چوکیدار افسر ماتحت پیادے سوار سب مل کر پانچ ہزار آدمی پولیس میں بھرتی کرے گا حالاں کہ اتنوں کی بھی گنجایش نہیں۔ اول تو ان ہی پانچ ہزار کا بھروسا نہیں یہ بھی تو آخر آدمی ہیں بلکہ بعض اوقات تو پولیس والوں کی ایسی شکایتیں سُنی جاتی ہیں کہ امن قائم رکھنے کے عوض یہی لوگ خرابیوں کے باعث ہوتے، چوریاں کراتے، مجرموں سے سازشیں رکھتے اور طرح طرح کے ظلم کرتے ہیں۔ لیکن فرض کرو کہ یہ پانچ ہزار کے پانچ ہزار بھلے آدمی اور نمک حلال بھی ہوں تو دو پونے دو لاکھ پر ہمہ وقت اُن کی گرفت کیا۔ زنانے خانوں میں ان کی رسائی نہیں، شہر میں ہزار پیچ در پیچ گلیاں ہیں کہ دن دہاڑے لوٹ لو تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ نہ کہ اندھیری رات اور جھاڑ بھی برس رہا ہو تو ایسے مواقع پر پولیس کی کیا پیری چلے۔ پس ہو نہ ہو یہ امن جو دنیا میں قائم ہے کسی اور حاکم کا تصرف ہے۔

اور وہ کون ہے؟ خدا، جس کے ڈر سے پتا نہیں کھڑکنے پاتا۔ علاوہ بریں حاکمِ ظاہر وقوعِ جرم کے بعد ڈسٹرکٹ اور مجسٹریٹ جو چاہے سو بنے مگر وہ پر یونٹو تو کسی کام کا نہیں۔ حاکمِ ظاہر دریا کو منتہائے دریا پر روکنا چاہتا ہے اور وہ حاکمِ حقیقی اُس کے منبع پر جہاں سے دریا نکلا ہے یعنی حاکم ظاہر وقوعِ جرم کے بعد سزا دیتا ہے مجرم ایسی تدبیریں عمل میں لاتا ہے کہ عبرت ہو اور ارتکابِ جرم پر اقدام نہ کر سکیں اور وہ حاکمِ حقیقی ارادے کو جو ارتکابِ جرم کا محرک ہے روکتا اور مجرم کے خیال کی اصلاح کرتا ہے۔ جرم ایک درخت ہے گندہ خبیث جس سے آب و ہوا خراب ہوتی اور اُس کے پھلوں اور پتوں میں سمیت ہے۔ حاکمِ ظاہر اُس کی ٹہنیوں کو کاٹتا چھانٹتا رہتا اور اُس درخت خبیث کو بڑھنے نہیں دیتا۔ مگر حاکمِ حقیقی اس کو جڑ سے اُکھاڑتا اور معدوم کرتا ہے، اور دونوں کے نتیجوں میں جو فرق ہے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ خوفِ خدا نہ ہوتا تو ہم ہی لوگوں کے ہاتھوں سے دنیا کبھی کی معدوم ہو گئی ہوتی۔ اب سمجھے کہ خدا کو جاننے ماننے کی کیا ضرورت ہے؟ خدا کے جانے مانے بدون دُنیا چل ہی نہیں سکتی۔

سوال۔ لیکن ہم تو کوئی از غیبی سزا مجرم کو ہوتے نہیں دیکھتے۔

جواب۔ اِسی لیے تو خدا کو جاننے ماننے کی زیادہ ضرورت ہے۔ خدا نے آدم کی نسل کو روئے زمین پر پھیلایا اور آدم کی اولاد نے عقل کے زور سے جنگل اور پہاڑ اور خشکی اور تری سب پر اپنا تسلط بٹھایا۔ دوسری مخلوقات تابِ مقاومت نہ لا کر ان کی زد سے بچتی سرکتی گئی۔ بعینہٖ وہی حالت ہوئی جو ہندوستان کے اصلی باشندوں گونڈوں اور بھیلوں کی ہوئی کہ اُتر سے اُترے آریے، جوں جوں یہ بڑھتے گئے وہ بے چارے ہٹتے اور رہتے گئے۔ آدم کی اولاد نے بعض جانوروں کو تو مسخر کر لیا، چاہا اِن کو مارا اور کھا گئے اور چاہا اِن سے خدمت لی۔ اور جو قابو میں نہ آ سکے زمین پر سے بھاگ تو نہیں گئے، اور بھاگ کر جاتے تو کہاں جاتے، مگر ہمہ وقت آدمی سے خائف انسان کی صورت سے ترساں، اور ان کا خوف ہر اس بھی بجا ہے، آدمی کا بس چلے تو ان کی نسلوں کو معدوم کر دے۔ مگر کوئی بھاگ کر، کوئی اُڑ کر اور کوئی اپنے بل بوتے پر بھی آدمی کی مار سے بچے رہتے ہیں۔ آدمی کیا دوسری ہی مخلوقات کو نہیں دیکھ سکتا۔ نہیں اس کی طبیعت

ایسی حریص اور خود غرض واقع ہوئی ہو کہ وہ اپنے ابنائے جنس کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اگر ہر ایک آدمی کرنے پائے جو اُس کے دل میں آئے تو بہ سب آپس میں کٹ مریں۔ پس ضرورت واقع ہوئی کسی ضابط کی جو اِن کو روکے تھامے رہے اور وہ ضابطہ ہو حاکم وقت جس کی سزا کے ڈر سے کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا۔ مگر اس کا ربط ضبط انتظام کے لئے کافی نہ تھا تو خدا نے اُس نقصان کی تلافی یوں کی کہ ہر ایک فرد بشر کے دل میں خیال ڈال دیا کہ حاکمِ حقیقی خدا ہو اور وہ بھلائی سے خوش اور بُرائی سے ناراض ہوتا ہو۔ اور اگرچہ وہ اس زندگی میں بھی انسان کو سزا اور جزا کے دینے پر قادر ہو۔ مگر کسی مصلحت سے کبھی ایسا نہیں بھی ہوتا تو کچھ حرج کی بات نہیں کیوں کہ ہر ایک آدمی کو یقین ہو کہ مرے پیچھے ایک اور طرح کی زندگی شروع ہوگی اور جو کچھ اس دنیا میں کیا ہو بھلا یا بُرا اُس زندگی میں اُس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ ان خیر افخیر وان شر انشرا۔

عاقبت کا یقین انسان کی فطرت میں ہو

سوال - میں سمجھتا ہوں مذہب نے عاقبت کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا۔

جواب - اُلٹی بات۔ مذہب نے خیال عاقبت نہیں بلکہ خیالِ عاقبت نے مذہب کو پیدا کیا۔ اگر خیالِ عاقبت نہ ہو تو مذہب کی ضرورت ہی نہیں۔ ایسے لوگ بھی ہو گزرے ہیں اور شاید اب بھی ہوں جو عاقبت سے منکر ہیں تو وہ سوسائٹی کے بڑے خطرناک ممبر ہیں کیوں کہ حاکم ظاہر کے رعب و ادب کے سوائے ان پر کوئی روک نہیں وہ جب موقع پائیں (اور ایسے موقع کا ملنا ہی کیا مشکل ہو) جس کو چاہیں جان سے مار ڈالیں جس کا چاہیں گھر لوٹ لیں، جس کو چاہیں بے عزت کر دیں، غرض جس کو چاہیں دُنیا سے اُجاڑ دیں۔ یہ ایسے ہی لوگوں کا

مقولہ ہو جو قرآن میں نقل کیا گیا ہو۔ ان ھی الا حیوتنا الدنیا نموت ونحیی وما نحن بمبعوثین

سوال - اگر ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں اور ہیں اور ہو سکتے ہیں تو معلوم ہوا کہ خیالِ عاقبت انسان کی فطرت میں داخل نہیں۔ فطرت میں داخل ہوتا تو کوئی فردِ بشر اِس سے خالی نہ ہوتا۔

جواب۔ یہ شاید ان کے منہ کی کہن تھی ذٰلِکَ قَوْلُھُمْ بِاَفْوَاھِھِمْ اور ضد میں آکر انسان ایسی بہتیری باتیں بک دے سکتا ہے۔ مگر موٹی سی موٹی سمجھ کا آدمی بھی تو عاقبت اور نہ صرف عاقبت بلکہ عاقبت کی سزا اور جزا کا یقین رکھتا ہے۔ رہی یہ بات کہ کیوں رکھتا ہے اس کا وہی جواب ہے کہ انسان کے دل کی بناوٹ ہی اس طرح کی واقع ہوئی ہے۔

سوال۔ پھر دنیا میں جرائم کا انسداد کلّی کیوں نہیں ہو گیا؟

جواب۔ اس واسطے کہ جس طرح انسانوں کی شکلیں مختلف ہیں کہ ایک فٹ مربع سے کم ہی کم کی کیا تو بساط اور کروڑوں آدمی روئے زمین پر اب موجود ہیں اور خدا جانے کتنے سنکھ مہاسنکھ مر کھپ گئے اور کروڑوں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور معلوم نہیں کب تک پیدا ہوتے چلے جائیں گے ہم نے تو دیکھا کیسا سنا بھی نہیں کہ دو آدمی ایک ماں باپ کی اولاد بلکہ توام بھی صورت شکل میں ایسا یکدگر سے ہوں کہ پہچان نہ پڑتے ہوں۔ تو جس طرح آدمیوں کی شکلیں مختلف ہیں اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ ان کی طبیعتیں بھی مختلف واقع ہوئی ہیں کہ ایک کا مزاج دوسرے کے مزاج سے بالکل نہیں ملتا۔ اکثر تو ایسے ہیں کہ عاقبت کے خیال سے ارتکاب جرم پر اقدام نہیں کر سکتے۔ بعض دل کے ایسے بودے اور کم زور ہیں کہ وقتی ترغیبات سے مغلوب ہو کر جرم تو کر بیٹھتے ہیں مگر پھر اُن کو پشیمانی اور ندامت ہوتی ہے اور گناہ کا کفارہ دینے کے درپے ہوتے ہیں۔ مظلوم کو رضامند کرنے سے، اقرار جرم سے، اور اپنے اوپر اس کی سزا عائد کرانے سے جب تک گناہ کا کفارہ نہ دے لیں ان کو نفس لوّامہ چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ یہی خیال عاقبت ہے جس کو میں نے نفس لوّامہ سے تعبیر کیا۔ پھر بعض دل کے ایسے سخت ہوتے ہیں کہ زندگی بھر کفارے کو ٹالتے رہتے ہیں جب ملک الموت نے آکر ٹینٹوا دبایا تو سارا زہر اُگلنا پڑا۔ وہ کیا چیز ہے جو ایسے وقت میں ان کو اقرار جرم پر مجبور کرتی ہے؟ وہی نفس لوّامہ، وہی خیال عاقبت، وہی کانشنس جو چاہو کہہ لو۔ اس بات پر تو تمام آدمیوں کا اجماع سمجھو کہ اس ہستی کے بعد آدمی کو ایک اور ہستی ہونی ہے۔ اختلاف اگر ہے تو اس میں ہے

کہ وہ ہستی کیسی ہوگی کیوں کر ہوگی۔ سو یہ اختلاف فروعی ہے انتظام دنیا کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے وہ اسی قدر ہے کہ اس ہستی کے بعد ایک اور ہستی ہے اور وہ ہستی اس ہستی کی متمم ہے اور اس ہستی کا بننا بگڑنا موقوف ہے ہمارے کردار پر جو ہم اس ہستی میں کریں۔

سوال۔ تو یوں کہیے کہ آپ کے نزدیک سرے سے دین و مذہب ہی داخل فطرتِ انسانی ہے یعنی ہر شخص کی فطرت چاہتی ہے کہ وہ مذہب رکھتا ہو۔

جواب۔ بے شک۔ تم نے بہت ٹھیک سمجھا۔ دین اور فطرت ایک ہی چیز ہے اور میں کیا کہوں گا اور کوئی کیا کہے گا اور تم نے کیا سمجھا اور کوئی کیا سمجھے گا خود خدائے تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون (اللہ کی بناوٹ جس طرح پر لوگوں کو بنا دیا اللہ کی پیدائش کو کون بدلے۔ یہی ہے سیدھا دین لیکن افسوس ہے کہ اکثر لوگوں کو خبر نہیں) اس آیت کے لفظوں پر نظر کرو اس سے زیادہ صراحت اور کیا ہوگی؟ میرا بس چلے تو اس آیت کو تختیوں پر کندہ کرا رکھوں۔ مسلمان کا کوئی بچہ نہ ہو جس کے گلے میں تعویذ کی جگہ یہ تختی نہ پڑی ہو۔ اور خیر ہر مسلمان کے گلے میں نہ سہی، ہر ایک مسلمان کے دروازے اور نہ ہر ایک مسجد پر تو ضرور۔ بھلا کسی کی عقل جائز رکھ سکتی ہے کہ مثلاً پانی کی فطرت تو اس طرح پر واقع ہو کہ نشیب کی طرف بہے اور اس کو حکم دیا جائے الٹا بلندی کی طرف بڑھنے کا۔ پانی بلندی کی طرف چڑھا ہے یا چڑھ سکتا ہے؟ یہی حال دین کا ہے۔ دین کی کوئی چھوٹی سی بات بھی فطرتِ انسانی کے خلاف نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے ان اللہ لیس بظلام للعبید اور یہی فطرت دین کے کھوٹے کھرے غلط صحیح کی شناخت کی کسوٹی ہے۔

سوال۔ تو چاہیے کہ لوگ دین میں اختلاف نہ کریں۔

جواب۔ بے شک۔ چاہیے تو یہی کیوں کہ فطرت کے اعتبار سے آدمی سب یکساں۔ مگر نری فطرت ہی فطرت ہوتی تو کچھ جھگڑا نہ تھا۔ مصیبت یہ ہے کہ انسان ایک طرف مغلوب ہے فطرت کا اور دوسری طرف

مغلوب ہے گوناگوں خواہشوں کا، مغلوب ہے تعلیم و تربیت کا، مغلوب ہے سوسائٹی کا، مغلوب ہے رسم و عادت کا۔ چوپائی تو ہوا جل رہی ہے ہر طرف سے تھپیڑے پر تھپیڑے پڑے لگ رہے ہیں، کنکو اسید ھا رہے کیا خاک ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ　　　باز مے گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

سوال- یہ تو ظلم صریح ہے۔

جواب- توبہ کرو توبہ، خدا اور ظلم!!! استغفر اللہ تعالیٰ اللہ عما یقولون علوا کبیرا۔ آدمی کے پیچھے بھوک پیاس کا لگا دینا ظلم ہوتا اگر اس کو کھانا اور پانی بہم پہنچانے کی عقل نہ دی گئی ہوتی آدمی کو اس طرح کا مخلوق بنانا کہ ایک منٹ سانس لینے کو ہوا نہ ملے تو ہلاک ہو جائے ظلم تھا اگر ہوا کا ذخیرہ اس کے لیے مہیا نہ کیا گیا ہوتا آدمی کو گرمی سردی کا احساس بخشنا ظلم تھا اگر وہ اس سے بچنے کی تدبیر نہ کرسکتا۔ اسی طرح اس کو فطرت اور نفسانی خواہشوں اور تعلیم و ترتیب اور سوسائٹی اور رسم و عادت وغیرہ وغیرہ کا مغلوب بنایا ظلم ہوتا اگر اس بھول بھلیاں میں سے نکلنے کا اس کو رستہ نہ دکھایا جاتا۔

سوال- وہی رستہ تو میں ڈھونڈتا ہوں اور نہیں ملتا۔

جواب- ڈھونڈتے ہو مگر ڈھونڈنے کے طور سے نہیں۔

مذہب کا خلاصہ

سوال- وہ طور کیا ہے؟

جواب- وہی طور تو میں تم کو اتنی دیر سے بتا رہا ہوں۔ دین کا حال یہ ہے کہ جتنا اس کو چھانتے جاؤ ویسا ہی کرکرا ہوتا جاتا ہے۔ اور زیادہ کاوش کا ضروری نتیجہ ہے لامذہبی جس میں تم مبتلا ہو، ورنہ نہیں ہو تو آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں، ہوگے پر ہوگے۔ اس رستے کو چھوڑو دین تو تمام آدمیوں کے لیے ایک ہی ہے اس کے لیے اتنی ساری عقل کی ضرورت نہیں جتنی تم صرف کرنی چاہتے ہو یہ عقل تم کو ریاضی اور فلسفہ کے کام میں لانی چاہیئے۔ دین تو گنتی کی چند موٹی موٹی اور سیدھی سیدھی باتیں ہیں اور باتیں بھی ہیں تو یہی جن کے لیے

حجت اور دلیل کی کچھ ضرورت نہیں - اور جب آدمی لگا دین میں حجت اور دلیل ڈھونڈنے تو دین کے اعتبار سے اس کی حالت خطرناک ہے۔

سوال - عقل کے ہاتھوں سے تو مجبوری ہے۔

جواب - اگر عقل کو عقل کی حد میں رکھو اور اس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دو تو کچھ بھی مجبوری نہیں - دین میں عقل کی جولان یہیں تک ہے کہ خدا ہے اور جتنی عمدگی اور خوبی اور بڑائی کی صفتیں خیال میں آسکتی ہیں وہ سب اس میں ہیں۔ دنیا کا کارخانہ اس کے ہونے اور اس طرح کے ہونے پر دلالت کرتا اور ہمارا دل از خود اس بات کو مانتا ہے اور اس میں شکوک و اشتباہات پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر انسان اس طرح کا مخلوق بے مصرف نہیں کہ اس کو دنیا سے اور دنیا کو اس سے کسی طرح کا سروکار نہ ہو بلکہ خدا نے اس کو عقل دے کر انتظام دنیا میں بہت کچھ دخیل کر دیا ہے۔ خدا اور انسان اور دنیا کی مثال زمیندار اور کارندے اور علاقۂ زمینداری کی سی ہے۔ کارندہ علاقۂ زمینداری کا مالک تو نہیں مگر مالک کی رضا اور اجازت سے وہ علاقہ پر مسلّط ہے، چاہے آباد کرے چاہے اجاڑے۔ جس طرح ایک مالک چاہتا ہے کہ اس کا کارندہ بھلا مانس، خوش معاملہ، نیک نیت، دیانت دار، جفاکش ہو اور اس کے علاقہ زمینداری کا انتظام ٹھیک رکھے۔ اسی طرح خدا بھی چاہتا ہے کہ آدمی دنیا میں جہاں تک اس سے ہو سکے امن اور خوش حالی کو ترقی دے اور دنیا کی گاڑی میں جس کو ایک وقت خاص تک خدا کو چلانا منظور ہے کسی طرح پر روڑا نہ اٹکائے۔ بس یہی دین اور یہی مذہب ہے جس کا لوگوں نے اس قدر طومار بنا کر کھڑا کیا ہے۔

سوال - اتنا تو قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت میں آسکتا تھا۔

جواب - آسکنا کیسا آیا ہوا موجود ہی جو ہے۔ ورنہ من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ کے سوائے اس کے اور کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ اصل دین خدا کا جاننا ہے اور اتنا جاننا نجات کے لیے بس کرتا ہے۔ اور قرآن کی چھوٹی سی چھوٹی سورت کی جو تم نے کہی اس سے شاید تمہارا مطلب یہ ہے کہ دین ایک چھوٹے سے

چل سکتا تو اتنے بڑے قرآن کے نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کو اپنے طور کی باتوں میں سمجھو
کہ اقلیدس میں سطر ڈیڑھ سطر کا دعویٰ ہوتا ہے اور اس کے ثبوت ورق کے ورق۔ یا مثلاً کوئی ہم کو پوچھے کہ
یہ توانین دیوانی فوجداری اور مال غیرہ وغیرہ کیا چیز ہیں۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں تدابیر حفظ امن قرآن کا بھی
یہی حال ہے کہ اس کا لب لباب لا الہ الا اللہ ہے۔ اور اس کے سوائے جو کچھ ہے وہ اسی لا الہ الا اللہ کا ثبوت ہے
یا اس قسم کی باتیں ہیں جو اسی لا الہ الا اللہ پر متفرع ہوتیں اور اسی لا الہ الا اللہ سے مستنبط کی جاتیں۔
قرآن میں قصص ہیں، مواعظ ہیں، حکم ہیں، آداب ہیں، معاملات ہیں، عبادات ہیں، اوامر ہیں، نواہی ہیں۔
کیا چیز ہے جو قرآن میں نہیں لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین۔ قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو تمام افراد انسان
کی معاش و معاد دونوں کی درستی کے لیے روز قیامت تک بس کرتی ہے بشرطیکہ اس کو ٹھیک طور پر سمجھا اور اس پر عمل کیا جائے۔

عبادت کی لم

سوال۔ میں اس کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہتا ہوں۔

جواب۔ خدا کو جاننے پہچاننے کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ یاد ہوائی ایک بات تھی اس کان سنی اُس کان
نکال دی۔ آدمی خدا کو جانے پہچانے گا تو وہ اُس تعلق کو بھی ضرور سمجھے گا جو اس کو خدا کے ساتھ ہے اور وہ یہ بھی
دیکھے گا کہ خدا نے اس کو سراپا احتیاج پیدا کیا ہے۔ وہ ایک خاص طرح کی زندگی رکھتا ہے درد اور رنج سے
متاثر ہوتا ہے اس کی زندگی کی ضرورتیں کچھ تو خدا کی طرف سے مہیا کی گئی ہیں، جن کے لیے اس کو کسی طرح کی
زحمت نہیں اٹھانی پڑتی جیسے سانس لینے کو ہوا پینے کو پانی۔ اور کچھ ضرورتیں ایسی ہیں کہ اُن کا سامان تو موجود ہے
مگر اس کو کام میں لانے کے لیے تدبیر بھی درکار ہوتی ہے سو خدا نے اس کو اس تدبیر کا سلیقہ دیا ہے وہ یہ بھی دیکھے گا کہ
اس کو اس کثرت سے حاجتیں اور ضرورتیں لاحق ہوتی ہیں کہ اعوان و انصار کے بدون اس کا گزر نہیں
پس چار و ناچار اس کو سوسائٹی میں مل کر رہنا پڑتا ہے کہ یہ لوگوں کی اور لوگ اس مدد کریں۔ وہ
یہ بھی دیکھے گا کہ سوسائٹی کے لوگ بھی اسی طرح کے آدمی ہیں، وہ بھی ایسی ہی حاجتیں اسی کی سی طبیعت رکھتے ہیں

وہ بے کسی کے سکھائے آپ سے آپ معلوم کرلے گا کہ دُنیا میں ہزارہا قسم کی مخلوقات ہیں من جملہ اُن کے ایک یہ بھی ہی۔ مگر یہ دوسری مخلوقات سے بہت باتوں میں ممتاز ہی، اس کو ملائم سے خوشی پہنچتی ہی اور ناملائم سے رنج۔ بعض مواقع پر اس کو غصّہ آتا ہی اور بعض پر رحم۔ اس کی اکثر باتیں دوسرے جانوروں سے ملتی ہوئی ہیں، ان ہی کی طرح سوتا ان ہی کی طرح جاگتا۔ ان ہی کی طرح اس کو بھوک پیاس لگتی، مگر اس کی سی عقل کسی میں نہیں۔ اس کی طبیعت میں جہاں اور باتیں ہیں ایک احسان مندی بھی ہی کہ جب اس کا کوئی مطلب اٹکے اور کوئی اس کی مدد کرے تو اُس کا شکر گزار رہتا ہی۔ اس صفت پر متفرع ہیں تمام اقسامِ عبادات۔ کوئی سی بھی عبادت لو وہ ایک پیرایہ ہی اظہار احسان مندی کا۔ مثلاً نماز۔ اس کا ایک ایک رکن یعنی قیام اور رکوع اور سجود سب سے ظاہر ہوتا ہی تضرع اور ابتہال اور عجز۔ ان حرکات کے سوائے وہ جو قرأت ہی یعنی مُنہ سے کہنا پڑتا ہی وہ بھی خدا کی حمد وثنا ہی۔ دعا ہی، استغفار ہی، اپنی عاجزی اور حاجتمندی کا اظہار ہی، عبودیت کا اقرار ہی۔ یوں تو بظاہر انسان کے سب کام اسی کی تدبیر سے چلتے اور بہت سی باتوں میں اس کو اپنے ابنائے جنس سے مدد ملتی ہی لیکن ذرا تامل کرو تو معلوم ہو کہ ہم سب محض خدا کے فضل کے سہارے جیتے ہیں۔ ہزارہا چیزیں ہیں جن پر انسان کی زندگی موقوف ہی اور ان میں سے ایک چیز میں بھی انسان کو دخل نہیں۔ قرآن پر نظر کرو۔ اس کا ماحصل یہی پاؤ گے کہ انسان کو اس کی حاجتیں اور ضرورتیں بتا کر یہ دکھایا جاتا ہی کہ اس کو خدا نے سراپا حاجت پیدا کیا ہی۔ چونکہ وہ باوجودے کہ اس کو عقل بھی دی گئی ہی اور کسی قدر اختیار بھی رکھتا ہی اپنی تمام حاجتوں کے برلانے پر خود قادر نہیں تو جس نے اس کو حاجت کا احساس دیا اور احساس کے ساتھ اس کی تمام حاجتوں اور صرف یہی نہیں بلکہ آرام و آسائش کا سامان مہیا کیا وہی خدا ہی اور انسان کو اس کا بھی احساس ماننا چاہیئے۔ اگرچہ سارا قرآن اسی منوال پر واقع ہوا ہی مگر میں مثال کے طور پر دو مقام کی چند آیتیں پڑھتا ہوں۔

لہ امن خلق السموات والارض وانزل لکم من السماء ماء فانبتنا بہ حدائق ذات بہجۃ ما کان لکم ان تنبتوا

؛ بھلا کس نے زمین آسمان کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسا کر ہم نے خوشنما باغیچے اگائے یہ درخت (بقیہ نوٹ بر صفحہ آیندہ)

شجرها ءاله مع الله بل هم قوم يعدلون ؁ امن جعل الارض قرارا وجعل خلالها انهارا وجعل لها رواسی

وجعل بين البحرين حاجزا ءاله مع الله بل اكثرهم لا يعلمون ؁ امن يجيب المضطر اذا دعاه و

يكشف السوء ويجعلكم خلفاء الارض ءاله مع الله قليلا ما تذكرون ؁ امن يهديكم فى ظلمات البر والبحر

ومن يرسل الرياح بشرا بين يدى رحمته ءاله مع الله تعالى الله عما يشركون ؁ امن يبدؤا الخلق ثم يعيده

ومن يرزقكم من السماء والارض ءاله مع الله قل هاتوا برهانكم ان كنتم صدقين دوسری جگہ فرماتے ہیں

قل ارءيتم ان جعل الله عليكم الليل سرمدا الى يوم القيمة من اله غير الله ياتيكم بضياء افلا تسمعون

قل ارءيتم ان جعل الله عليكم النهار سرمدا الى يوم القيمة من اله غير الله ياتيكم بليل تسكنون فيه افلا تبصرون

ومن رحمته جعل لكم الليل والنهار لتسكنوا فيه ولتبتغوا من فضله ولعلكم تشكرون ۔ یاد رکھو کہ یہ میں نے

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) تم تو نہیں اُگا سکتے کیا اس پر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے مگر یہ لوگ ہی سیدھے رستے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ ۶۲ بھلا کس نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا اور اس میں دریا بہائے اور اس پر پہاڑوں کے لنگر ڈالے اور دو دریاؤں میں روک قائم کی۔ تو کیا اس پر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے مگر ان لوگوں میں سے اکثر بے خبر ہیں ۶۳ بھلا کون ہے کہ جب کوئی بے قرار ہو کر اس کو بلائے تو وہ اس کی فریاد کو سنے اور مصیبت کو دور کر دے اور تم کو فرمانروائے روئے زمین بنائے تو کیا اس پر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔ تم لوگ ایسی باتوں کو خیال کرتے ہو ۶۴ بھلا کون ہے جو خشکی اور تری کے اندھیروں میں تم کو رستہ دکھائے اور کون باران رحمت سے پہلے ہوا بھیجتا ہے کہ وہ مینہ کی خوشخبری دے۔ تو کیا اس پر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے خدا کی شان ان چیزوں سے بہت اونچی ہے جن کو اس کا شریک ٹھیراتے ہیں۔ ۶۵ بھلا کون ہے جو پہلے پہل پیدا کرکے اس کو پھر اپنے پاس بلائے اور کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کہ اپنے دعوے میں سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔ ۶۶ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کہ بھلا دیکھو تو اگر خدا قیامت تک ہمیشہ کے لئے رات کو تم پر ڈھانکے رکھے تو سوائے خدا کے کوئی اور معبود ہے کہ تم کو روشنی پہنچائے کیا ایسی باتیں نہیں سنتے ۶۷ اے پیغمبر لوگوں سے کہو کہ اگر خدا قیامت تک ہمیشہ کے لئے تم پر دن ہی نکالے رہے تو سوائے خدا کے کوئی اور معبود ہے کہ تمہارے آرام کے لئے رات کو لائے کیا تم اس نمونہ قدرت کو نہیں دیکھتے۔ اور یہ اسی کی مہربانی ہے کہ تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا تاکہ رات کو آرام پاؤ اور دن کو اسی کے کرم یعنی روزی کی جستجو کرو۔ اور اس کا احسان مانو۔

نمونے کے طور پر چند آیتیں پڑھ دی ہیں ورنہ سارے قرآن کی یہی ایک لَے ہے غرض سب سے پہلے انسان نے اپنے آپ کو جانا۔ اپنے آپ کو جاننے سے لازم آیا خدا کا جاننا خدا کو جاننے سے لازم آیا اُس کے احسانات کا ماننا یعنی اُس کی عبادت کرنا۔ اِس کو میں نصف دین قرار دیتا ہوں۔ اور اس میں ہرگز کسی طرح کی پیچیدگی نہیں اور نہ اس میں کسی طرح کا شک و شبہ ہو سکتا ہے اور ہو تو بیان کرو۔

سوال۔ بھلا اور دین کا دوسرا نصف ؟

جواب۔ دوسرا نصف ہے لوگوں کے باہمی معاملات کہ ان کو ایک دوسرے کے بدون بن نہیں آتی تو ایک قانون ہونا چاہیئے جو سوسائٹی میں امن کو قائم رکھے۔ یہ ہے دوسرا نصف دین اور اسی کا نام ہے شرع۔

سوال۔ میں اس کا بھی ایک خلاصہ معلوم کرنا چاہتا ہوں جامع اور مانع۔

جواب۔ اس کا خلاصہ ہے آنچہ برخود نہ پسندی بر دیگرے پسند۔ اس کے لیے بھی دلیل اور حجت درکار نہیں آدمی کا دل ہی خدا نے اس طرح کا بنایا ہے کہ وہ فوراً اس بات کو تسلیم کرے گا کہ اس قاعدے کے بدون دُنیا میں امن قائم رہ نہیں سکتا۔ اور یہی بھی انصاف کی بات۔ خدا کے ہونے پر جہان اور بے شمار دلائل ہیں اور اُن میں سے ایک دلیل دُنیا کا انتظام بھی ہے۔ اولم ینظروا فی ملکوت السموٰت والارض[۱]۔ پروردگارِ عالم نے دُنیا کے انتظام کے لیے ایسے عمدہ اصول قرار دیئے ہیں کہ اُن سے بہتر کسی کے خیال میں آ نہیں سکتے۔ جو کوئی ان اصول کو توڑتا ہے یہی نہیں کہ دوسرے کو نقصان پہنچاتا ہے بلکہ خود اپنے تئیں بھی۔ اس پر بھی لوگوں سے بے اعتدالیاں ہوتی ہیں اور یہ جتنے فسادات دنیا میں دیکھتے ہو انسان کی اسی کم زوری اور ناعاقبت اندیشی سے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ انجام تو سوچتا نہیں اور خواہشِ نفسانی کا مغلوب ہو کر قانونِ الٰہی کو توڑ بیٹھتا ہے، آپ بھی پریشان ہوتا اور دوسروں کو بھی پریشان کرتا۔ اس قانون کے نافذ کرنے کی خدمت دو قسم کے لوگوں کو سپرد ہے اول انبیاء علیہم السلام، دوسرے حکّامِ وقت۔ ان دونوں میں انبیاء کے اختیارات

---

[۱] کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کی سلطنت کے انتظام پر نظر نہیں کی۔

زیادہ وسیع ہیں۔ حاکم وقت صرف ظاہر پر حکمرانی کرتا ہے اور پیغمبر ظاہر و باطن دونوں پر۔ حاکم وقت شاخ کو لیتا ہے اور پیغمبر جڑ کو بلکہ جڑ کی جڑ کو۔ کیونکہ پیغمبر خدا کی معرفت سکھاتا ہے جو منبع ہے تمام نیکیوں اور محاسن اخلاق کا۔ حاکم وقت کی روک مثلاً آدمی کی زبان پر ہے کہ کسی کو گالی نہ دے، ہاتھ پر ہے کہ کسی کو مارے نہیں اور پیغمبر کی روک آدمی کے دل پر ہے کہ اُس میں بُرا ارادہ پیدا نہ ہو۔ شرائع ملکی اور وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے بدلتی بھی رہتی ہیں مگر ان شرائع کی غرض و غایت نہ کبھی بدلی ہے اور نہ قیامت تک بدلے گی۔ وہ کیا ہے دُنیا میں امن کا قائم رکھنا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ پیغمبروں کا دین ایک ہے اور شریعتیں مختلف اس کے یہی معنی ہیں جو میں نے بیان کیے

سوال۔ آپ نے تو دین کا ایک ایسا انوکھا رستہ اختیار کیا ہے کہ میں اس میں کلام کرنے کی گنجائش ہی نہیں پاتا۔ اگر یہی دین ہے تو آپ کا نرالا دین ہے۔ یہ تو فرمائیے کہ دُنیا میں کوئی اور بھی اس طرح کے عقیدے رکھتا ہے یا آپ پر کوئی خاص وحی نازل ہوئی ہے۔

جواب۔ میں نے تو کوئی انوکھا رستہ اختیار نہیں کیا۔ ہماری جمع پونجی جو کچھ سمجھو یہ تھوڑی سی عقل ہے جو خدا نے محض اپنے فضل و کرم سے عطا فرمائی ہے۔ معلوم ہو کہ عقل جو ہم کو دی گئی ہے ادھوری ہے ناقص ہے ناتمام ہے۔ ہزارہا باتیں ہیں جن کو انسان نہیں سمجھتا اور نہیں سمجھ سکتا۔ مگر جتنی جس کو سمجھ دی گئی ہے وتنی ہی اُس کی ذمہ داری ہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا۔ سو ایک تو ہم عقل پر اس کی بساط سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے اور بڑے شکر کی جگہ ہے کہ اس سے دل کو بڑی راحت پہنچتی اور طبیعت مطمئن رہتی ہے دوسرے لوگوں کے دین مذہب سے تعلق نہیں رکھتے کہ وہ کیا سمجھتے اور کیا کرتے اس واسطے کہ ہم ان کے محتسب نہیں اور نہ ہم سے دوسروں کے مذہب کی بازپرس ہونی ہے۔ ہم کو اپنے ہی نفس کے احتساب سے فرصت نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم بنائے گئے آدمی اور ہم کو نیک بد کی تمیز دی گئی اور سمجھا دیا گیا وہ رستہ جس پر ہم کو چلنا چاہیئے تھا، مگر ہم نے اپنے دل کے کھوٹ اپنی طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے وہ وہ حرکتیں کیں جو ایک جانور کے لیے بھی موجب شرم ہیں۔

سوال - آپ کی بات کا بھی کچھ ٹھکانا نہیں۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی آپ انسان کو خلیفۃ اللہ اور اشرف المخلوقات کیا اور کیا بنا رہے تھے۔ یا اب اِس کو جانوروں سے بھی گیا گزرا ہوا کر دیا۔

جواب - تم نے وہ قطعہ نہیں سُنا۔

آدمی زادہ طرفہ معجونیست　　　از ملائک سرشتہ وز حیواں

گر کند میل ایں شود کم زیں　　　ور رود سوئے آں شود بہ ازاں

سوال - یہ دو متضاد باتیں کیسی۔

جواب - بس یہ اللہ کی خلقت کہ آدمی کو دونوں طرح کی قابلیتیں دیں۔ اس کو فاعل مختار کیا۔ چاہے معراج الکمال انسانیت پر ترقی کرے کہ یہی سر کا فرشتہ بنتا ہو اور چاہے اسفل السافلین حیوانیت میں اندھے منہ گر پڑے۔

سوال - انسان کو ایسی کشمکش میں ڈالنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

جواب - اب تم لگے خدائی میں دخل دینے ع خدا کی باتیں خدا ہی جانے ؎

رموز مملکت خویش خسرواں دانند　　　گدائے گوشہ نشینے تو حافظا مخروش

یہی وہ کُریدہے جو اکثروں کو بھٹکاتی اور بے چین رکھتی ہے اور جب تک یہ لت نہیں چھوٹتی کوئی آدمی دین کی طرف سے مطمئن ہو نہیں سکتا۔

سوال - مگر طبیعت کو کیا کیا جائے۔

جواب - یہ بالکل سچ ہے۔ ہم نے بھی اس کے ہاتھوں سے بڑی بڑی پریشانیاں اُٹھائی ہیں۔ یہ بھی چاہا کہ اس خیال ہی کو دل میں نہ آنے دیں، وہ بھی نہ ہو سکا۔ اور خیال آیا تو اس کے ساتھ طرح طرح کے خدشات۔ آخر بڑے غور کے بعد اب کہیں جا کر طبیعت ٹھکانے سے ہوئی۔

شریعت نصف دین ہے

سوال - یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔

جواب- چاہتے ہو تو خدا نے چاہا ہو کر بھی رہے گا۔ جو ڈھونڈھتا ہی سو پاتا ہی، جو دروازہ کھٹکھٹاتا ہی وہ مکان کے اندر بھی آتا ہی۔ مگر میرے سمجھنے میں تو اس کا رستہ یہی ہی کہ آدمی اپنی حقیقت سمجھے اور دوسروں سے سروکار نہ رکھے۔

سوال- یہ کیوں کر ہو سکتا ہی کہ دوسروں سے سروکار نہ رکھے؟ دوسروں کے بدون دنیا چل بھی سکتی ہی؟

جواب- شاید یہ میرے بیان کا قصور ہی کہ تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔ بے شک دُنیا میں آدمی اس لیے نہیں پیدا کیا گیا کہ دوسروں سے سروکار نہ رکھے۔ دوسروں کے ساتھ سروکار رکھے بدون اس کو بن نہیں آتی بلکہ دوسروں کے ساتھ سروکار رکھنا اسی کو تو میں نے دوسرا نصف دین قرار دے رکھا ہی یعنی لوگوں کے باہمی معاملات۔ اور ظاہر ہی کہ بے تعلقی کی صورت میں معاملات ہو ہی نہیں سکتے۔ میں نے عبادت کی لِم تم کو سمجھائی تھی؟

سوال- ہاں اور دل بھی اس کو تسلیم کرتا ہی۔ پھر؟

جواب- بات یہ ہی کہ جب ہم سرتا پا حاجت ہیں اور ہماری حاجتیں بعض تو ایسی ہیں جو خود خدا کی طرف سے مہیا کی گئی ہیں اور اُن میں سے کسی مخلوق کو دخل نہیں جیسے ہوا اور پانی۔ اور بعض ایسی ہیں جن میں ہماری یا ہمارے ابنائے جنس کی تدبیر کو دخل ہی تو وہ بھی حقیقت میں خدا ہی کی طرف سے ہیں، جیسے غلّہ کہ آدمی اتنا تو کرتا ہی اور اتنا ہی کرتا ہی اور اتنا ہی کر سکتا ہی کہ زمین جوت کر بیج ڈال دیا جب اناج طیار ہوا کاٹ گاہ کر گھر میں رکھ لیا۔ مگر آدمی کو جوتنے بونے کاٹنے گاہنے کا سلیقہ کس نے سکھایا؟ خدا نے۔ زمین میں اناج کے پیدا کرنے کی صلاحیت کہاں سے آئی؟ خدا کے کرنے سے۔ تو اس طور پر جتنی حاجتیں ظاہر میں ایسی دکھائی دیتی ہیں کہ اُن کو ہم اور ہمارے ابنائے جنس مہیا کرتے ہیں وہ بھی حقیقت میں خدا ہی کی طرف سے ہیں۔ پس جو کچھ ہم رکھتے ہیں جو کچھ ہم کو ملتا ہی خدا کا فضل وُسی کا احسان ہی [۱]

وما بکم من نعمۃ فمن اللہ ثم اذا مسکم الضر فالیہ تجأرون اور ہم اس قدر اس کے احسانات میں دبے ہوئے ہیں

[۱] اور جو نعمت تم کو حاصل ہی سب اللہ ہی کی دی ہوئی ہی اور جب مصیبت پڑتی ہی تو اُسی کے آگے گڑگڑاتے ہیں۔

کہ اگر ہمہ وقت اُس کی شکر گزاری میں لگے رہیں تو اس کی مہربانیوں کا ایک شمہ بھی تو ادا نہیں کر سکتے۔ شیخ سعدی نے اس خیال کو کیسے عمدہ پیرایے میں ادا کیا ہے۔ "ہر نفسے کہ فرو میرود ممدحیات ست و چوں برمی آید مفرّح ذات پس در ہر نفس دو نعمت موجود ست و بر ہر نعمت شکرے واجب"۔ یعنی ایک ادنیٰ سی بات ہے سانس جس کی طرف کبھی ہمارا ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا۔ لیکن ذرا رک جائے تو دیکھو انسان کا کیا حال ہوتا ہے۔ ضیق النفس کے بیماروں کو نہیں دیکھا۔ گھنٹے دو گھنٹے کے دورے میں مُردے سے بدتر ہو جاتے ہیں۔ پھانسی کیا چیز ہے؟ گلا گھونٹ کر سانس روک دیا۔ تڑپ تڑپ کر جان نکل گئی۔ اسی قسم کے اور خیال ہیں مثلاً قطعہ

چار طبع مخالف و سرکش | چند روزے بودند باہم خوش
چوں یکے زیں چہار شد غالب | جان شیریں برآید از قالب
مایہ عیش آدمی شکم ست | تا بتدریج میرود چہ غم ست
گر ببندد چناں کہ نکشاید | گو دل از عمر برکند شاید
در کشاید چناں کہ نتواں بست | گو بشو از حیات دنیا دست

ایک بادشاہ کو اپنی سلطنت کا بڑا گھمنڈ تھا۔ ایک بزرگ کسی طرح پر اُس تک پہنچے اور موقع پا کر کہا کہ بھلا یہ تو فرمایئے کہ اگر خدانخواستہ آپ کا پیشاب بند ہو جائے تو آپ اس شکایت کے دور ہونے کے لیے کہاں تک خرچ کریں۔ بادشاہ نے ذرا سوچ کر کہا کہ نصف سلطنت پھر اُس بزرگ نے کہا کہ بھلا اگر خدانخواستہ جاری ہو کر بند نہ ہوا تو اُس صورت میں؟ بادشاہ نے کہا دوسرا نصف سلطنت۔ بزرگ نے کہا کہ بس آپ کی سلطنت کی حقیقت ہے کہ موت کی ایک دھار اس کی قیمت ہے۔ یہ تو اُن لوگوں کے مقولے ہیں جن کو خدا نے اپنی اور دنیا کی حقیقت جاننے بوجھنے کی سمجھ دی تھی۔ اور میں خیال کیا کرتا ہوں کہ انسان کے جسم میں بے شمار مسامات ہیں اور ہر مسام میں سیکڑوں طرح کے روگ پیدا ہو سکتے ہیں

اور ایک ایک روگ زندگی کے تلخ کر دینے کے لیئے بس کرتا ہی اور ہم جو اِن تمام آفتوں سے محفوظ ہیں تو نہ اپنی تدبیر سے ؟ ہماری تدبیر ہی کیا ہی اگھا لیا اور سو رہے۔ کھاتے تو کھا لیا اور یہ نہ جانا کہ یہ غذا کیوں کر پیدا ہوئی۔ اور کس طرح جزو بدن بنی۔ قطعہ

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند　　تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمان بردار　　شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

غرض ہزارہا نعمتیں ہیں جن کا ہم کو شعور بھی نہیں ہوتا وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا حق شناسی اور مروت اور وفاداری اور انسانیت تو اس کی مقتضی تھی کہ ہمہ وقت اُسی کی یادگاری میں لگے رہتے مگر ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ جتنا ہوسکے جتنی دیر ہوسکے۔ عبادت کا یہ ایک پہلو ہی۔ اس کے ذریعے سے ہم اتنی بات ظاہر کرسکتے ہیں کہ ہم احسان فراموش نہیں ہیں الانسان عبید الاحسان۔ لیکن ہم کو اِس حد پر ٹھیرنا چاہیئے نہیں۔ دُنیا کا دستور ہی کہ کوئی ہمارے ساتھ سلوک کرے تو ہم اس کے ساتھ سلوک کریں ہل جزاء الاحسان الا الاحسان لیکن ہمارے اور خدا کے درمیان مشکل یہ آکر پڑی ہی کہ ہم خدا کے ساتھ کوئی احسان نہیں کرسکتے اُس کو ہمارے احسان کی ضرورت نہیں۔ وہ ہی بے نیاز مستغنی۔ لیکن ہاں ایک صورت ہی جس کو جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا کے قاعدے سے احسان کہا جاسکتا ہی گو وہ حقیقت میں احسان نہیں ہی اور ہل جزاء الاحسان الا الاحسان میں آخر کے احسان سے اِسی طرح کا احسان مراد ہی۔ اب یہ تم بتاؤ کہ ہم بندے خدا کے ساتھ کیا احسان کرسکتے ہیں ؟

سوال۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔

جواب۔ تمہاری کیا بہتوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اتا پتا بتاؤں تو تم اِس پہیلی کو جلد بوجھ لوگے ایک ملکہ وکٹوریا ہی اور ایک ہم ہیں۔ ملکہ کے ہم پر سیکڑوں احسان ہیں جن کا خلاصہ یہ ہی کہ اس کی عملداری میں ہم آرام سے بیٹھے ہیں، امن ہی، انصاف ہی، ریل ہی، تار ہی، شفاخانے ہیں، مدرسے ہیں،

نہریں ہیں، منی آڈر ہیں، ویلوپے ایبل ہیں، کلیں ہیں، دخانی جہاز ہیں، تجارت ہے۔ غرض وکٹوریا کا عہد ہے
اور ہمارے لیئے ہندوستان جنت ہے۔ اب فرماؤ کہ ملکہ کے ان تمام احسانات کا کچھ بدلہ دینا یا نہ دینا ؟ دینا اور
ضرور دینا۔ مگر ہم اس کو کیا بدلہ دے سکتے ہیں۔ یہی کہ ہم اس کے اطاعت گزار و وفادار خیرخواہ احسان مند
رعایا ہو کر رہیں۔ اسی طرح کا برتاؤ ہمارا خدا کے ساتھ ہونا چاہیئے کہ وکٹوریا کے دل میں نیکی کا ڈالنا،
اُس کو انتظام کا سلیقہ سکھانا، اُس کو رعیت پروری اور انصاف کی توفیق دینا، اُس کو مملکت ہندیہ
مسلط کرنا یہ سب اُسی کے احسانات ہیں۔ ورنہ بے خدا کی امداد کے ملکہ بیچاری کیا کرتی اور کوئی کیا کر سکتا ہے
یہ اسی کے تصرفاتِ قدرت ہیں کہ کروڑوں دلوں کو ایک عورت ذات کے ہاتھ میں مسخر کر رکھا ہے کہ
آپ ہزاروں کوس دور بیٹھی ہے اور یہاں پتہ تک نہیں کھڑکنے پاتا۔ جس طرح ملکہ کی وفاداری کی شرط
یہ ہے کہ ہم اس کے انتظام میں رخنہ انداز نہ ہوں اسی طرح ہمارے بندہ ہونے کی شرط یہ ہے کہ ہم خدا کے انتظام میں
فتور نہ ڈالیں اور جہاں تک ہم سے ہو سکے اور ہم ہیں ہی کس قابل مگر خیر جہاں تک ہو سکے اُس کے انتظام کو
رونق دیں، اس میں سہولت اور عمدگی پیدا کریں۔ بس یہ ہے ساری شریعت کا خلاصہ۔ شریعت کے جتنے
احکام ہیں وقت کے لحاظ سے، ملک کے لحاظ سے، لوگوں کی ضرورتوں اُن کی طبائع اور رسم و عادات کے لحاظ سے،
لوگوں کے باہمی معاملات درست رکھنے اور انتظام دنیا کو آسانی کے ساتھ چلنے دینے کی غرض سے بنائے
گئے ہیں۔ ان میں سے بعض کی مصلحتوں کو ہم سمجھتے اور بعض کی نہیں۔ اور یہ دنیا کے قوانین کیا ہیں یہ بھی
ایک طرح کی شریعت ہے اور اس شریعت کی غرض بھی وہی ہے دنیا میں امن و عافیت کا قائم رکھنا۔ یہی خیال ہے
جس کو لوگوں نے الخلق عیال اللہ کے پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔ یعنی خدا تو جورو بچے نہیں رکھتا اور اُس کی
شان اس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ مگر ہم جو اُس کا برتاؤ خلقت کے ساتھ دیکھتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
اُس کو مخلوقات کی ایسی پرداخت منظور ہے جیسی ہم میں سے کسی کو اپنے عیال کی ہوتی ہے تو ہم کو
چاہیئے کہ خلق اللہ کو عیال اللہ سمجھ کر ان کا پاس کریں۔ اور دنیا میں جو مصیبت ہے ضرور اُس میں کوئی مصلحت

مضمر ہوگی اور عجب نہیں کہ اُس مصلحت میں یہ بھی ہو کہ ہم کو اظہار شکر کا موقع دیا جائے اور وہ نہیں ہو مگر ابنائے جنس کی مصیبت میں کام آنا اُن کی حالت کے بہتر کرنے میں کوشش کرنا۔ یہ متعارف عبادتیں جو وضع ہوئی ہیں اِن کی غرض یہ ہو کہ ہم خدا کے خیال کو تازہ رکھیں مگر صرف خیال کو تازہ رکھنا کوئی چیز نہیں۔ اس کا نتیجہ ہونا چاہیئے عیال اللہ کو نفع پہچانا۔ لوگ زینے کی پہلی سیڑھی پر اٹک ٹھٹک جاتے ہیں آگے کو قدم نہیں بڑھاتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ زینہ ٹھیرنے کی جگہ نہیں۔ تو وہ جو میں نے کہا تھا کہ دین دار بننے کا رستہ یہ ہو کہ آدمی اپنی حقیقت کو سمجھے اور دوسروں کے سر و کار نہ رکھے اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ آدمی دُنیا سے بے تعلق ہو رہے بلکہ غرض یہ تھی کہ دوسروں کے دین و مذہب کے پیچھے نہ پڑے۔

عاقبت

سوال۔ ادہو۔ اس پر تو ایک بڑا سخت اعتراض وارد ہوتا ہو کہ دین کی ساری عمارت دھڑام سے گر پڑتی ہو۔ لیکن اس اعتراض کے بیان کرنے سے پہلے میں ایک اور خدشہ آپ سے رفع کرانا چاہتا ہوں کہ دُنیا میں جو آدمی سے گناہ سرزد ہوتے ہیں میں مانتا ہوں کہ خود آدمی کا نفس اُن کے لیئے اُس کو ملامت کرتا ہو اور جب تک وہ اُس گناہ کی سزا نہ بھگت لے اُس کو تسکین نہیں ہوتی۔ اور اسی سے اُس کو یہ خیال پیدا ہوتا ہو کہ مرے پیچھے بھی اُس کو ایک طرح کی ہستی ہوگی اور اُس ہستی میں اُس کو اپنے کیئے کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ یہ ہستی عارضی محدود چند روزہ، اور وہ ہستی ابدی دائمی تو سزا بمناسبت جرم تو نہ ہوئی۔ غرض وعید خالدین فیہا کے بارے میں میں بیان شافی چاہتا ہوں۔

جواب۔ بیان شافی تو یہی ہو کہ اس طرح کے خدشات کو ذہن میں نہ آنے دو اُس ہستی یعنی عاقبت کے بارے میں ہماری ذاتی معلومات تو کچھ بھی نہیں اور کچھ ہو بھی نہیں سکتی۔ اس پر بھی دل بول رہا ہو کہ کیسی ہی ہو اور کسی طرح کی ہو مگر ہے ضرور۔ ہاں خدا نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے اُس ہستی کے بعض حالات جن کا ظاہر کرنا اُس نے مناسب سمجھا بیان فرمائے ہیں۔ اُن کو یقین کر لینے کے سوائے چارہ نہیں۔ اُن حالات کی

زیادہ تفتیش کرنا ہماری عقل کی رسائی سے باہر ہے اور ہمارے حق میں کچھ بھی مفید نہیں۔ ہمارے
لیئے اتنا بس کرتا ہے کہ عاقبت اور آخرت ہے اور دار الجزا ہے۔ اور اس کو بے کسی کے بتائے سمجھائے ہم باور
کرتے ہیں۔ اور خلود اور ہمیشگی کی نسبت جو تم کو خدشہ واقع ہوا وہ تو کچھ بات نہیں۔ ہم دنیا میں بھی
دیکھتے ہیں کہ آدمی ایک غلطی کرتا ہے اور وہ غلطی شاید اس نے چند منٹ ہیں کی مگر اس کا خمیازہ اس کو عمر بھر
بلکہ شاید اس کی نسلوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے مثلاً ایک آدمی نے سنکھیا کھالی۔ اگر وہ مر انہیں تو جب تک
جیئے گا اپنے کیئے کو روئے گا اور عجب نہیں سنکھیا کا اثر اس کی نسلوں میں بھی جاری اور ساری رہے۔
دنیاوی سزاؤں میں پھانسی یا دائم الحبس یا کسی مدت کی قید یا یہ کیا ہے۔ اگر یہ قرین انصاف ہے تو خلدین فیہا
کیوں قرین انصاف نہ ہو؟ تم اُس وقت پر نظر کرتے ہو جو ارتکاب جرم میں صرف ہو۔ نفس جرم کی
بدی اور اُس کے نتائج پر۔ اور وقت کی کہو تو چوری میں زیادہ دیر لگتی ہے اور آدمی کو ٹھکی کے بجائے میں
مار دیا جا سکتا ہے، تو کیا آدمی کا ہلاک کرنا چوری سے بھی گیا گزرا ہوا؟ قرار داد سزا کے لیئے جرموں کا صحیح
اندازہ کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ خدا جانے کتنی مصلحتوں پر نظر رکھنی ہوتی ہے جن کو مقنن ہی خوب سمجھتا ہے
حضرت نوحؑ جب اپنی قوم کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے تو انہوں نے دعا کی رب لا تذر علی الارض
من الکافرین دیارا انک ان تذرھم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجرا کفارا اس کی وجہ یہی تھی کہ اُن کی
امت کا مرض علاج پذیر نہ تھا اور وہ تھے طبیب حاذق۔ سمجھ چکے تھے کہ یہ تو کیا اچھے ہوں گے ان کی جو
نسلیں چلیں گی وہ بھی ان ہی کی طرح روگی ہوں گی۔ اور روگ بھی متعدی۔ اس سے بہتر ہے کہ یہ صنف ہی
معدوم کر دی جائے۔ اور یہ جو دنیا میں شرافت نسب کی قدر کی جاتی ہے اور کہتے ہیں "اصل بد از خطا
خطا نکند" آخر اس کی بھی کچھ نہ کچھ تو اصلیت ہے ہی۔ حیوانات اور نباتات تک میں اس قاعدے کا

---

[1] اے میرے پروردگار (ان) کافروں میں سے کسی متنفس کو بھی (زندہ) نہ چھوڑ (کہ) روئے زمین پر بستا
نظر آئے) کیونکہ اگر تو ان کو رہنے دے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ (ہی) کریں گے اور ان سے جو
نسل چلے گی وہ بھی بدکار (اور) کٹّے کافر ہی ہوں گے۔

عملدرآمد دیکھ لیتا ہی تو آدمی میں کیوں نہ ہو۔ اگرچہ میں نے تم کو سمجھانے کے طور پر اتنا کہا مگر پھر میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ طبیعت کی یہ افتاد اچھی نہیں۔ اِس خبط کو سر سے نکالو کیونکہ یہی گمراہی کی جڑ ہی۔

مذہبی مباحثہ بڑی بُری بات ہی

اچھا وہ اعتراض تو فرمائیے جس کی نسبت آپ کہتے تھے کہ دین کی ساری عمارت دھڑام سے گر پڑتی ہی۔

سوال۔ ہاں آپ نے کہا تھا نہ کہ آدمی کو چاہیئے دوسرے کے دین و مذہب سے سروکار نہ رکھے۔ اول تو یہ ہو ہی کیسے سکتا ہی۔ آدمی آدمی سے ملیگا، ایک جگہ رہے سہے گا تو کیوں کر ممکن ہو کہ ایک کے خیالات ایک پر ظاہر نہ ہوں۔ اور یہی تو دُنیا میں آگہی پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ ہی۔ اور اگر آدمی دوسروں کے خیالات سے استفادہ نہ کرے تو وہ کسی بات میں بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اور جو شخص اپنی منفرد رائے پر اعتماد کرتا اور دوسروں کی بات کو سُننا نہیں چاہتا، میں نہیں سمجھتا کہ وہ غلطیوں سے محفوظ رہ سکتا ہی۔

جواب۔ تمہارا یہ خیال ایک حد تک صحیح ہی۔ بے شک لوگوں میں جس طرح ضرورتوں کا مبادلہ ہوتا ہی خیالات کا بھی ہوتا ہی اور اغراض تمدن میں سے یہ غرض سب سے عمدہ اور سب سے ضروری ہی۔ مگر تم نے اس خیال کو کسی قدر زیادہ وسیع کر دیا ہی۔ بہت سی معلومات اس قسم کی ہیں کہ ہم کو اُس کے بارے میں لوگوں سے پوچھنے گچھنے اور اُن کی رائے دریافت کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ مثلاً روز روشن میں آفتاب چمک رہا ہی اور ہم اُس کو اپنی آنکھ سے چمکتا ہوا دیکھتے ہیں تو ہم لوگوں سے پوچھتے نہیں پھرتے کہ آفتاب چمک رہا ہی یا نہیں ہم کو بھوک لگی ہی تو ہم کو کسی سے صلاح لینے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ بھوک ہی یا نہیں اور ہی تو اس خواہش کے پورا کرنے کی کیا تدبیر ہی۔ دو اور دو کے چار ہونے میں ہم کو کچھ تردد نہیں ہوتا۔ دین و مذہب بھی میرے نزدیک اسی قسم کی ایک بات ہی۔ جس طرح پیٹ میں بھوک کا تقاضا پیدا ہوتا اسی طرح دل میں دین و مذہب کا اور جس طرح وہ شخص جس کو بھوک لگی ہی جانتا ہی کہ یہ خواہش کیوں کر پوری ہوگی اُسی طرح وہ شخص جس کے دل میں دین و مذہب کا تقاضا ہی یعنی ہر فرد بشر بخوبی جانتا ہی کہ اس تقاضے کے تسکین کی کیا تدبیر ہی۔

سوال۔ تو خدا کی طرف سے پیغمبروں کا آنا اور کتابوں کا نازل ہونا سب بے کار۔

جواب۔ بے کار کیوں؟ اُسی بھوک کی خواہش کو لو۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ آدمی کو بھوک لگی اور بھوک کا احساس ہوتے ہی اُس کا پیٹ بھر گیا؟ نہیں اُس کو درکار ہوگی غذا۔ اور معمولی غذا کا حال یہ ہے کہ کسی شخص نے حساب کر کے ثابت کیا تھا کہ تین سو آدمی کا ہاتھ لگتا ہے تب ایک دانہ میسر آتا ہے جیسے تین سو میں کسی قدر مبالغہ ہو تاہم قدرتی اسباب کے علاوہ کاشتکار، بڑھئی، لوہار، چمار، مزدور، ہل چلانے والے کاٹنے والے گاہنے والے اور آخر کو پیسنے والی پکانے والی اتنے آدمیوں کے بدوں تو غذا مہیا ہو نہیں سکتی جب ایک غذا کے لئے اتنوں کی ضرورت ہو تو دین و مذہب کے لئے کتابوں اور پیغمبروں کی ضرورت کیوں نہ ہو؟ بھوک سے مضطر ہو کر انسان کھا لے سکتا ہے وہ چیز بھی جو اس کو نقصان کرے تو اس کے لئے چاہیئے طبیب اسی طرح کا دینی طبیب ہے پیغمبر۔ کیوں ہے یا نہیں؟

سوال۔ تو پیغمبر لوگوں کے دین و مذہب سے سروکار رکھے بدوں تبلیغ رسالت کیسے کر سکتا ہے۔

جواب۔ کیا خوب! قیاس مع الفارق ہے۔ میں نے تم کو منع کیا ہے کہ لوگوں کے دین و مذہب سے سروکار نہ رکھو۔ پیغمبروں کا یہاں کیا مذکور ہے۔ وہ تو لوگوں کے دین کی اصلاح کرنے کے لئے آئے تھے۔

سوال۔ اپنے قرآن میں وہ جو ایک آیت ہے ولتکن[1] منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولئک ھم المفلحون یہ کون لوگ ہیں۔

جواب۔ یہی ہمارے مولوی اور واعظ۔ سو ان کو بھی اپنے گروہ کے دین و مذہب سے ناصحانہ، مشفقانہ اور معلمانہ سروکار رکھنے کا حکم ہے نہ مخالفانہ، معارضانہ، مخاصمانہ۔

سوال۔ نصیحت بے مخالفت کے ہو ہی نہیں سکتی۔

جواب۔ مخالفت نہیں، اختلاف کہو اختلاف۔ اور اگر ایسا ہو کہ نصیحت بے مخالفت کے نہ ہو سکتی ہو تو

---

[1] اور تم میں ایک ایسا گروہ بھی ہونا چاہیئے جو (لوگوں کو) نیک کاموں کی طرف بلائیں اور اچھے کام (کرنے) کو کہیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور (آخرت میں) ایسے ہی لوگ اپنی مراد کو پہنچیں گے۔

میں ایسی نصیحت کو روا نہیں رکھتا اس واسطے کہ مخالفت سے تفرقہ پیدا ہوتا ہی جس کی سخت ممانعت ہی۔
ولا تفرقوا افسوس ہی کہ ہم تم ایسے امر میں بحث کر رہے ہیں جو نہ تم کو درکار ہی اور نہ مجھ کو۔ تم مولوی نہیں
واعظ نہیں۔ میں بھی نہیں۔ اور غالباً مولوی یا واعظ بننے کا تمہارا ارادہ بھی نہیں۔ میرا بھی نہیں۔
تو جو مولوی اور واعظ ہوں اُن ہی کو بلبئہم دیلین اللہ اس کا فیصلہ کرنے دو کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے.
اور کیا کر رہے ہیں۔

سوال بے شک میں مولوی نہیں واعظ نہیں اور مولوی اور واعظ بننا بھی نہیں چاہتا۔ مگر یہ بات
میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آدمی دوسرے کے دین و مذہب سے سروکار کیوں رکھے۔ جب تمدن کی غرض و غایت
یہ ہی کہ ہم ایک دوسرے کو فائدہ پہنچائیں تو اس سے بڑھ کر اور کون سا فائدہ ہو سکتا ہی کہ لوگوں کی دینی
غلطیوں کی اصلاح کی جائے۔

جواب۔ اول تو کسی شخص کو اُس کی دینی غلطیوں کی اصلاح کے لیئے دوسرے کی مدد کی ضرورت نہیں۔
اس کو خدا نے عقل دی ہی سمجھ دی ہی۔ وہ آپ ہی غلطی کرتا اور آپ ہی اُس کی اصلاح پر قادر ہی۔ دوسرے
نفوس انسانی کچھ اس طرح کے واقع ہوئے ہیں کہ دینیات میں افہام و تفہیم سے کاربراری نہیں ہوتی۔
اور اگر افہام و تفہیم سے کاربراری ہونے والی ہوتی تو کبھی کا ساری دنیا کا ایک مذہب ہو گیا ہوتا۔ کیونکہ کسی
وقت کسی مذہب میں سمجھانے والوں کا توڑا نہیں رہا۔ بلکہ سچ پوچھو تو اتنے سمجھنے والے نہیں جتنے کہ سمجھانے
والے ہیں۔ اس پر بھی ہم نے تو کسی فرقے کو مباحثے اور مناظرے میں مغلوب ہو کر دنیا کے پردے سے معدوم ہوتے
سنا نہیں۔ ہاں ایسا تو ہوا ہی کہ ایک عقیدے کے معدودے چند آدمی ہوئے و اتفاق سے اُن کی نسلیں
آگے کو چلنی بند ہو گئیں۔ اب اختلاف مذہب کا یہ حال ہی کہ شاید ہی کوئی برس جاتا ہو گا کہ کوئی نہ کوئی
نیا فرقہ نہ پیدا ہوتا ہو۔ اور یہ تو میں نے بڑے بڑے نامی اور مشہور فرقوں کے اعتبار سے کہا ورنہ
میرا خیال تو یہ ہی کہ کسی ایک آدمی کا عقیدہ تمام و کمال دوسرے آدمی کے عقیدے سے نہیں ملتا۔

ایک شخص نماز کا بڑا اہتمام رکھتا ہے دوسرا کہتا ہے کہ نماز تو آئے دن پانچ وقت سر پر کھڑی ہے روزے بیچارے کب کب آتے ہیں برس میں ایک بار سو بھی ہو یہ ناغہ نہ ہوں۔ ایک حقوق اللہ کا پاس کرتا ہے۔ دوسرا معتقد ہے کہ حقوق اللہ اگر ضائع ہوں تو وہ غفور و رحیم ہے بخش بھی دے گا حقوق العباد کی بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، خدا کسی بندے کا حق تلف نہ کرائے کہ اس کی کچھ تلافی ہی نہیں۔

سوال۔ مگر اس کا سبب کیا ہے؟

جواب۔ اس کا سبب ہے انسان کی خلقت جس طرح ایک کا چہرہ مہرہ دوسرے کے چہرے مُہرے سے نہیں ملتا اسی طرح ایک کے خیالات دوسرے کے خیالات سے نہیں ملتے۔ بات یہ ہے کہ انسان اس طرح کا حقوق ضعیف ہے کہ وہ متاثر ہوتا ہے تعلیم سے، تربیت سے، صحبت سے، سوسائٹی سے، رسم و رواج سے، آب و ہوا سے، مزاج شخصی سے، اپنی خواہشوں سے، اپنی ضرورتوں سے، اور کوئی جان نہیں سکتا کہ یہ سب باتیں جمع ہو کر کیا نتیجہ پیدا کریں گی۔ اب لوگوں کے اختلافِ مذہب کی وجہ سمجھے؟

سوال۔ سمجھا تو سہی مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف کبھی رفع ہونے والا نہیں۔

جواب۔ بے شک نہ رفع ہوا ہے اور نہ رفع ہو گا۔ ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربک ولذلک خلقھم[1]

سوال۔ تو پھر کر وہی بات آگئی کہ کتابوں کا نازل کرنا پیغمبروں کا بھیجنا فضول۔

جواب۔ نہیں، فضول ہرگز نہیں۔ دُنیا کے قوانین بھی انسدادِ جرائم کی غرض سے بنائے جاتے ہیں اور پھر بھی کلی انسداد نہیں ہوتا۔ اگر دُنیا کے قوانین فضول ہوں اگر دُنیا کے قوانین سے کچھ فائدہ نہ ہوتا ہو تو دین کے قوانین یعنی مذہب بھی فضول اور اس کو بھی بے سود محض خیال کیا جائے مگر دُنیا میں جتنا کچھ امن ہے جتنی کچھ خیر ہے سب مذہب کی طفیل سے تو مذہب فضول کیوں ہونے لگا؟ اور پھر یہ بحث لئے جاتی ہے جبر و قدر کی طرف جس میں غور اور خوض کرنے کی ممانعت ہے اور ممانعت کے

---

[1] لیکن لوگ ہمیشہ (آپس میں) اختلاف کرتے رہیں گے مگر جس پر تمہارا پروردگار فضل کرے اور اسی لئے تو ان کو پیدا کیا ہے۔

علاوہ انسان کی فہم سے بالاتر ہے اور اس کے حق میں مفید بھی نہیں۔

سوال۔ افسوس ہے کہ لفظوں کو بدل سدل کر اُسی مضمون کو پھر دوہرانا پڑتا ہے۔ مذہب بکار آمد ہے تو اُس کی اشاعت کیوں بکار آمد نہ ہو؟ اور اشاعت بے فہام و تفہیم کے ہو نہیں سکتی اور اسی کے آپ مخالف ہیں۔

جواب۔ میرے نزدیک دین کی جس قدر اشاعت کو خدا نے انسان کے حق میں مصلحت سمجھا وہ ہو چکی۔ اور یہی نکتہ ہے ختم رسالت میں۔ یعنی خدا نے ہمارے پیغمبر صاحب علیہ افضل الصلوٰۃ کو خاتم النبیین بنایا اور فرما دیا کہ اب ہماری طرف سے وحی کا بھیجا جانا ہمیشہ ہمیشہ کو بند۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ دین و مذہب کے متعلق جو کچھ خدا کو سمجھانا منظور تھا سمجھا جا چکا اور انسان کی ہدایت کے لیئے اس کو کافی اور وافی سمجھا۔ اب دین کا جتنا غُل دُنیا میں مچ چکا ہے وہ قیامت تک فرو ہونے والا نہیں۔

سوال۔ فرو ہونے والا تو اِسی سے نہیں نہ کہ لوگ چرچا کرتے رہیں سو آپ تو چرچے کو منع کرتے ہیں۔

جواب۔ کچھ قانون کے منع کرنے سے لوگ جرموں سے باز آ گئے ہوتے کہ میرے منع کرنے سے دین و مذہب کا چرچا چھوڑ دیں گے؟ مگر یہ تو سمجھو کہ زمانے کا رنگ دیکھ کر مصلحت وقت کیا ہے۔ چرچا کرنے سے اصل غرض فوت ہوتی ہے۔ یوں تو ساری دُنیا ہی عجائبات کا ایک طلسم ہے۔ انسان خود عجیب طرح کا مخلوق ہے اور اس سے زیادہ عجیب ہے اُس کا مذہب۔ مذہب نام ہے من سمجھوتی کا۔ کل حزب بما لدیہم فرحون[1] جس کا عقیدہ ہے۔ وہ اُس کو اور اسی کو اور صرف اُسی کو نجات کا رستہ سمجھتا ہے اور اپنی جگہ خوش ہے۔ سب کے من یعنی دل یکساں نہیں سب کے مزاج یکساں نہیں۔ سب کی عقل یکساں نہیں۔ سب کی تعلیم و تربیت یکساں نہیں۔ سب کی صحبت یکساں نہیں۔ سب کی سوسائٹی یکساں نہیں۔ سب کی خواہشیں یکساں نہیں۔ سب کی ضرورتیں یکساں نہیں۔ کہ یہی سب چیزیں انسان کی رائے پر اثر کرتی ہیں تو سب کی من سمجھوتی بھی یکساں نہیں ہونی چاہیئے۔ اور واقع میں ہے بھی نہیں اور ہو سکتی بھی نہیں کیونکہ مذہب ٹھیرا ایمان بالغیب کہ خدا کو

---

[1] جو (دین) جس فرقے کے پاس ہے (وہ) اُسی سے خوش ہے۔

کسی نے دیکھا نہیں بھالا نہیں۔ ایسا تو خدا ہی جس کو ماننا پڑتا ہی۔ یہ ہی مذہب کا اصل الاصول۔ اس کے بعد کچھ اصلاح دنیا ہی اور زیادہ تر اصلاح آخرت جس کے مقابلے میں دُنیا کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔ کجا حیاتِ ابدی اور کجا ساٹھ ستر برس اور اس کا بھی بھروسا نہیں۔ انسان کی معلومات کا حال یہ کہ کوئی نہیں جانتا اور کوئی جان نہیں سکتا کہ کل کیا پیش آئے گا۔ ماتدری نفس ماذا تکسب غدا[1] تو جس کو کل کی اور کل کی بھی کیسی اگلے لمحے کی بھی خبر نہ ہو وہ حالات بعد الممات میں رائے زنی کرے کیا خاک۔ مذہب کے بارے میں لوگوں کی ایسی مثال ہی کہ ایک ہی کوٹھری تیرہ و تاریک۔ رات کا وقت اور رات بھی اندھیری۔ کواڑ بند۔ آگے سے پڑے ہوئے پردے۔ اوپر سے ابر غلیظ کظلمات فی بحر لجی یغشاہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب ظلمات بعضھا فوق بعض اذا اخرج یدہ لم یکد یراھا[2]۔ ایسے وقت میں ایسی جگہ پر اندھے لاٹھیاں لے کر چلے مارنے کالی چینوٹی۔ چینوٹی تو کیا مار کھاتی لگے آپس میں سر پھٹول کرنے۔

سوال۔ حقیقت میں مذہب بھی عجیب چیز ہی!

جواب۔ بے شک۔ اور ابھی کیا ہی؟ اور سُنو۔ یوں بہتیری باتوں میں لوگ آپس میں اختلاف کیا کرتے ہیں ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہی رونقِ چمن ۔۔۔ اے ذوق اس جہاں کو ہی زیب اختلاف سے

اور اختلاف کسی قسم کا اور کیسا ہی خفیف کیوں نہ ہو اُس میں کسی نہ کسی قدر مخالفت تو ہوتی ہی ہی۔ مگر مذہبی اختلاف تو عجیب طرح کا اختلاف ہی کہ یہ فوراً عداوت کی طرف منجر ہو جاتا ہی اور عداوت بھی ایسی سخت کہ وہ فریقین میں التیام ہونے نہیں دیتی۔ دُنیا میں جتنی خونریزی ابتدا سے آخر تک ہوئی ہی اگر اُس کی

---

[1] جو کچھ (ماؤں کے) پیٹ میں ہی وہ ہی اس کو بھی (جانتا ہی اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ (وہ خود) کل کیا کرے گا۔

[2] یا (ان کے اعمال کی مثال) بڑے گہرے دریا کے اندرونی اندھیروں کی سی (ہی) کہ دریا کو لہر نے ڈھانک رکھا ہی اور (لہر بھی ایک نہیں بلکہ) لہر کے اوپر لہر اُس کے اوپر بادل (غرض) اندھیرے ہیں ایک کے اوپر ایک کہ (دریا کی تہ میں کوئی آدمی) اپنا ہاتھ نکالے تو توقع نہیں کہ اُس کو دیکھ سکے۔

ایک فہرست بنانی ممکن ہو اور بنائی جائے اور ہر ایک خونریزی کے اسباب تحقیق کیے جائیں تو میرا خیال یہ ہے
کہ دوسرے تمام اسباب کے نامۂ اعمال میں ایک چھٹانک خونریزی ہوگی تو مذہب کے نامۂ اعمال میں ایک من
یا اس سے بھی زیادہ۔ بلکہ وہ ایک چھٹانک جو دوسرے تمام اسباب کے نامۂ اعمال میں ہوگی اُس میں سے بھی
اکثر میں حضرتِ مذہب نے ضرور اپنی ٹانگ پھنسائی ہوگی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ بادشاہ بادشاہ لڑتے ہیں
طمع ملک گیری سے لڑتے ہیں آپس کی ضد سے۔ اور نام کر دیتے ہیں کہ دینیہ کا ، جہاد کا ، مذہبی لڑائی کا ،
گویا لڑائی ایک رنگ ہے اور اِس میں شوخی اور پختگی نہیں آتی تاوقتیکہ اس کو مذہب کا ڈوبہ دیا جائے۔
جس طرح سب سے زیادہ خونریزی دُنیا میں مذہب کی وجہ سے ہوئی ہے اسی طرح میرا خیال یہ ہے کہ
دُنیا میں سب سے زیادہ گناہ مذہب کی آڑ میں ہوتے ہیں۔ خاص کر حقوق العباد کے متعلق: زید کو اتنا معلوم
ہو جائے کہ بکر کسی فروعی مسئلے میں بھی اُس کا ہم عقیدہ نہیں پھر قرابت ، ہمسائگی ، ہموطنی ، انسانیت ،
بکر کے کتنے ہی حقوق کیوں نہ ہوں زید ہے کہ اُس کی نظر میں سب ضائع۔ پھر اِن فی طبیعت کو دیکھتے ہیں
تو نفوس قدسی کے سوائے کہ وہ اِس زمانے میں شاذ و نادر ہیں والنادر کالمعدوم کوئی نفس حسد سے
خالی نہیں ، تھوڑا ہو یا بہت ، ہر شخص اپنی جگہ یہی چاہتا ہے کہ خدا کی جتنی نعمتیں ہیں سب کا وہی
ٹھیکہ دار ہو۔ تو عقل باور نہیں کرتی کہ ہمدردی تعصب مذہبی کی باعث ہو یعنی ہر شخص جو یہ چاہتا ہے
کہ ساری دُنیا اُسی کی ہم عقیدہ ہو ، کیا لوگوں کی خیر خواہی نے اُس کو اِس خواہش پر مجبور کر رکھا ہے اور
اُس کو ایسا دلِ دردمند دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو مبتلائے عذاب آلہی دیکھ نہیں سکتا ہے اگر ایسا ہوتا تو
اُس کی فیاضی دُنیا کی باتوں میں بھی ضرور ظاہر ہوئی ہوتی۔ مگر دنیا میں تو ہم کسی کو ایسا فیاض نہیں
پاتے تو معلوم ہوا کہ عام خیر خواہی اور عام ہمدردی کے سوائے تعصب مذہبی کا کوئی اور سبب ہے
اور وہ نہیں ہے مگر خود پسندی کہ انسان جب مذہب کے بارے میں ایک رائے قائم کر لیتا ہے چاہتا ہے کہ لوگ بھی
اُس کو تسلیم اور اِس کی تصویب کریں۔ یہ ہی اصل اُس تعصب مذہبی کی جو دبائے عام کی طرح لوگوں میں

پھیلا ہوا ہے۔

سوال - اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا ہونا ہے کہ دین کا چرچا بالکل موقوف ہو جائے۔

جواب - موقوف ہو جانا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ چرچا ہو اور ایسی بھونڈی طرح ہو کہ دُنیا سے امن و عافیت اُٹھ جائے اور لوگوں میں باہمی عداوت قائم ہو کہ سازگاری کے ساتھ زندگی نہ بسر کر سکیں

سوال - ہم تو اب تک یہ سمجھتے تھے کہ دین کی خدمت سے بہتر اور عمدہ اور اشرف کوئی کام نہیں اور شاید ساری دُنیا کا اس پر اجماع ہے اور ہر مذہب میں اس کے پیشوا واجب التعظیم سمجھے جاتے ہیں۔

جواب - اس سے کہ لوگ کیا کرتے اور کیا سمجھتے ہیں ہم کو کوئی بحث نہیں۔ ہم کو تو اتنی بات دیکھنی ہے کہ دین کی خدمت جس طرح پر ہو رہی ہے دین کے حق میں مفید ہے یا نہیں۔ سو سینکڑوں برس کے تجربے سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ اس طرح کی خدمت سے فائدے کی جگہ دین کو اُلٹا نقصان پہنچتا ہے۔ دشمنیاں پھیلتی چلی جاتی ہیں اور اختلاف مذہب ہے کہ لوگوں کو متفق ہونے نہیں دیتا اور اس کا ضروری نتیجہ ہے ضعف، سو ہر جگہ ظاہر ہے۔ جو شخص پہلے سے بودا اور غلط سے غلط عقیدہ بھی رکھتا ہے از بسکہ محکوم ہے سوسائٹی کا، تربیت کا، ملکی آب ہوا کا، مزاجِ شخصی کا، کچھ نہ کچھ تاویل کر لیتا ہے اور اپنی جگہ اس کو تسلی ہے اب جو اس کو اس کے خلاف سمجھایا جاتا ہے (بشرطیکہ سمجھانے کے طور پر سمجھایا بھی جائے) اس کی ضد بڑھتی اور غلطی پر اصرار کرنے لگتا ہے۔ اگر اُس کو اس کی آنکھ کا ناخنہ دکھایا جائے تو وہ ناخنہ کا علاج نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس خیال سے کہ اُس کی عیب جوئی کی گئی ہے اس فکر میں پڑ جاتا ہے کہ اس نے میری آنکھ میں ناخنہ بتایا لاؤ میں اس کی آنکھ میں ٹینٹ دکھا دوں۔ اور کس کی آنکھ عیب سے خالی ہے؟ غرض نہ اُس کے نزدیک پھینگا ہے تو وہ اُس کے نزدیک کانڑا۔ آنکھ کسی کی بھی صاف نہیں۔

سوال - یہ بالکل سچ ہے کہ اختلافِ مذہب کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں بڑے بگاڑ پڑ گئے ہیں مگر اس حالت میں ہم کو ضرور ہے کہ اپنے گروہ کو قوت دیں اور اس سے بڑھ کر کوئی قوت ہو نہیں سکتی کہ

لوگ کثرت سے ہمارے ہم عقیدہ ہوں۔ پس میں تو سمجھتا ہوں کہ ان دنوں مذہبی مناظرات کی سخت ضرورت ہے
جواب۔ اگر لوگوں کو حق کی تلاش ہو تو مناظرہ بھی کام آسکتا ہے ورنہ مناظرۂ مذہبی سے بدتر کوئی چیز نہیں
زمانے کا رنگ یہ ہے کہ نہ کہنے والوں کو اظہارِ حق کا تقاضا اور سلیقہ اور نہ سننے والوں کو حق کی جستجو۔
کیا تم خیال کرتے ہو کہ جتنے مذہبی فرقے دُنیا میں ہیں سب مباحثے اور مناظرے سے پیدا ہوئے ہیں
اور مباحثے اور مناظرے ہی کے بل پر چل رہے ہیں۔ ایسا خیال تو صریح غلط ہے۔ معتقدات مذہبی میں
بہت سی باتوں کو دخل ہے جیسا کہ میں نے بار بار کہا ہے۔ ان میں ایک حق بھی ہے یعنی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ آدمی تفتیش و تحقیق کے بعد ایک عقیدے کو حق سمجھ کر اختیار کرتا ہے۔ لیکن ایسا بہت ہی کم ہے۔
اکثر بلکہ عام یہ ہے کہ جو شخص جس عقیدے کے لوگوں میں پیدا ہوا جس عقیدے کے لوگوں میں
اُس نے تربیت پائی، جس عقیدے کے لوگوں میں رہا اُن ہی کا سا عقیدہ اس کا بھی ہوتا ہے
اور وہ صمیم قلب سے اسی عقیدے کو حق سمجھتا ہے اور اُس کے لیئے حق ہے بھی وہی۔ تو مذہب ایک متوارث
چیز ہے جیسے مال و جائداد یا جسمانی بناوٹ۔ پس ابتدائے عمر میں لوگ ایک عقیدے کے پیرو
ہوتے ہیں اس واسطے کہ انھوں نے اپنے بزرگوں کو اُسی عقیدے کی پیروی کرتے دیکھا ہے۔ بڑے
ہو کر سو میں ننانوے تو آنکھ بند کیئے ہوئے اُسی عقیدے پر چلے جاتے ہیں۔ کوئی اکا دُکا ایسا ہوا کہ
اُس نے اُس عقیدے کی جانچ پڑتال کی اور فرض کرو کہ اُس کو اُس عقیدے میں کوئی نقص
دکھائی دیا تو اُس نے وہیں اُس کی کچھ نہ کچھ تاویل کر لی۔ غرض عقیدہ وہ کا وہی رہا۔ کوئی شاذ و نادر
ایسا بھی ہوا کہ تاویل نہ کر سکا تو اُس نے عقیدہ بدل ڈالا۔ مگر ایسے لوگ کتنے ہیں! در کس حساب میں۔
سوال۔ لیکن دُنیا میں مذہبی لڑائی اس قدر پھیل گئی ہے کہ اب چپ رہتے بھی تو نہیں بن پڑتا۔ ممکن ہے
کہ ہم اپنی طرف سے چھیڑ چھاڑ نہ کریں لیکن دوسرے بھی چین سے بیٹھنے دیں؟
جواب۔ یہ سچ ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے انسداد کی کوئی تدبیر ہے تو خاموشی ہے۔

سوال۔ خاموشی کا ایک بڑا زبون نتیجہ یہ ہو کہ اُس سے اپنا ضعف ظاہر ہوتا اور اپنے ہی گروہ کے لوگ شکوک اور شبہات پیدا کرنے لگتے ہیں خصوصًا وہ جن کی دینی معلومات بالکل نہیں یا ہی اور ناقص ہی۔ تو کم سے کم اپنے گروہ کو سمیٹے رکھنے کے لیئے تو مذہبی چھیڑ چھاڑ کا جاری رکھنا پڑے ہی گا۔

جواب۔ میں تو دیکھتا ہوں کہ اب اِس کا بھی وقت نہیں۔ ایک بڑی خرابی جو اس شان میں ہی یہ ہی کہ آدمی دوسروں کے سنوارنے میں آپ بگڑتا ہی۔ اُس کو دوسروں کی آنکھ کے ناخنے تو خوب سوجھ پڑتے ہیں اور اپنی آنکھ کا ٹینٹ نظر نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ وہ اپنے تئیں مقبول اور دوسروں کو مردود سمجھنے لگتا ہی۔ اُس کی ساری مذہبی معلومات دوسروں کو ملزم ٹھیرانے کے لیئے ہوتی ہی اور وہ خود پابندی شریعت سے مستثنٰی۔ لوگوں میں اپنا مذہبی وقار قائم رکھنے کے لیئے اُس کو مذہبی احکام کی پابندی کرنی پڑتی ہی تو وہ پابندی نفاق و ریاکاری میں داخل ہی۔ اس کی مثال اُس شخص کی سی ہی کہ محلے میں لگی آگ، یہ دوسروں کی آگ بجھانے میں رہا اور اپنا گھر جل کر خاک سیاہ ہوگیا۔ اور جوں کہ کہتا ہی اور کرتا نہیں اِس کی بات لوگوں کے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوتی۔ یہ بنتا ہی واعظ اور حقیقت میں ہی افسانہ خواں۔ لوگوں کو راہ بتاتا اور آپ اوندھے مُنہ اندھے کوئے میں گرتا۔

سوال۔ تو آپ کے نزدیک جیسا مناظرہ ویسا وعظ۔

جواب۔ ہاں میرا تو ایسا ہی خیال ہی۔ قباحت سے تو ایک بھی خالی نہیں۔

سوال۔ پھر دین سیکھیں تو کس سے سیکھیں اور کیوں کر سیکھیں؟

جواب۔ اپنے نفس سے۔

سوال۔ ع۔ خفتہ را خفتہ کئے کند بیدار؟

جواب۔ نفس انسانی خفتہ نہیں ہی۔ اس کو خدا نے جیتا جاگتا پیدا کیا ہی اور وہ ہر وقت بُرے بھلے میں امتیاز کرتا رہتا ہی۔ مگر آدمی خود اُس کو تھپک تھپک کر سلاتا ہی اور اُس کی فریاد نہیں سُننی چاہتا۔

کیا استفت قلبک کا گولڈن رول ذہن سے اُتر گیا کہ جب کسی بات کے اچھے یا بُرے ہونے میں تردد واقع ہوا کرے تو اپنے دل سے پوچھ لیا کرو۔ وہ نیکی و بدی کے شناخت کی کسوٹی ہے۔ دنیا میں بہت سے مجرم سزا سے بچ جاتے ہیں، مگر ہر فرد بشر پر ایک قدرتی سزا دہندہ مسلط ہے کانشنس یعنی نفس لوّامہ کہ اس کی سزا سے پناہ نہیں اور وہ سزا کیا ہے انسان کا آپ اپنے تئیں ملامت کرنا۔ حاکم ظاہر جسمانی سزا دے سکتا ہے مگر وہ ایسی موذی نہیں ہوتی جیسی روحانی سزا کہ اُس کی کچّی مار ہے اور بڑے بڑے بڑے بڑے ہیکڑ اِس کے آگے بیٹھ بول گئے ہیں اور مرتے دم اقرار ہی کرتے بن پڑا ہے۔ ایک دیہاتی نے جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا حضرت میں ایک اَن پڑھ دیہاتی آدمی ہوں۔ نہ تو حاضر خدمت رہ سکتا ہوں اور نہ دُنیا کے کام دھندے سے زیادہ فرصت پاسکتا ہوں۔ مجھ کو تو کوئی مختصر سی بات فرما دیجئے کہ میں اُس پر کاربند رہوں اور وہ میری نجات کے لیئے کافی ہو۔ آپ نے سورۂ زلزال اُس کو پڑھ کر سُنا دی جس میں حالاتِ قیامت کا بیان ہے اور آخر میں استفت قلبک کے مطلب سے ملتا ہوا ایک جملہ ہے فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ[1] یعنی جو شخص دُنیا میں ذرّہ بھر نیکی کرے گا قیامت کے دن وہ نیکی اُس کے آگے آجائے گی اور جو شخص دُنیا میں ذرّہ بھر بُرائی کرے گا قیامت کے دن وہ بُرائی اُس کے آگے آجائے گی۔ وہ دیہاتی یہ سُن کر رخصت ہوا اور کہتا جاتا تھا خدا کی قسم اِس میں ذرا کمی بیشی نہیں کروں گا۔ اور آں حضرتؐ حاضرین خدمت سے فرماتے تھے کہ جنّتی نہ دیکھا ہو تو اس کو دیکھ لو۔ لوگوں نے بہت چھان چھان کر دین کو کرکرا کر دیا ہے ورنہ دین سے زیادہ سہل و سلیس کوئی چیز نہیں۔ اس کا تقاضا انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے۔ اور ایک ہادی اور راہ نما اس کے ساتھ ہے بل الانسان علے نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ[2] یعنی

---

[1] تو جس نے ذرّہ بھر نیکی کی (ہوگی) وہ اس (نیکی) کو (بچشم خود) دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ بُرائی کی (ہوگی) وہ اس (بُرائی) کو (بچشم خود) دیکھ لے گا۔ [2] بلکہ (خود) انسان اپنے مقابلہ میں حجت ہے گو وہ (اپنے تئیں بے قصور ثابت کرنے کے لیئے کتنے ہی) بہانے پیش لایا کرے۔

انسان کیسے ہی حیلے بہانے کرے وہ اپنے نفس کے عیب و صواب خوب دیکھتا ہی۔

دین کا دستور العمل

سوال۔ تو جس طرح پیغمبر صاحب نے اُس دیہاتی کو ایک مختصر سی بات تعلیم کر دی اور اُس کی تسلّی ہو گئی اسی طرح میری حالت کے مطابق آپ ایک مختصر دستور العمل میرے لئے تجویز کر دیجئے۔

جواب۔ بسر و چشم۔ دین کا لب لباب ہی معرفتِ نفس۔ یعنے اپنے تئیں پہچاننا کہ ہم کیا ہیں۔ اب کہو تو اس کی کچھ تفصیل کر دوں اور کہو تو خاموش رہوں۔

سوال۔ نہیں تفصیل کی تو سخت ضرورت ہی تاکہ آپ کا مطلب اچھی طرح میرے ذہن میں بیٹھ جائے۔

جواب۔ اپنے تئیں پہچاننے کی کوشش کروگے تو پاؤگے کہ آدمی بھی ایک طرح کا جانور ہی کہ اس کی بہت سی ادائیں جانوروں سے ملتی ہیں۔ وہ دوسرے جانوروں کی طرح چلتا پھرتا کھاتا پیتا سوتا جاگتا ورا حت کا احساس رکھتا ہی۔ اے کاش وہ نرا جانور ہوتا۔ پیدا ہوا ایک وقت خاص تک زندہ رہا۔ مر گیا تو کچھ بھی نہ تھا خس کم جہاں پاک۔ مگر مصیبت یہ ہی کہ اس کو عقل دی گئی ہی جو اس کو چین سے نہیں رہنے دیتی۔ یوں آدمی اپنے زور و ظلم سے جو چاہے کر گزرے مگر جانورانہ زندگی بسر کرنے کے لئے نہ کھیتی کرنے نہ کپڑا بنتے نہ گھر بناتے اور آدمی کا یہ اس کھڑاگ کے گزر نہیں۔ نہ عقل ہوتی اور نہ یہ سب بکھیڑے کرنے پڑتے پیغمبر صاحب نے پرندوں کے حال میں فرمایا ہی تغدو خماصا و تروح بطانا[1] اور اے کاش عقل اتنے ہی کام کی ہوتی کہ ساز و سامان معیشت کے بہم پہنچانے میں مدد کرتی اور بس۔ نہیں، وہ بتاتی ہی کہ اس کارخانہ دنیا کا اور خود آدمی کا کوئی خالق اور بنانے والا ہی اور آدمی کے ساتھ خدا کی ابنائے جنس کی بلکہ سچ پوچھو تو ذرّے ذرّے کی ذمہ داریاں متعلق ہیں۔ کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ[2] دقتیں ضرورتیں اور ترغیبات ایسی پیش آجاتی ہیں کہ آدمی کتنا ہی محتاط کیوں نہ ہو پھر بھی اپنے فرائض کو

---

[1] صبح کو نکلے بھوکے شام کو لوٹ کر آئے پیٹ بھرے۔ [2] تم سب کے سب چرواہے ہو اور تم سب سے تمھاری رعیت کی بابت سوال کیا جائے گا۔

پورا پورا ادا نہیں کرسکتا اور نہیں کرتا تو اُس کا دل اُس کو ملامت کرتا ہی اور نہ صرف ملامت کرتا ہی بلکہ اُس کے ذہن میں یہ بات جما رکھی ہو کہ زندگانی دُنیا پر خاتمہ نہیں ہو جو کچھ اس زندگی میں کرتے ہیں۔ بُرا یا بھلا مرے پیچھے اُس کا خمیازہ بھگتنا ہی ہو نہیں سکتا کہ ہم جانور بن جائیں، ہو نہیں سکتا کہ سر سے عقل کو نکال ڈالیں، ہو نہیں سکتا کہ ایسے خیالات کو ذہن میں آنے دیں۔ بس یہی دین ہی۔

سوال۔ ایں! میں نے تو آپ سے دستورالعمل کی درخواست کی تھی۔

جواب۔ یہی دستورالعمل ہو کہ اپنی حالت میں غور کرتے رہو جب سمجھوگے کہ تم کیا ہو تو ضرور یہ بھی سمجھوگے کہ تم کو کیا کرنا چاہیئے۔ دین تمہاری سمجھ سے باہر کوئی چیز تم سے نہیں چاہتا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہی کہ سمجھ سے کام لو۔ بس میں نے دین کے متعلق اپنے ضروری خیالات ظاہر کردیئے ہیں اس پر بھی تم کو کوئی شبہہ ہو تو بیان کرو میں جواب دینے کو موجود ہوں۔

سوال۔ آپ کی تقریر میں تو مجھ کو کچھ بھی شبہہ نہیں اور یوں تو دین کے متعلق میرے پاس شبہات کے انبار ہیں۔ اور گو اس وقت مجھ کو کچھ پوچھتے نہ بھی بن پڑے تاہم مجھ کو توقع نہیں کہ دین کی طرف سے میرا دل کبھی مطمئن ہوگا۔

جواب۔ بے شک جس کو تم نے دین سمجھ رکھا ہی اُس کی طرف سے مطمئن ہونا تو مشکل ہی مگر افسوس کی بات ہو کہ جس چیز کو خدا نے دل کے اطمینان کے لیئے بنایا ہو الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ وہی تمہاری بے اطمینانی کا باعث ہو۔ اس کا علاج تو دعا کے سوائے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

مذہبی شکوک اور اُن کا دفعیہ

میرا بھی قریب قریب تمہارا ہی سا حال تھا بلکہ شاید اس سے بھی بدتر اور جس کو انگریزی تعلیم چھوٹوں بھی چھو جائے گی قسم کھانے کی بات ہو کہ اُس کا ایسا ہی حال ہوگا۔ وہ کہے یا نہ کہے ظاہر کرے (اگر ہمت والا ہی)

لہ سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دلوں کو تسلی ہوا ہی کرتی ہی۔

یا چھپائے (اگر دل کا بود اہی) میں ایک دیندار کے گھر میں پیدا ہوا اور کہہ سکتا ہوں کہ گھر والوں کی دیکھا دیکھی میں بھی اوائل عمر میں دیندار تھا اگر میں اُس وقت اور اس طرح کی دینداری کو دینداری کہہ سکوں۔ شامت جو آئی تو مجھ کو سرکاری کالج میں داخل کر دیا گیا۔ باوجودے کہ کالج پادریوں کا نہیں بلکہ سرکاری تھا اور اُس میں دین و مذہب سے کچھ بحث نہ تھی اور میں انگریزی ہی نہیں بلکہ عربی پڑھتا تھا تاہم چونکہ ہر قسم کے لوگوں سے ملنا جُلنا ہوتا تھا مخالف آوازیں کان میں پڑنے لگیں۔ بہت دن نہیں گزرے تھے کہ میرے مذہبی خیالات میں تزلزل پیدا ہونا شروع ہوا۔ نماز پہلے گنڈے دار ہوئی پھر ندارد۔ اور ع خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری۔ دو چار دفعہ بڑوں کے لحاظ سے پڑھنی پڑی تو بے وضو ہی پڑھ دی۔ پھر عیسائیت کی طرف رجحان ہوا تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ ریائی نمازوں کی التحیات میں اشہد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ کی جگہ اشہد ان عیسیٰ ابن اللہ کہنے لگا۔ مگر حضرت عیسیٰ کا خدا اور خدا کا بیٹا ہونا دل میں کچھ اچھی طرح جمتا نہ تھا۔ پھر جھجکتے جھجکتے وہی اشہد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ کہنے لگا۔ مُنہ سے اقرار دل سے انکار۔ غرض میں کسی وقت عیسائی تھا، کسی وقت مُسلمان، کسی وقت کچھ بھی نہیں۔ میں اس کی بھی کوشش کرتا تھا کہ مذہبی خیالات کو سرے سے سر میں آنے ہی نہ دوں۔ مگر کوئی نہ کوئی اتفاق ناملائم پیش آتا ہی رہتا تھا کہ وہ خدا سے بے تعلق محض نہیں ہونے دیتا تھا۔ اپنی بے اختیاری دیکھ کر دل سہارا ڈھونڈتا تھا۔ بس یہی ایک چیز تھی جو مذہب کے خیالات کو مٹنے نہیں دیتی تھی۔ اسی حیص بیص میں کئی برس گزر گئے ہیں۔ اس کا اقرار کرتا ہوں کہ میری عمر کا کوئی حصہ ایسا نہیں گزرا جس میں ہمہ وقت میں مذہبی خیالات میں مستغرق نہ رہا ہوں۔ دُنیا کے بہت سے کام کاج کرنے کو تھے۔ ان سے فرصت پاتا اور آدمی کی جون میں ہوتا تو مذہب کا بھی خیال کرتا۔ کبھی گرویدہ اور کبھی بالکل ہتّے سے اُکھڑا ہوا۔ اسی تردد کی حالت میں خدا جھوٹ نہ بلوائے میں نے علم کلام کی پچاسوں کتابیں دیکھ ڈالیں لیکن کسی ایک سے بھی تسلّی نہ ہوئی اور تسلّی ہوتی تو کیونکر ہوتی

عیسائی مثلاً مسلمان پر ایک اعتراض کرتا ہے۔ مسلمان اس اعتراض کو تو نہیں اُٹھاتا مگر ویسا ہی یا اُس سے بھی بدتر اعتراض عیسائی پر جڑ دیتا ہے۔ میری طبیعت پر اس سوال جواب کا اثر یہ ہوتا کہ دونوں سے بدعقیدت۔ آخر اُکتا کر میں نے علم کلام کی کتاب دیکھنے سے توبہ کی کیونکہ ان کو العلم حجاب اکبر کا مصداق پایا۔ اب مجھ کو بالکل یقین ہو گیا کہ میں اسی تذبذب اور تزلزل کی حالت میں مروں گا۔ لیکن اس تصور سے جیسی ایذا مجھ کو ہوتی تھی بیان نہیں کر سکتا۔ وقتاً فوقتاً خدا سے دعا بھی مانگتا لیکن کن لفظوں کہ اے خدا اگر درواقع میں تو ہے تو مجھ کو اس حیرت سے نجات دے۔ مباحثے اور مناظرے سے قطع نظر کر کے اب میں آپ ہی مذہب کی دھیڑ بن میں رہا۔ جب موقع ملتا اکیلا بیٹھا پڑا سوچا کرتا۔ شدہ شدہ میرے وہ خیالات ہو گئے جو میں نے تم پر ظاہر کیے۔ اگر بعض یا سب کے سب غلط بھی ہوں تاہم میرا دل مطمئن ہے کیونکہ میں نے ان کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اور مجھ کو جتنی سمجھ دی گئی ہے اُس سے بڑھ کر مجھ سے باز خواست نہیں ہو سکتی[له] لا یکلف اللہ نفسا الا ما اتٰہا اب بھی مجھ کو کبھی کبھی اختلافات اور اعتراضات کا خیال آیا کرتا ہے لیکن پہلے جو مجھ کو پہاڑ معلوم ہوا کرتا تھا اب میں اس کو پھونک مار کر اڑا دیا کرتا ہوں۔ میں نے اصول ہی ایسے ٹھہرا رکھے ہیں کہ وہ اعتراضات کو اپنے پاس تک نہیں پھٹکنے دیتے۔

سوال۔ وہی اصول تو میں معلوم کرنے چاہتا ہوں۔

جواب۔ عقلِ انسانی کی نارسائی اور اپنی ہنڈیا کی خیر منانی۔

سوال۔ یہ تو آپ نے ایک پہیلی سی کہہ دی۔

جواب۔ پہیلی نہیں ہے، بڑے کام کی بات ہے۔ جتنے مذہبی اختلافات دیکھنے ہو اکثر بلکہ عموماً ان ہی دو قسموں کے ہوتے ہیں۔ یا تو انسان عقل سے وہ کام لینا چاہتا ہے جو اس کی طاقت سے باہر ہے یا شخص

له خدا نے جس کو جتنا دیا ہے اس سے بڑھ کر کسی کو تکلیف دینی نہیں چاہتا۔

بجائے خود ایک کل دوڑتا ہوا اور ایک کی مت دوسرے سے نہیں ملتی جب ایسی بات تمہارے سامنے آئے فوراً
اُس سے کنارہ کش ہو جاؤ اور سمجھ لو کہ ایسی باتوں میں غور کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اختلافات کی
دوسری بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی ناحق شیخی میں آکر یا جھوٹ موٹ خیر خواہی جتاکر دوسرے کے
مذہب کے درپے ہوتا ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ تقاضائے حقانیت ہی ہوتا ہم یہ شخص فرض کو چھوڑ کر
نفل پر دوڑتا ہے۔ اُس کو چاہیئے پہلے اپنے نفس کی اصلاح جس کے نیک و بد کی اُس کو خدا کے یہاں چل کر
جوابدہی کرنی ہے وہ اپنی تو خبر نہیں لیتا اور قاضی جی کیوں دُبلے شہر کے اندیشے سے دوسروں کی
فکر سے نجات نہیں۔ پس بھائی ہمارے تو یہ دو جھگڑے ہاتھ آگئے ہیں۔ اپنی ضرورت سے زیادہ مذہب کے غم کو
پاس نہیں آنے دیتے اور شکر ہے کہ بڑے امن و اطمینان سے زندگی بسر ہوتی ہے میں نے سمجھ لیا تھا کہ مذہب کو ذریعہ
اطمینان و تسلّی ہونا چاہیئے سو یہ صفت ان ہی خیالات میں پائی۔ ہاں ان خیالات پر بھی اس بات کا
کھٹکا تو ضرور لگا رہتا ہے کہ فرائض انسانیت میں مجھ سے بڑی کوتاہی ہوتی ہے نہ تو جیسے چاہیئے خدا ہی کے
حقوق ادا ہوتے ہیں اور نہ بندوں کے۔ مگر خدا کی رحمت پر بھروسا کرکے میں اپنی مغفرت کی طرف سے
نااُمید بھی نہیں ہوں۔ مذہب تو پوری تسلّی دے مگر اپنے کردار بھی تسلّی ہونے دیں۔

سوال۔ آپ نے اختلافات کی بھول بھلیوں میں سے نکلنے کے لیے کیا سلسلہ اختیار کیا تھا۔

جواب۔ سب سے پہلے خدا کے بارے میں جہاں تک عقل نے یاری دی اپنے خیالات کو راسخ کیا۔
خدا کی نسبت لوگوں کے جیسے جیسے خیالات ہیں کچھ سُنے سنائے معلوم تھے کچھ کتابوں میں پڑھے تھے۔
ان سب کو سوچا، سب کو غور کیا تو جو خیالات اسلام تعلیم کرتا ہے سلیس قریب الفہم اور قرین قیاس معلوم ہوئے
بس ایک اسی چیز کو پکڑ لیا اور دوسرے مذہبوں کے ساتھ محاکمہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ میں نے
دین کو سمجھا ایک عمارت اور خداشناسی کو اُس کی بنیاد۔ عمارت جس کی بنیاد درست نہیں گو وہ
کیسی ہی نقش و نگار اور ساز و سامان سے آراستہ کی گئی ہو وہ بالکل غیر محفوظ ہے علٰے شفا جرف ھار[1] آنے دو

---

[1] کنارے پر ریتیلے گار کے جو گرنے کو ہو رہا ہے۔

اذا زلزلت الارض زلزالھا[1] کا وقت - پہلے ہی جھکوے ہیں یہ عمارت نہ لڑکھڑا جائے تبھی کہنا۔ اور جب اسلام کی طرف سے پوری تسلّی ہو گئی تو مزید تحقیقات کی ضرورت باقی نہ رہی کہ اور لوگ کیا سمجھتے اور کیا کہتے ہیں۔

سوال ۔ مصیبت یہ ہے کہ خود اسلام بھی تو اختلافات سے خالی نہیں۔

جواب ۔ بے شک ۔ اس واسطے کہ لوگوں کی طبیعتیں مختلف واقع ہوئی ہیں لیکن ان اندرونی اختلافات کا رفع کر دینا کچھ بھی تو مشکل نہیں ۔ اختلافات کے رفع کر دینے سے میری یہ مراد نہیں کہ تم ان اختلافات کو دُنیا سے معدوم کر دو گے ۔ یہ اختلافات دُنیا کے ساتھ ہیں ، نہ اُس سے جدا ہوئے نہ اُس سے جدا ہو سکتے ہیں اور نہ اُس سے جدا ہوں گے ۔ بلکہ میری مراد یہ ہے کہ اختلافات تم کو حیران و پریشان نہیں کریں گے۔

مقلدوں اور غیر مقلدوں کے جھگڑے

یہ اختلافات اکثر فروعی اور غیر ضروری باتوں میں ہیں جن کی مطلق پروا نہیں کرنی چاہیئے مثلاً آج کل مقلدوں اور غیر مقلدوں کے اختلافات نے مسلمانوں میں بڑا تفرقہ ڈال رکھا ہے اور وہ لڑتے ہیں کن باتوں پر کہ نماز میں آمین پکار کر کہنی چاہیئے یا آہستہ ۔ ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں یا اس سے نیچے ہٹا کر ۔ صفِ نماز میں مقتدیوں کو پاؤں سے پاؤں ملا کر کھڑا ہونا چاہیئے یا پاؤں جوڑنے کی ضرورت نہیں ۔ یہ سچ ہے کہ نماز نام ہے حرکات خاص (قیام و رکوع و سجود وغیرہ) کا اوضاع خاص پر جو شارع سے منقول ہیں یعنی ہم کو اُسی طرح پر نماز پڑھنی چاہیئے جس طرح پر خود پیغمبر صاحب نے پڑھی ۔ مگر تیرہ سو برس کی بات ۔ اوضاع میں اختلاف یقین کے درجے تک ۔ اوضاع کا متعین ہونا مشکل لیکن ہم دیکھتے ہیں تو ان اوضاع مختلف فیہ میں کوئی بھی شرطِ نماز نہیں ۔ شرطِ نماز ہے طہارت ، استقبال قبلہ ، قرات ، قیام وغیرہ ۔ اور یہ شرطیں تو ظاہر کے اعتبار سے ہیں اور ان کی تعمیل چنداں دشوار بھی نہیں ۔ ہر کوئی کر سکتا ہے اور کیا ہی کرتا ہے ایک شرطِ اعظم ہے حضورِ قلب جس کی بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ۔ دہ ہزاروں میں کسی ایک بندۂ خدا سے ادا ہوتی ہو گی۔

---

[1] جب زمین بڑے زور سے ہلا دی جائے۔

اور یہ شرط فوت ہو تو سرے سے نماز ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ نیکی برباد گناہ لازم۔ بے ادبی اور گستاخی سمجھی جائے تو
عجب نہیں۔ بادشاہوں کے بادشاہ دونوں جہان کے مالک اپنے خالق و رازق کے روبرو کھڑا ہوتا ہے کہیں اور
دل کہیں۔ یہ خدا کو دھوکا دینا اور اس کے ساتھ کھیل کرنا نہیں ہے تو کیا ہے؟ حضور قلب نہیں اور یوں فرضاً نماز
پیغمبرؐ کی نقل بھی کر لی اُن ہی کی طرح پکار کر آمین کہی۔ اُن ہی کی طرح سینے پر ہاتھ باندھے ع آنچہ آدم مے کند بوزینہ ہم
تو کیا اس سے نماز مقبول ہو گئی؟ جس کے ایسے خیالات ہوں اور ہر ایک نمازی کے ایسے ہی خیالات ہونے چاہئیں
وہ کیا پروا کر سکتا ہے کہ آمین پکار کر کہی یا آہستہ، ہاتھ سینے پر باندھے یا نیچے ہٹا کر۔

سوال۔ یہ اختلافات تو واقع میں محض بے وقعت ہیں۔ مگر ان لوگوں میں بڑا اختلاف تقلید کا ہے۔

جواب۔ وہ بھی رفع یدین اور آمین بالجہر کے اختلاف کی طرح بے وقعت ہے۔ ائمہ اصول میں اختلاف
نہیں کرتے۔ اُن کے اختلاف بھی فروع میں ہیں یا قیاسی باتوں میں جن کے لئے ان کو نص شرعی بہم
نہیں پہنچی۔ علاوہ بریں سوچنے اور خیال کرنے کی بات ہے کہ کتنے مسلمان اس لیاقت کے ہیں اور اُن کی
دینی معلومات اس درجے کی ہے کہ اُن کو ائمہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ یا وہ ائمہ کے اختلاف میں
محاکمہ کر سکیں۔ پس ایسے لوگوں کو یعنی اس مُلک کے اور اس وقت کے مسلمانوں کو تقلید کے سوائے اور
کیا چارہ ہے۔ رہی یہ بات کہ نص شرعی کے ہوتے دیدہ و دانستہ اُس کے خلاف امام کی رائے پر
عمل کیا جائے شاید کوئی احمق سے احمق مسلمان بھی اس کا قائل نہیں غرض سارے فساد تعصب اور
سخن پروری کے ہیں ورنہ مسلمان کو مسلمان سے اختلاف کرنے کے معنی کیا؟

سُنی شیعوں کا اختلاف

سوال۔ بھلا سُنی شیعہ کے اختلاف کو آپ نے کیوں کر رفع کیا؟

جواب۔ میرے یہاں یہ بھی غیر ضروری میں داخل ہے۔

سوال۔ غیر ضروری!

جواب۔ جی ہاں غیر ضروری بالکل غیر ضروری۔

سوال۔ یہ کیوں کر؟

جواب۔ یہ اس طرح کہ خدا کو دین اسلام کا جاری کرنا منظور تھا۔ لوگوں کے معتقدات خدا کے بارہ میں اس قدر بیہودہ ہو گئے تھے کہ اُن کی وجہ سے نظام عالم میں فتور واقع ہو چلا تھا۔ ان غلطیوں کی اصلاح کے لیئے خدا نے پیغمبر آخر الزماں کو مبعوث کیا۔ اُن پر قرآن نازل فرمایا جس نے نامانوس عقائد کا تعلیم کرنا تھا کہ جیسے کسی نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ پیغمبر صاحب کو لوگوں کے ساتھ مطارحات پیش آئے۔ مباحثے اور مناظرے ہوئے اور جیسا کہ مباحثے او مناظرے کا ہمیشہ انجام ہوا کرتا ہے کشت وخون کی نوبت پہنچی جس کا نتیجہ الحق یعلو ولا یعلیٰ یہ ہوا کہ اِدھر اسلام پھیلتا جاتا تھا اور اُدھر روکھن میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوتی جاتی تھی۔ پیغمبر صاحب شروع شروع میں صرف پیغمبر تھے اور آخر آخر میں پیغمبری کے علاوہ بادشاہ بھی۔ خدمت پیغمبری تو کبھی متوارث ہوئی نہیں اور اس کو متوارث ہونا چاہیئے بھی نہیں۔ پیغمبری ایک فضیلت خاص ہے جس کے لیئے خدا اپنے بندوں میں اُس کو جو فی علم اللہ اس کا اہل ہوتا ہے منتخب فرمالیتا ہے۔ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ[له] پیغمبر صاحب کی وفات کے ساتھ پیغمبری کا خاتمہ ہو گیا۔ اور وحی کا آنا موقوف۔ مگر قرآن جیسا اور جتنا خدا کو اُتارنا تھا پیغمبر صاحب کے جیتے جی مدّون ہو چکا تھا۔ اور وہ دین کے لیئے کافی اور وافی ہے حسبنا کتاب اللہ اگر پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد دین کے لیئے کسی نائب یا خلیفہ یا امام کی ضرورت تھی تو وہ ایسی ہی ضرورت تھی جیسی مسئلہ بتانے دینیات کا درس دینے اور وعظ کہنے کے لیئے مولویوں کی ضرورت ہے۔ مگر سلطنت جانشین کے بدون ایک لمحہ بھی نہیں چل سکتی تھی۔ چنانچہ اس جانشینی کا سلسلہ ایک وضع پر چلا۔ اب اس میں غور وخوض کرنا کہ وہ جیسا ہوا ایسا ہی بعینہٖ مناسب ہوا یا نامناسب

[له] خدا جس جگہ اپنی پیغمبری (کی امانت سپرد) کرتا ہے وہ (اس جگہ کے محفوظ اور قابل اطمینان ہونے کو بھی) خوب جانتا ہے۔

جو لوگ جانشین ہوئے مستحق تھے یا غاصب۔ یہ اُسی قسم کی بحث ہو کہ شیر شاہ کی ڈاڑھی بڑی تھی یا سلیم شاہ کی جس کو نہ دین سے کچھ تعلق اور نہ دین اس کا متقاضی۔ یہ بحث اب تیرہ سو برس بعد کیا فائدہ دے سکتی ہو یا اُن ہی وقتوں میں جب کہ یہ جانشینیاں ہو رہی تھیں اس بحث نے کیا فائدہ دیا۔ ہونے والی بات کو کون روک سکتا تھا۔ ولایت کے کسی کلب میں ایک مرتبہ یہ بات زیر بحث تھی کہ جلال الدین اکبر اور عالمگیر اورنگ زیب دونوں میں کون اچھا بادشاہ تھا۔ کچھ لوگ اکبر کے جانب دار تھے اور کچھ عالمگیر کے باتوں باتوں میں تکرار ہو پڑی طرفین میں بعض بعض ایسے تیز مزاج تھے کہ فرانس کے علاقے میں جا کر ڈیوئیل لڑے۔ بس تو ان میں اور سُنّی شیعوں میں کچھ بھی فرق نہیں کرتا۔

سوال۔ سُنّی شیعوں کے اختلاف کو اُس اختلاف پر جو اکبر اور عالمگیر کے بارے میں کیا جائے قیاس کرنا بڑی بے انصافی ہو۔ سنی شیعوں کا اختلاف اختلاف ہو اُن لوگوں کے بارے میں جو پیغمبر صاحب کے حواری اور شاگرد اور بعض ان کے بہت پاس کے رشتہ دار اور اُن کے تربیت یافتہ تھے۔ اِن کے معاملات پیغمبر صاحب کی تعلیم یعنی اسلام پر اثر کرتے ہیں۔ یہ اختلافات یوں سرسری طور پر نہیں ٹالے جا سکتے۔

جواب۔ ابھی دین کے بارے میں تمھارے خیالات ہی کا ٹھکانا نہیں۔ سب سے زیادہ مکروہ پیرایہ جو اس اختلاف کے لیے اختیار کیا جا سکتا ہی یہ ہو کہ وہ لوگ پیغمبر صاحب کے حواری اور شاگرد اور قرابت مند اور اُن کے تربیت یافتہ ہو کر خلافت یعنی سلطنت کے لیے لڑے اور ضرور ہو کہ اِن دو مخالفوں میں ایک حق پر ہو اور دوسرا ناحق پر۔ تو جو ناحق پر تھا کیوں اُس کو جانشین پیغمبر اور کیوں اُس کو واجب الادب مانا جائے۔ طلب سلطنت کو اُن لوگوں کی شان کے خلاف سمجھنا پہلی غلطی تو یہی ہو۔ دُنیا اور دین میں جو علاقہ ہو اسلام سے بہتر اس کی توضیح شاید کسی مذہب نے نہیں کی شروع سے اِس کے سمجھنے میں لوگوں نے غلطی کی اور غلطی کی وجہ واقع ہوئی دُنیا کی بے ثباتی۔ بے ثباتی کے خیال سے دُنیا کو جس قدر حقیر اور ذلیل سمجھا جائے بجا اور درست۔ مگر وہ ویسی ہی حقیر اور ذلیل ہو جیسے باغ میں بہار کا موسم

کہ چندروزہ تو ہی مگر جو دن ہی ایسا کون سا کوڑ مغز ہی جس کو بھلا نہ لگے اور رنگ برنگ کے پھولوں کو دیکھ کر سونگھ کر اُس کا دل باغ باغ نہ ہو جائے۔ بے ثبات ہی تو اور چند روزہ ہی تو، مگر دُنیا کو بھی خدا نے کسی مصلحت سے بنایا ہی رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا[1] یہ کہاں کا دین ہی کہ دُنیا میں اتنے کیڑے ڈالے جائیں کہ اُس میں رہنا حرام اُس کو طلب کرنا منع۔ ایسا دین کبھی چلا ہی اور چل بھی سکتا ہی؟ اسلام کی یہی تو بڑی عمدگی ہی کہ وہ ہر بات میں فطرت انسانی کے مطابق ہی۔ اُس نے لوگوں کو ہرگز تقدس ادعائی اور زہد ریائی کی تکلیف نہیں دی اور دُنیا جہان میں منادی کردی۔ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ[2] اور مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ[3] پھر پیغمبر صاحب کی زندگی کو دیکھتے ہیں تو گو ان کا اصلی مدعا دُنیا میں خدائے واحد کی پرستش اور حسن معاشرت کا قائم کرنا تھا مگر اس فکر سے بھی غافل نہ تھے کہ مسلمانوں کی ایک خاص سلطنت قائم ہو اور اگرچہ تھوڑی مُہلت پائی مگر جب تک تمام جزیرۂ عرب کو مطیع نہیں کرلیا انتقال نہیں فرمایا۔ تو قرآن اور نمونۂ پیغمبر کے ہوتے یہ کہنا کہ اسلام ترکِ دنیا کا متقاضی ہی صریح بہتان ہی۔ ہاں اسلام یہ ضرور چاہتا ہی کہ دُنیا کو نیکی اور حُسن معاملہ کے ساتھ برتو۔ تو اگر پیغمبر صاحب کے رفقا نے اُن کے شاگردوں نے اُن کے عزیزوں نے سلطنت کی خواہش کی اور خواہش کے ساتھ منافست یعنی ہر ایک دعوے دار نے چاہا کہ یہ نعمت اُسی کے ہاتھ لگے، تو میں نہیں سمجھتا کہ اس خواہش اور منافست سے اُن کے اسلام میں کیوں فتور واقع ہونے لگا۔ اب بھی مسلمانوں میں چھوٹی چھوٹی بے حقیقت باتوں کے لیے کشمکش ہوتی رہتی ہی۔ ایک مدعی ہوتا ہی دوسرا مدعا علیہ اور ولایت تک مقدمے لڑتے چلے جاتے ہیں

---

[1] اے پروردگار تو نے دُنیا کو بے کار محض تو نہیں بنایا۔ [2] اسلام میں جوگی سنیاسی بننے کا کچھ کام نہیں بنایا۔
[3] زینت کی چیزیں جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے ایجاد کی ہیں اور مزے دار کھانے ان کا حرام کرنے والا کون۔

اور کبھی کسی کو اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ اس مقدمہ بازی سے کوئی فریق دائرۂ اسلام سے خارج ہوگیا۔ ہر ایک فعل کا بُرا یا بھلا ہونا موقوف ہی نیت پر۔ نیت کا حال صاحب نیت اور خدائے عالم الغیب کے سوا کوئی جان نہیں سکتا۔ ہاں بعض قرائن سے تحرّی یعنی اٹکل کی جاسکتی ہی۔ سو جن لوگوں کی کشمکش پر سُنّی شیعوں کا اختلاف مبنی ہو اِن کے خلافت سے پہلے اور خلافت کے بعد کے حالات دلالت کرتے ہیں کہ انھوں نے دنیوی اغراض کی طمع سے خلافت یعنی سلطنت کی آرزو نہیں کی بلکہ اسی میں اسلام کا فائدہ سمجھا کہ زمامِ سلطنت خود اپنے ہاتھ میں لیں۔ انھوں نے حکومت سے کوئی حظ نہیں اٹھایا۔ انھوں نے بیت المال کی رقم کو ضرورت سے زیادہ اپنے اوپر حرام سمجھا اور کوڑی کوڑی پر جان دی۔ انھوں نے سلطنت کو ودیعت الٰہی سمجھا اور جس خیال سے لی تھی اسی خیال سے بھائی کو نہیں بیٹے کو نہیں جسے اہل سمجھا حوالے کی اور پیغمبر صاحب کی حیات میں اسلام کی جیسی جیسی انھوں نے خدمتیں کیں کوئی ایسا ہی ہٹ دھرم ہو تو اُن کی طرف سے آنکھوں پر پٹّی باندھے۔ اس روداد پر کیوں کر کہا جاسکتا ہی کہ انھوں نے غصبًا طمع دنیا کی وجہ سے خلافت طلب کی تھی۔ غایت ما فی الباب یہ کہ انھوں نے اپنے استحقاق کے اندازہ کرنے میں غلطی کی ہو۔ تو کیا اس ایک غلطی کی پاداش میں ان کے تمام عمر کے حقوق فراموش کر دیئے جاسکتے ہیں۔ حاشا ثم حاشا۔ اصل لم کو تو کوئی پاتا نہیں ورنہ مسلمان کی زبان پر اِن اختلافات کا نام بھی تو نہیں آنا چاہیئے۔ لوگ مذہبی تقدس کی ڈُگو اتنا اونچا لے گئے ہیں کہ سارا راگ بے مناسبت ہو رہا ہی۔ انسان کو انسانیت کے جامے میں نہیں دیکھ سکتے اور گو منہ سے نہیں کہتے مگر اِن کی باتوں سے معلوم ہوتا ہی کہ کامل دین دار وہ ہی جو فرشتوں کی طرح تمام انسانی کمزوریوں انسانی خواہشوں سے مطلقاً بری ہو۔ جب مجرد دین دار ہونے کے لیئے یہ قید ہی تو پیغمبر کا کیا پوچھنا ہی، لوگوں کا بس چلے تو

اُسے آدمیت کو چھُونے بھی نہ دیں پیغمبر کی نسبت ان کے تو اِس قسم کے خیالات تھے۔ [۱] وقالوا ما لھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق۔ [۲] لولا انزل علیہ کنز او جاء معہ ملک۔ [۳] وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لھم۔ [۴] ولقد ارسلنا من قبلک وجعلنا لھم ازواجا وذریۃ۔ [۵] لولا انزل ھذا القراٰن علی رجل من القریتین عظیم۔ [۶] وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیھم من اھل القرٰی۔ [۷] وما جعلناھم جسدا لا یاکلون الطعام وما کانوا خالدین۔ [۸] لولا انزل علیہ ملک فیکون معہ نذیرا او یلقی الیہ کنز او تکون لہ جنۃ یاکل منھا۔ [۹] وقالوا لن نؤمن لک حتی تفجر لنا من الارض ینبوعا او تکون لک جنۃ من نخیل وعنب فتفجر الانھار خلالھا تفجیرا او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا او تاتی باللہ والملٰئکۃ قبیلا او یکون لک بیت من زخرف او ترقی فی السماء ولن نؤمن لرقیک حتی تنزل علینا کتابا نقرءہ۔

اِن چند باتوں سے جو صرف نمونے کے طور پر بیان کی گئی ہیں پتہ لگتا ہے کہ لوگوں کے خیال میں پیغمبر کو کیسا ہونا چاہیئے تھا۔ آدمیوں سے بالاتر، فرشتہ، شانِ خدائی لیئے ہوئے۔ پیغمبر صاحب نے اپنی سی بہتیری کی کہ اُن کی نسبت ایسے خیالات نہ کیئے جائیں اور اُن کے اصرار سے اور بیکار بیکار انما انا بشر مثلکم فرمانے سے اُن خیالات میں بہت کچھ کمی ہوئی بھی مگر لوگوں کے اصلی رجحانِ طبیعت کو کیا کیا جائے۔ رنگ کٹ گیا مگر دھبہ باقی

---

[۱] اور کافر کہتے ہیں اس رسول کا کیا حال ہے یہ تو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ [۲] اس پر غیب سے کوئی خزانہ نازل کیوں نہ ہوا یا اس کے ساتھ اس کی مدد کو کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا۔ [۳] اور ہم نے جو رسول بھیجا اپنی ہی قوم کی بولی میں گفتگو کرتا ہوا بھیجا تاکہ لوگوں کو سمجھا سکے۔ [۴] اور اے پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے وہ بیبیاں بھی رکھتے تھے اور اولاد بھی۔ [۵] مکہ مدینہ دو بڑے شہر ہیں ان میں کسی بڑے آدمی پر یہ قرآن نازل کیوں نہ ہوا۔ [۶] اور اے پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھی قصباتی لوگوں کو رسول بنا کر بھیجا اور ان پر وحی نازل کی۔ [۷] اور ہم نے پیغمبروں کو ایسے جثے نہیں دیئے تھے کہ اُن کو کھانے کی ضرورت نہ ہو اور نہ وہ لوگ سدا سدا کو دنیا میں رہنے والے تھے۔ [۸] اس پیغمبر کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا کہ اس کے ساتھ ہو کر لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈراتا یا اس کے پاس غیب سے خزانہ اترا ہوتا یا کوئی باغ ہوتا کہ اس کی پھل پھلاری کھاتے۔ [۹] اور کافر کہتے ہیں کہ اے پیغمبر ہم تم پر ایمان لانے والے ہیں نہیں مگر یہ کہ تم زمین میں سے پانی کا ایک چشمہ جاری کر دو یا تمہارا کوئی باغ ہو اس میں چھوہاروں اور انگوروں کے پیڑ ہوں اور تم اس کے بیچ بیچ نہریں بہا دکھاؤ یا وہ جو دھمکایا کرتے تھے آسمان کے ٹکڑے ہم پر برسا دو یا اللہ اور فرشتوں کو سامنے لا کھڑا کرو یا سونے چاندی کا تمہارا گھر ہو یا آسمان میں چڑھ جاؤ اور ہم تو تمہارے چڑھ جانے کو ماننے والے نہیں مگر یہ کہ ہم پر کتاب اتر آئے اور ہم آپ اس کو پڑھ لیں۔

اُن ہی خیالات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ پیغمبرؐ کے رفیق پیغمبرؐ کے عزیز پیغمبرؐ جیسا تقدس اور تقدس بھی وہ تقدس جو انھوں نے سمجھ رکھا ہو نہ رکھتے ہوں تو انیس بیس کے فرق سے اس کے لگ بھگ ہوں۔ یہ ہی اصلی جڑ سنی شیعوں کے اختلاف کی۔ لوگوں نے پیغمبر صاحب کے خانگی حالات کی ٹوہ لگائی تو معلوم کیا کہ باپ تو شیرخوار ہی چھوڑ مرے تھے پیغمبر صاحب نے دادا کے کنار عاطفت میں پرورش پائی پھر دادا کا سایہ بھی سر پر سے اُٹھ گیا تو چچا نے سرپرستی کی۔ یوں پیغمبر صاحب نسب میں حسب میں خدانخواستہ کسی سے ہیٹے نہ تھے مگر پھر بھی تھے غریب آدمی۔ اور خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ایک بیوہ بی بی تھیں مگر تھیں بڑی مال دار اور ملک شام کے ساتھ اُن کی بڑی تجارت تھی۔ اُن کو متدین کارندے کی تھی جستجو۔ انھوں نے پیغمبر صاحب کی دیانت امانت راستبازی حسن معاملت کا حال سنا تو ان کو مال تجارت دے کر شام کو روانہ کیا اور یہ پیغمبری سے پہلے کی بات ہے۔ بھلا جس شخص کو خدا نے پیغمبری کے لیے منتخب کیا ہو اور وہ تجارت کرے تو اُس تجارت میں برکت نہ ہوتی ہو تو ہو۔ اس پھیرے میں خدیجہؓ کو توقع سے بہت بڑھ کر نفع ہوا اور اُن کے غلاموں نے جو مال کے رکھ رکھاؤ کے لیے ساتھ تھے پیغمبر صاحب کی ہر طرح کی تعریفیں بیان کیں۔ خدیجہؓ تو پیغمبر صاحب کی گرویدہ ہو گئیں اور پیغمبر صاحب سے نکاح کا پیام دیا۔ ادھر خدیجہؓ کی قدردانی ادھر پیغمبر صاحب کی احسان شناسی۔ باوجودیکہ خدیجہؓ بیوہ ہونے کے علاوہ پیغمبر صاحب سے پندرہ برس بڑی تھیں پیغمبر صاحب نے منظور فرما لیا۔ اب پیغمبر صاحب نے دنیاداروں کی نظروں میں ایک وقار پیدا کیا۔ ہم تو پیغمبر صاحب کی اس بات کے قائل ہیں کہ باوجودے کہ عرب میں متعدد نکاح کر لینے کا عام رواج تھا مگر خدیجہؓ کے ساتھ پیغمبر صاحب نے اس قدر مروت برتی کہ جب تک زندہ رہیں دوسرے نکاح کا خیال بھی تو نہیں کیا۔ جس طرح خدیجہؓ کے مال میں خدا نے پیغمبر صاحب کے قدموں سے برکت دی تھی اسی طرح اُن کے نکاح میں بھی برکت دی کہ بیٹے بھی ہوئے اور بیٹیاں بھی ہوئیں سو بیٹے تو خدا کی مرضی سے زندہ نہ رہے بیٹیوں میں صرف حضرت فاطمہؓ پیغمبر صاحب کے

بعد جیتی رہیں وہ بھی چھ مہینے۔ اِدھر خدیجہؓ کا منہ تھا کہ پیغمبر صاحب نکاح کا قصد نہیں فرماتے تھے اِن کے انتقال کے بعد پیغمبر صاحب نے کئی بیبیاں کیں جن میں حضرت ابوبکرؓ خلیفۂ اول کی بیٹی اُم المومنین عائشہ سربرآوردہ تھیں۔ ایک تو پیغمبر صاحب کی ازواج طاہرات میں صرف حضرت عائشہ تھیں جن کے پہلے شوہر پیغمبر صاحب تھے۔ دوسرے اِن کے باپ پیغمبر صاحب اور اسلام پر بڑے حقوق تھے کہ وہ سب سے پہلے مسلمان ہوئے تھے۔ اور شروع سے آخر تک برابر جان و مال دونوں سے پیغمبر صاحب کی خدمت میں حاضر۔ کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے۔ اور اچھے خوش حال آدمی تھے۔ مگر سارا مال پیغمبر صاحب اور اسلام کی تائید میں خرچ کر کرا کے آخر کو خالی ہاتھ رہ گئے۔ ہجرت کے اُس نازک اور جان جوکھوں کے وقت میں کہ کافروں نے پیغمبر صاحب کے مار ڈالنے کے منصوبے کر لیے تھے اور پیغمبر صاحب بے سر و سامان رات کو مکّے سے تشریف لے گئے تھے اور بنظر ظاہر کوئی اُمید نہ تھی کہ صحیح سلامت بچ کر جائیں گے یہی ابوبکرؓ تھے جنہوں نے پیغمبر صاحب کا ساتھ دیا۔ مخالف جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں کہیں ان تعلقات کو کون مٹا سکتا ہے کہ پیغمبر صاحب نے نکاح بھی کئے تو ایسے وقت کیے جب جوانی کی شورش فرو ہو چکی تھی اور اکثر بیواؤں کے ساتھ، اور بیواؤں کے ساتھ کہ اُن کے حالات پکارے کہتے ہیں کہ ان کو زوجیت میں لینا ان کے حفظِ مرتبت کے لیے تھا، یا ان کی دلجوئی کی لیے، یا اسلام کی خاطر ان کے میکے والوں کی استمالت کے لیے۔ بہرکیف پیغمبر صاحب کی ازواج طاہرات میں سے حضرت عائشہؓ سب میں سربرآوردہ تھیں۔ اُدھر حضرت فاطمہؓ تھیں تو بیٹی مگر عائشہؓ سے عمر میں بڑی صاحب اولاد کہ ان ہی سے پیغمبر صاحب کی نسل چلی اور سید کہلائے پھر بیٹی بھی کس ماں کی تھیں؟ خدیجۃ الکبریٰؓ کی جن کے احسانات اور حسن معاشرت کو پیغمبر صاحب جب تک جیے ہمیشہ یاد کیا کیے۔ غرض عورتوں میں سے حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ کو پیغمبر صاحب کے ساتھ پیرے درجے کی خصوصیت تھی اور اِن دونوں میں بتقاضائے بشریت ایک طرح کی کشیدگی رہا کرتی تھی حضرت عائشہ کا حال یہ تھا کہ پیغمبر صاحب نے بیبیوں کی باری باندھ رکھی تھی۔ لیکن دل پر تو کسی کا قابو نہیں چلتا۔

لوگوں کو میلانِ طبع معلوم تھا۔ اُم المومنین سودہؓ نے تو اپنی باری تک بطوع خاطر عائشہؓ کو دے دی تھی۔ اور میل ملاپ والوں میں کسی کو کچھ تحفہ تحائف بھیجنا ہوتا تو عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری کا انتظار کرتے۔ جانتے تھے کہ پیغمبر صاحب کی اصلی بی بی وہی ہیں۔ ادھر حضرت فاطمہؓ تھیں تو بیٹی مگر جب والدِ بزرگوار کی خدمت میں تشریف لاتیں تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ بیٹھنے کو اپنی ردا بچھا دیتے۔ گھنٹوں تخلیہ کرتے۔ ان دونوں کا رشتہ ہی ایک دوسرے سے کشیدہ رہنے کا تھا۔ سِیَر میں ان لوگوں کے حالات پڑھو تو وہ لوگ بھی ہم ہی جیسے آدمی تھے۔ ہم ہی جیسی طبیعتیں۔ اسلام نے ان کے معتقدات کو بدلا تھا اُن کے معلومات کی اصلاح کی تھی، نہ اُن سے انسانیت اور بشریت سلب کرلی تھی لا تبدیل لخلق اللہ[1] پیغمبر صاحب کی ازواج طاہرات میں قریب قریب اسی طرح کے محاسدات تھے جیسے اس زمانے کی سوکنوں میں ہوتے ہیں۔ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اگر زندہ ہوتیں اور پیغمبر صاحب اُن کی زندگی میں عائشہؓ کے ساتھ نکاح کر لیتے تو دونوں میں سوکنات کا رشتہ ہوتا اب حضرت فاطمہؓ اپنی ماں کی قائم مقام تھیں اور عائشہؓ سے اُنکی رکاوٹ بدی ہوئی بات تھی۔ پس اب یہیں سے فیصلہ کرلو کہ ان دونوں کی رُکاوٹ اور کشیدگی کو خود ان دونوں کے اسلام میں پیغمبر صاحب کی پیغمبری میں ہم اُمتیوں کے دین و مذہب میں کیا دخل ہے۔ اگر ایسی ایسی باتوں سے اسلام جانے لگا تو دنیا میں کبھی کوئی مسلمان تھا نہ کوئی اب ہی اور نہ کوئی آئندہ ہوگا۔ مسلمانان درگور مسلمانی در کتاب۔ اور اچھا فرض کیا اسلام جاتا رہا تو کس کا؟ انھیں کا جو ایک دوسرے سے کشیدہ رہے۔ پیغمبر تک اس کا اثر کیوں متعدی ہونے اور پھر آٹے کے ساتھ ہم بیچارے اُمتیوں کا گھن کیوں پیسا جانے لگا۔ غضب خدا کا۔ خدا کو ایک مانیں۔ پیغمبر اور قرآن اور آخرت سب کو برحق، نمازیں پڑھیں، روزے رکھیں، حج کریں، زکوٰۃ دیں اور پھر دوزخی کے دوزخی کیوں؟ اس لیئے کہ عائشہؓ اور فاطمہؓ ایک دوسرے سے روٹھی رہتی تھیں۔ اچھا پھر ہم کیا کریں؟ ہمارے اختیار کی بات ہے؟

---

[1] خدا کی (بنائی ہوئی) بناوٹ میں ردوبدل نہیں ہو سکتا۔

ہم نے اِن کو لڑوا یا؟ یا اب ہم ان کا ملاپ کرا سکتے ہیں؟ پیغمبر صاحب نے اِن کو ملانا چاہا تب تو ملیں ہی نہیں۔ عائشہؓ تو فاطمہؓ کا کیا کر سکتی تھیں کیونکہ فاطمہؓ کو پیغمبر صاحب کے ساتھ نسبت جزیّہ تھی۔ مگر یوں افک عائشہؓ کے موقع پر فاطمہؓ کے شوہر حضرت علیؓ نے پیغمبر صاحب کو عائشہؓ کے چھوڑ دینے کی ضرور صلاح دی تھی۔ عورت کو گھر کے اُجڑنے کا بڑا صدمہ ہوتا ہے اور پھر گھر بھی عائشہؓ کا سا گھر کہ دین کی پیغمبری اور دُنیا کی بادشاہت۔ عائشہؓ عنہا تھیں تو پیغمبر صاحب کی بی بی مگر پھر بھی تھیں تو آدمی ممکن نہیں کہ اُن کو حضرت علیؓ کی صلاح کی خبر نہ ملی ہو۔ اور خبر ملے پیچھے جیسا کچھ ملال اُن کو علیؓ کی طرف سے ہوا ہوگا اور رہا ہوگا ظاہر۔ پھر اس سے انکار ہو نہیں سکتا کہ حضرت علیؓ خلافت کے دعویدار ضرور تھے۔ اور کیوں نہ ہوتے پیغمبر صاحب کے بعد داماد کہو، بیٹا کہو، بھائی کہو، یہی تھے۔ اور چند در چند قرابتوں کے علاوہ علم و فضل و شجاعت میں بھی کوئی اِن کا ہمسر نہ تھا۔ اور سب استحقاق ایک طرف اور فاطمہؓ کا موجود ہونا ایک طرف۔ کوئی ہر جو اتنے استحقاقوں کے ہوتے سلطنت جیسی چیز کو چھوڑ بیٹھے؟ اور یہ نہ صرف علیؓ کا خیال تھا بلکہ سِیَرا در احادیث کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر صاحب کے تمام قرابت مندانِ جدّی کا یہی خیال تھا۔ دوسرے دعویدار بھی کہیں سے رستہ چلتے نہیں آ گئے تھے۔ اُن کو بھی پیغمبر صاحب کے ساتھ طرح طرح کی خصوصیتیں تھیں اور سب پر فائق یہ کہ اُس وقت کا رنگ دیکھ کر اپنی کامیابی کا یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ کامیاب ہوئے بھی شاہجہاں بادشاہ چار بیٹے چھوڑ کر مرا تھا۔ کوئی محلاتِ شاہی کی طرفداری پر نازاں تھا۔ کوئی ارا کین سلطنت سے ملا ہوا تھا۔ کسی کو اس کا گھمنڈ تھا کہ میں عین وقت پر بادشاہ کے پاس ہوں۔ اور آسانی سے خزانہ اور قلعہ اور لوازمِ شاہی پر قبضہ کر سکتا ہوں۔ کوئی اپنی تدبیر اور حکمت عملی پر بھروسا رکھتا تھا یعنی سب سے چھوٹا عالمگیر۔ اور آخر کار اسکے سامنے کسی کی بھی نہ چلی میں خیال کرتا ہوں کہ خلافتِ اسلامی کا بھی یہی حال ہوا۔ لے اُڑے وہ جو اُس کے لے اُڑنے کی تدبیر کر سکتے تھے اور اُن کے بعد کی کارروائیوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اس کے اہل بھی تھے۔ اس بات کو تو عقل قبول نہیں کر سکتی کہ پیغمبر صاحب نے کسی کو تعیین و تخصیص اپنا

جانشین کیا ہو۔ جو شخص ایک نیا مذہب چلا کر لوگوں سے سینکڑوں ہزاروں برس کے معبودوں کی پرستش اِن کے عزیزان کے مال و اسباب اِن کے وطن چھڑا دے، جو شخص تمام جزیرۂ عرب بلکہ تمام دنیا میں ایک تہلکہ مچا دے، جو شخص ہزاروں لاکھوں خون کرا دے، اُس کو اپنے جانشین کا تسلیم کرا دینا کیا مشکل تھا؟ اُس کو اپنے اتباع پر وہ اقتدار حاصل تھا جو کسی بادشاہ کو گو وہ کیسا ہی جابر اور زبردست کیوں نہ ہو نہ کبھی حاصل ہوا اور نہ کبھی حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ لوگوں کی نہ صرف اس چند روزہ زندگی پر حکومت کرتا تھا۔ انما تقضی ھذہ الحیوۃ الدنیا بلکہ آنے والی ابدی لازوال زندگی پر بھی۔ وہ نہ فقط جسموں کے ہلاک کر دینے پر قادر تھا بلکہ روحوں کے تباہ کر دینے پر بھی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ہے کہ پیغمبر صاحب آدمی تھے کثیر العلائق (بیٹے آدمی بھی ڈرتے ہی ڈرتے کہا ہے) بہتیروں کے ساتھ طرح طرح کی خصوصیتیں رکھتے تھے اور کبھی کبھی اظہار احسان مندی یا دلدہی کے طور پر تحسین اور شاباش کی ضرورت واقع ہوتی تھی۔ اُس کو کسی نے جانشینی کی بشارت سمجھ لیا ہو تو اس کی خوشی۔ جو شخص سب سے زیادہ پیغمبر صاحب کی وفات سے متاذی ہوا وہ فاطمہؓ تھیں۔ والدہ پہلے انتقال فرما چکی تھیں۔ اب ماں اور باپ دونوں کی جگہ پیغمبر صاحب تھے اور باپ بھی کیسے باپ؟ دین و دُنیا دونوں کے بادشاہ۔ ایسے باپ کا سر پر سے اُٹھ جانا۔ اس پر حضرت علیؑ کا خلافت سے محروم رہنا۔ اور نمک بر جراحت ترکۂ پدری باغ فدک کا دعویٰ کرنا اور مقدمے کا ہار جانا۔ کسی دوسرے کو ایسے پیہم صدمات پہنچتے تو وہ زہر کھا کر مر رہتا مگر اُن کے صبر و ضبط اُن ہی کے ساتھ تھے۔ پھر بھی اِن ہی رنجوں میں گھل گھل کر چھ ہی مہینے کے اندر اندر انتقال فرما گئیں۔ اور جتنے دن زندہ رہیں ان لوگوں سے جنھوں نے ان کو رنج دیئے تھے نہ بولیں اور نہ بات کی یہاں تک کہ اُن لوگوں کے اپنے جنازے پر آنے کی بھی مناہی کر دی اور شب کے وقت مدفون ہوئیں اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مانا کہ ان کا غصہ کسی قدر بیجا بھی ہو تاہم اُن کے باپ کے حقوق کیا چاہتے تھے فاطمہؓ کے دل غمزدہ کو خوش کرنے کے لیے علیؑ کو اگر وہ اہل نہ بھی تھے برائے نام خلافت دے دی ہوتی اور آپ انتظام کیا ہوتا آخر خلافت تو کون دیئے دیتا تھا۔

مگر باغ فدک کے دے دینے میں ایسی کونسی قباحت تھی۔ غایت مافی الباب حدیث نحن معاشر الانبیاء لا نرث و لا نورث ما ترکنا صدقۃ کے خلاف ہوتو ہو گناہ اگر ہوتا تو فاطمہؑ کو ہوتا کہ وہ سیدانی ہو کر صدقہ کھائیں۔

سخت افسوس کی بات ہے کہ اہل بیت نبوی کو پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہی سے ایسے نا ملائم اتفاقات پیش آئے کہ اُن کا وہ ادب اور لحاظ جو ہونا چاہیئے تھا اُس میں ضعف آگیا۔ اور رفتہ رفتہ منجر ہوا اُس ناقابل برداشت واقعۂ کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ وہ ایسی نالائق حرکت مسلمانوں سے ہوئی ہے کہ اگر سچ پوچھو تو دُنیا میں مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ ہم کو تو اس واقعے کا خیال کر کے وہ یہود کا فلم تقتلون انبیاء اللہ ان کنتم مؤمنین یاد آجاتا ہے۔ کیا بات کا بتنگڑ بن گیا کہ کچھ کہتے نہیں بن پڑتی عیسائی بڑے شد و مد کے ساتھ اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے عورتوں پر پردے کی قید لگا کر اور مردوں کو متعدد نکاحوں کی اجازت دے کر عورتوں کے حقوق کو بالکل پامال کر دیا۔ اور مسلمانوں کی بیبیاں بہو بیٹیاں لونڈیوں سے بدتر۔ ہوئی نہ ہوئی برابر۔ مگر ایسی ہوئی نہ ہوئی برابر ہیں کہ اُن عورتوں ہی کی وجہ سے مسلمان سُنّی اور شیعہ دو فریق ہو رہے ہیں ایک دوسرے کے مخالف۔

سوال۔ اچھا پھر آپ سُنّی ہیں یا شیعہ؟

جواب۔ نرا مسلمان۔ نہ سُنّی نہ شیعہ۔ سُنّی شیعہ بننے کا اب وقت نہیں رہا۔ آج کو وہ لوگ زندہ ہوتے جو اصل میں ایک دوسرے سے لڑتے تھے تو میں تم کو دکھاتا کہ سُنّی ہوں یا شیعہ۔

سوال۔ وہ تو اب کیا زندہ ہو سکتے ہیں مگر فرض کیجئے کہ آپ اُس زمانے میں ہوتے تو آپ کیا ہوتے؟

جواب۔ جو شخص واقعات کو مذہب میں نہ آنے دے وہ مفروضات کو مذہب میں کیوں دخل دینے لگا؟

سوال۔ یہ تو ٹالنے کی سی باتیں ہیں۔

جواب۔ میں ٹالتا تو نہیں۔ تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں ایسے فضول بکھیڑوں کو مذہب سے متعلق نہیں سمجھتا۔

سوال۔ تو یوں کہیئے کہ آپ کی رائے سُنّی شیعہ کسی سے نہیں ملتی۔

جواب۔ پوری پوری تو سُنّی شیعہ کسی کی رائے سے بھی نہیں ملتی۔

سوال۔ مہربانی فرماکر اس کی ذرا صراحت کیجئے۔

جواب۔ دُنیا کے اعتبار سے تو میں شیعہ ہوں یعنی اگر میرے ہوتے وہ واقعات پیش آئے ہوتے تو میں غالباً اہل بیت کا ساتھ دیتا۔ نہیں معلوم اُس وقت میری یہ رائے ہوتی یا نہ ہوتی مگر جہاں تک ان جھگڑوں کے حالات مجھ کو معلوم ہوئے ہیں اگر بس یہی ہیں تو میں تو مر جاتا اور حضرت فاطمہؓ کی آنکھ پر میل نہ آنے دیتا اور جو کچھ وہ فرماتیں بجا یا بے جا سر ہو اُس میں فرق نہ کرتا۔ اسلامی سلطنت رہتی یا جاتی اور جاتی ہی کیوں۔

سوال۔ بھلا آپ کی شیعیت تو معلوم ہوئی اب یہ فرمایئے کہ آپ سُنّی کیوں کر ہیں۔

جواب۔ ہاں سُنّی اس طرح پر ہوں کہ جو لوگ خلافت پر قابو پا گئے جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ان کو بھی اسلام کا خیر خواہ اور نہ صرف خیر خواہ بلکہ محسن سمجھتا ہوں اور کسی طرح کی نیت بد اُن کی طرف منسوب نہیں کرتا اور نہیں کر سکتا۔

سوال۔ تو آپ کٹّے سُنّی ہیں۔ پھر آپ اپنے تئیں کس بات میں مستثنیٰ کرنا چاہتے تھے؟

جواب۔ اس بات میں کہ سُنّی ان جھگڑوں کو جزو دین قرار دیتے ہیں اور مجبور ہو کر اُن کو واقعات سے انکار کرنا پڑتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں میں کسی طرح رنجش اور کشیدگی اور رُکاوٹ تھی ہی نہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ انکار بداہت ہے۔ میں کہتا ہوں تھی اور ضرور تھی اور ہونی چاہیئے تھی۔ اور آخر کار وہ ظاہر ہوئی یہ ہوئی۔ اور بُری طرح پر ہوئی لیکن اس کو دین سے کچھ سروکار نہیں نہ ہمارے دین سے اور نہ خود اُنکے دین سے۔ لوگوں نے خدا میں اور رسول میں اور دین میں اور دُنیا میں عجیب خلط مبحث کر رکھا ہے۔ پیغمبر میں وہ تقدس چاہتے ہیں جو خدا کے ساتھ خاص ہے۔ فرشتوں کو بھی اُس کی ہوا نہیں لگی اور نہ صرف تقدس بلکہ ایک طرح کی خدائی۔ خدا اور رسول کو تو اب گڈمڈ کیا ہے کہ

دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہی۔ وہی یہود اور عیسائیوں کا سا رنگ ہو کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کو اتنا بڑھایا اتنا بڑھایا کہ بیٹا بنا کر خدا کی گود میں جا بٹھایا مسلمانوں نے بھی باوجودیکہ سارے قرآن سے توحید ٹپکی پڑ رہی ہو اور پیغمبر صاحب نے بھی اس کی رخنہ بندیوں میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ قبر شریف کی نسبت تاکید فرماتے رہے کہ خبردار جو میری قبر کو مسجد بنایا ہوگا۔ اُن کو کیا خبر تھی کہ اُن کی اُمت کے کتنے بزرگوں کی قبریں مسجد بنائی جائیں گی، لوگ مرے ہوئے بزرگوں کو سجدے کریں گے، اُن سے حاجتیں مانگیں گے صحابہ میں بعض لوگ ملک فارس کے بادشاہوں کا ادب قاعدہ دیکھ کر آئے تھے، چاہا کہ اسی طرح کی تعظیم پیغمبر صاحب کی کریں۔ یہاں تعظیم کے لیے لوگوں کا سروقد کھڑا ہونا تک ناگوار تھا کہ کہیں تعظیم کی عبادت نہ بن جائے۔ کسی بات کی نسبت ایک شخص کے مُنہ سے نکلا اگر خدا اور اُس کا رسول چاہے (اور یہ کلام اب ہم لوگوں کا روزمرہ ہی) آپ نے سخت ناخوش ہو کر فرمایا کہ تم مجھ کو خدا کا شریک بناتے ہو۔ غرض باوجودے کہ سارے قرآن سے توحید ٹپکی پڑ رہی ہو اور پیغمبر صاحب نے بھی اس کی رخنہ بندیوں میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اس پر بھی مسلمان احمد بلا میم تک تو کہہ گزرے کہ یا ابن اللہ سے بھی بڑھ کر ہو۔ پیغمبر صاحب بیچ فرمایا کرتے تھے کہ مسلمانو تم پیچھے پیچھے اہل کتاب کے قدم بقدم چل کر رہو گے سو ہو رہا ہی۔ اِدھر تو خدا اور رسول کے ایک ذات کر دینے کے پیچھے پڑے ہیں اور اُدھر دنیا اور دین میں ایسا بیر ڈال رکھا ہو کہ کسی طرح دونوں میں التیام نہیں ہو سکتا۔ ایسے ایسے بکھیڑے دین کو لازم کیئے جائیں گے تو وہ دین اختلاف سے محفوظ رہ نہیں سکتا۔ دین کی نسبت میں نے جو اپنا خیال ظاہر کیا تمھاری تسکین کے لیئے اس کی سند میں ایک حکایت بیان کرتا ہوں کہ جنگِ اُحد تو سُنی ہوگی۔ اُس لڑائی میں مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے تھے۔ یہ گرے لوٹ پر کفار نے کمین میں سے نکل اُن پر تیروں کی ایسی رَو برسائی کہ بھاگتے ہی بن پڑی، اور بھاگے بھی تو ایسے بدحواس ہو کر کہ پیغمبر صاحب کی بھی خبر نہ لی۔ اُسی گھبراہٹ میں کسی دشمن نے یہ بھی اُڑا دی

کہ خدانخواستہ پیغمبر صاحب تو شہید ہوئے۔ اس سے مسلمانوں کو اور بھی بے دلی ہوئی کہ اب کہاں کا دین اور کیسا اسلام ناحق اپنے لوگوں سے بھی کیوں بگڑے۔ اُدھر پیغمبر صاحب شہید تو نہیں مگر ہاں زخمی ہوئے تھے اور گو لشکر منتشر ہو گیا تھا مگر پھر بھی کچھ آدمی پیغمبر صاحب کے ساتھ لڑنے مرنے کو طیار موجود تھے۔ آخر پیغمبر صاحب کے چچا حضرت عباسؓ نے کہ وہ بڑے جہیر الصوت آدمی تھے خوب زور سے للکارا کہ لوگو کدھر بھاگے جاتے ہو پیغمبر صاحب تو یہ موجود ہیں اِدھر آؤ۔ اس آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ سارے مسلمان سمٹ آئے سب نے مل کر کفار پر حملہ کیا اور مار ہٹایا۔ اس لڑائی کا قرآن میں کئی جگہ مذکور ہے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں وما محمد[1] الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علےٰ اعقابکم ومن ینقلب علےٰ عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا یعنی محمد بشر بریں نیست ایک رسول ہیں ان سے پہلے بھی رسول ہو چکے ہیں تو اگر یہ مرجائیں یا مارے جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں اُسی شرک و بُت پرستی کی طرف پھر لوٹ جاؤ گے اور جو اُلٹے پاؤں شرک و بت پرستی کی طرف پھر لوٹ جائے گا تو وہ خدا کا کیا بگاڑے گا۔ اس سے یہ بات نکلی کہ دین خدا کا ہے اور پیغمبر صاحب کو خدا نے دین کی تعلیم کے لیئے مامور فرما دیا تھا۔ اگر وہ دُنیا میں نہ بھی ہوں جیسا کہ سخت افسوس ہے کہ وہ تیرہ سو برس سے نہیں ہیں تاہم اُن کے نہ ہونے سے دین میں کسی طرح کا خلل واقع نہیں ہونا چاہیئے۔ بس اب تم آپ انصاف کر لو کہ پیغمبر صاحب کے حواریوں اور شاگردوں اور رفیقوں اور عزیزوں کی باہمی شکر رنجیوں اور کشیدگیوں کو دین میں کیا دخل ہو سکتا ہے۔ اور یہیں سے یہ بھی سمجھ لو کہ پیغمبر صاحب کے بعد دین کے لیئے کسی نائب یا خلیفہ یا امام کی بھی ضرورت ہے یا نہیں۔

---

[1] اور محمد اس سے بڑھ کر اور کیا کہ ایک رسول ہیں اور بس ان سے پہلے (اور) بھی رسول ہو گزرے ہیں اگر (محمد اپنی موت سے) مرجائیں یا مارے جائیں تو کیا تم اُلٹے پیروں (کفر کی طرف) پھر لوٹ جاؤ گے اور جو اُلٹے پیروں (کفر کی طرف) لوٹ جائیگا وہ خدا کا تو کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔

فرقہ صوفیہ

سوال - یہ تو بڑا بھاری جھگڑا تھا اور آپ نے بڑی ہی آسانی سے اس کو طے کیا میرے دل کو تسکین ہوگئی جزاک اللہ خیرا - اسی طرح کوئی بیان شافی صوفیوں و رشانتیوں کے بارے میں بھی فرما دیجئے تو میں شاید آپ کو زیادہ تکلیف نہ دوں - ہر چند سُنی شیعوں کا سا تو اختلاف نہیں مگر خدا ایک رسول ایک قرآن ایک پھر یہ الگ الگ فرقے کیسے؟

جواب - لوگ تو مولویوں کے ڈر کے مارے اپنے مذہبی خیالات کے ظاہر کرنے میں مضائقہ کیا کرتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کفر کا فتویٰ جاری کردیں اور تم چاہتے ہو کہ صرف مولوی نہیں بلکہ تمام اسلامی فرقے اور ہندو اور عیسائی اور یہود غرض ساری دنیا مجھ کو کافر بنائے کیوں کہ میری مت کسی سے نہیں ملتی میری مت تو یہ ہے کہ میرے سوائے کسی کا مذہب ٹھیک نہیں اور سب کا ٹھیک ہے۔

سوال - یہ تو عجیب بات ہے۔

جواب - بے شک عجیب ہے۔ مگر اُسی وقت تک کہ تم نے اس کو سمجھا نہیں سمجھے پیچھے کچھ بھی عجیب نہیں۔

سوال - تو میں سمجھ بھی چکا۔

جواب - ابھی تم سمجھو اور تمہارا اچھا سمجھے بات معقول ہو اور بیان کرنے والا سمجھانے پر قادر تو کیوں نہ سمجھو؟

سوال - بھلا فرمائیے تو سہی۔

جواب - میرے نزدیک مذہب شخصی چیز ہے یعنی ہر شخص اپنا مذہب رکھتا ہے نفسی نفسی زر وازرۃ وزر اخرٰی[1] یوم یفر المرء من اخیہ وامہ وصاحبتہ وبنیہ لکل امرء منھم یومئذ شان یغنیہ[2] ان باتوں سے کیا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا عقیدہ یا عمل اس کے سوائے کسی دوسرے کے کام کا نہیں۔ میرا مذہب میرے لیئے ٹھیک ہے اس لیئے کہ اس سے مجھ کو اطمینان ہے اور میں اس کے

---

[1] اور (روز قیامت کے دن) کوئی شخص کسی دوسرے کا بار (گناہ) اپنے اوپر نہیں لے گا۔ [2] جس دن (ایسی نفسی نفسی پڑے گی کہ) آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی جورو اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا ان (رشتہ داروں) میں سے ہر شخص کو اس دن (اپنی اپنی نجات کا) فکر لگا ہوگا۔

ذریعے سے نجاتِ آخرت کی اُمید رکھتا ہوں۔ رہے دوسرے لوگ مجھ کو ان کے مذہب سے تعرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور جوں کہ ان کے مذہب میرے کام نہیں آ سکتے ہیں ان کو اپنے لیے کیونکر ٹھیک کہہ دوں۔ کان پور میں ایک شخص نے کسی پلٹن کے موزوں کا ٹھیکہ لیا۔ وہاں چمڑے کا کام نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ موزے طیار ہو گئے تو وہ اُن کو پلٹن کے سارجنٹ کے پاس لے گئے جس کی پسند پر موزوں کا پاس ہونا موقوف تھا۔ وہ سارجنٹ تھا ذرا خوش مزاج سا آدمی۔ ٹھیکہ دار صاحب نے پوچھا کیوں صاحب سب ٹھیک ہے سارجنٹ نے کہا سوائے اس ایک کے جو تم میرے لیے بنوا کر لائے ہو کوئی بھی ٹھیک نہیں۔ یہ سُن کر وہ ٹھیکہ دار بہت سٹ پٹایا۔ آخر کو سارجنٹ نے کہہ دیا۔ اور سب موزوں کو نادرست بتانے سے اُس کا کیا مطلب تھا۔ جیسے میں نے تم کو سمجھا دیا کہ میں دوسرے مذہبوں کو کسی غرض سے کہتا ہوں کہ ٹھیک نہیں۔

سوال۔ بات تو معقول ہے۔ اچھا آپ نے سب کو ٹھیک کیوں کر کہا ؟

جواب۔ یہ بھی بتا ہی دوں ہے سب کو ٹھیک کہا کل حزب بما لدیھم فرحون کے لحاظ سے ہر شخص عقل رکھتا ہے اور جتنی اور جیسی جس کی عقل ہے اتنی ہی اُس سے باز پُرس ہو لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا ان اللہ لا یظلم الناس شیئا۔

سوال۔ خیر یہ بات تو ذہن میں جمتے ہی جمے گی۔ صوفیوں و مشائخوں کے بارے میں تو اپنی رائے بیان کیجیے کہ مسلمانوں میں ان کا بھی ایک بڑا گروہ ہے۔

جواب۔ میں تم سے کتنی بار کہوں اور کیوں کر کہوں کہ میں اپنے نفس کے سوائے کسی کے مذہب کی نسبت بُری یا بھلی رائے نہیں دینی چاہتا۔ نہ اس کی مجھ کو کوئی ضرورت اور نہ اس کا مجھ کو کوئی حق۔ مذہب ایک معاملہ ہے بین اللہ و بین العبد جس میں کسی دوسرے کو کچھ دخل نہیں۔ مذہب کا سارا مدار ہے نیت پر اور خدا کے سوائے کوئی کسی کی نیت سے آگاہ ہو نہیں سکتا ؎

بر آستانۂ میخانہ گر سرے بینی   مزن بپائے کہ معلوم نیست نیتِ او

سوال۔ یہ سچ ہے و لکن لیطمئن قلبی۔

جواب۔ مذہب کے سارے اختلافات پیدا ہوئے ہیں انسان کی خاص طرح کی بناوٹ سے اور اس میں جو مصلحت ہے اس کا سمجھنا مقدور بشر نہیں۔ انسان کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن یا ایک جسم اور ایک روح دونوں میں جو تعلق ہے وہ بھی اسرار الٰہی میں سے ایک بھید ہے جو کسی پر منکشف نہیں قل الروح من امر ربی۔ بہرکیف شارع نے انسان کے ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اور قرآن جیسے نماز روزے کی تاکید کرتا کہ یہ اعمال ظاہر ہیں ویسے ہی حسد کی، غیبت کی، مردم آزاری کی، بخل کی، طمع کی، حرص کی، بے صبری کی، خودغرضی کی، بے حیائی کی باتوں کی سخت مذمت کرتا اور اُس کو جس میں بدعادتیں ہوں مستوجب عذاب الٰہی قرار دیتا ہے۔ اسلام نہ صرف اس کا نام ہے کہ آدمی اپنا ظاہر درست کرے بلکہ باطن بھی۔ خدا نے یہاں تک تو فرما دیا ہے وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ[1] اور واقع میں پہلے دل میں ارادہ پیدا ہوتا ہے تب اُسی کے مطابق افعال سرزد ہوتے ہیں۔ باطن کی اصلاح کے بدون ظاہر کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر کسی خبیث درخت کو دور کرنا چاہتے ہو تو اس کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکو ورنہ ٹہنیوں کے قلم کر دینے سے تو پھر کونپلیں پھوٹیں گی اور شاید زیادہ زور سے۔ تو مسلمانوں کو چاہیئے تھا کہ ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کو ساتھ ساتھ لیئے چلتے بلکہ اصلاح باطن کا زیادہ اہتمام کرتے۔ لیکن ایک تو اصلاح باطن نفوس پر زیادہ شاق ہے۔ اور دوسرے خبث باطن پر کسی کو آگہی ہو نہیں سکتی کہ لوگوں کی ملامت یا حاکم کی سزا کا ڈر ہو۔ پس لوگوں نے آسان بات پکڑ لی اور ہمتیں صرف اصلاح ظاہر میں مقصور ہو کر رہ گئیں۔ مولوی لوگ جو وعظ و احتساب کی خدمتیں لے کر بیٹھے تھے ان کی نظریں بھی لوگوں کے ٹخنوں پر پڑ کر رہ گئیں۔ کہیں ڈھکے ہوئے تو نہیں یا بڑی بلند پروازی کی تو ڈاڑھی مونچھوں کی تراش خراش کو دیکھا یا ایسا ہی کسی کے سر پر شیطان

---

[1] اور جو تمہارے دل میں ہے چاہے اُس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تم سے اُس کا حساب لے ہی گا۔

سوار ہوا تو اُس کے گردے کو تاڑ لیا۔ دین کی دیکھ بھال جاپنچ پڑتال ہو چکی۔ لیکن بعض اللہ کے ولی ایسے بھی تھے جو افسوس کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ دین کے جزو ضروری یعنی اصلاح باطن سے بالکل قطع نظر کیا جا رہا ہی۔ اُنھوں نے صوفیۂ کرام کا سلسلہ جاری کر کے دین میں جو ایک بڑا رخنہ پڑ گیا تھا اس کو بند کرنا چاہا۔ یعنی ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے یہ تھے حقیقت میں اسلام کے بڑے رفارمر۔ لیکن حضرتِ انسان ہیں بے پیندی کے بدھنے۔ ان سے ایک وضع پر کیا رہا جاتا ہی، اصلاح باطن کی آڑ پکڑ کر شرعِ ظاہر کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اب مولویوں یعنی علمائے ظاہر میں اتنی خرابیاں نہیں جتنی کہ ان مشائخ مدعیان صوفیہ میں ہیں ع بدنام کنندۂ نکونامے چند۔ اُنھوں نے تو کچھ ایسا طریقہ اختیار کیا ہی کہ جس سے اسلام ہی بیخ و بُن سے متزلزل ہوا جاتا ہی۔ یعنی موافق اور مخالف ساری دُنیا جانتی ہی کہ خدا کو دین مذہب کے متعلق جو کچھ اپنے پیغمبرؐ کی زبان سے کہلوانا منظور تھا وہ بجنسہ حرف بحرف قرآن میں لکھا ہوا موجود ہی۔ پس قرآن مجید مسلمانوں کا مذہبی کوڈ یعنی مجموعۂ قوانین ہی۔ رہی حدیث، تفسیر، فقہ، یہ بمنزلۂ تشریحات اور نظائر کے ہیں۔ پھر پیغمبر صاحب نہیں بھیجے گئے تھے کسی گروہ خاص کی طرف بلکہ روئے زمین کے تمام آدمیوں کی طرف جہاں نبوت کا بلاوا پہنچے ما ارسلنٰک الا کافۃ للناس[ا] ور اُن کی تعلیم بھی عام تھی جیسی اپنوں کو ویسی غیروں کو، جیسی شہری کو ویسی دیہاتی کو، جیسی پڑھے لکھوں کو ویسی ان پڑھوں کو، جیسی مردوں کو ویسی عورتوں کو، اور بالیقین معلوم ہی کہ پیغمبر صاحب کو جو حکم ہوتا تھا بے کم و کاست ہو بہو سنا دیتے تھے، لکھوا دیتے تھے۔ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ[۲] بعض مقامات میں تادیب کے طور پر پیغمبر صاحب کو زجر ہی۔ جیسے عبس و تولی ان جاءہ الاعمٰی[۳] بعض جگہ ان کے ایسے حالات کا بیان ہی جن کو آدمی ظاہر اور مشتہر کرنے میں مضائقہ کرتا ہی۔ جیسے

---

[۱] اور (اے پیغمبر) ہم نے تو تم کو تمام (دُنیا) کے لوگوں کی طرف (پیغمبر بنا کر) بھیجا ہی۔ [۲] اے پیغمبر جو (احکام) تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئے ہیں (بلا کم و کاست لوگوں کو) پہنچا دو اور اگر تم نے (ایسا) نہ کیا تو (سمجھا جائے کہ) تم نے خدا کا (کوئی) پیغام (بھی لوگوں کو) نہیں پہنچایا۔ [۳] (محمدؐ) اتنی بات پر چیں بجبیں ہوئے۔

قصۂ افک عائشہؓ اور نکاح زینبؓ۔ کونسا ایسا بے انصاف ہٹ دھرم ہوگا جو اِن واقعات کے ہوتے ایک لمحے کے لیے تبلیغ وحی کے بارے میں پیغمبر صاحب کو متہم کر سکے۔ وہ خود فرماتے ہیں[1] لن اجد من دونہ ملتحدا الا بلاغا من اللہ و رسالاتہ۔

سوال۔ اچھا پھر ان مشائخین نے یہ کیا طرز تعلیم اختیار کیا ہے جس کی فری میسنوں کی طرح پردہ داری ہے اُس تعلیم کو کہتے ہیں کہ سینہ بسینہ چلی آتی ہے۔ بہرکیف قرآن حدیث سے خارج ہوئی اور خارج ہوئی تو داخل اسلام کیوں مانی جائے؟

جواب۔ ہم تو اصول مذہب کی رو سے بدعت کے سوائے اس کا کوئی اور نام رکھ نہیں سکتے۔ اگر اصلاح ظاہر بے اصلاح باطن ریاکاری ہے تو اصلاح باطن بے اصلاح ظاہر کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ علمائے ظاہر یعنی مولوی لوگ اگرچہ جیسا چاہیئے اصلاح باطن پر زور نہیں دیتے، جیسا چاہیئے اُس کا اہتمام نہیں کرتے اور اسی لیے وہ لوگ جو ظاہر شرع کے پابند ہیں اُن کے معاملات جیسے چاہئیں درست نہیں ہوتے تاہم ان ظاہر پرستوں کو اصلاح باطن سے انکار تو نہیں۔ پوچھا جائے تو کیا مجال اصلاح باطن کی شان میں توہین کا ایک حرف ان کے منہ سے نکلے اور کیوں کر نکل سکتا ہے جب کہ قرآن میں حدیث میں ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح اس طرح ساتھ چلتی ہے جیسے گاڑی کے پہیے۔ وہ بہت کریں گے تو حیل شرعی ایجاد کریں گے۔ جیسے تم نے سُنے ہوں گے کہ ایک صاحب بڑے مالدار تھے اور زکوات نہ دینے کا حیلہ سوچ رکھا تھا کہ میاں بی بی ٹھٹھیر ابدلائی کیا کرتے تھے یعنی جب دیکھا کہ برس پورا ہونے پر آیا میاں نے سارا مال و متاع بی بی کے نام زبانی ہبہ کر دیا۔ بی بی جو نو مہینے سے زیادہ پیٹ میں بچے کے رکھنے کی روادار نہ تھیں مال کو برس دن اپنے پاس کیا ٹھہرنے دیتیں۔ غرض وہی مثل تھی کہ گھی کہاں گیا کھچڑی میں۔ زکوات بھی نہ دینی آئی اور ظاہر شرع کے صدقے جایئے کہ خدا رسول سے بھی

---

[1] اور نہ اس کے سوا کہیں مجھ کو ٹھکانا مل سکتا ہے میرا بچاؤ تو اسی میں ہے کہ خدا کی طرف سے (جو حکم آیا ہے لوگوں کو) پہنچا دوں۔

شرمندہ نہ ہونا پڑا۔ منظور نہیں کہ لوگوں سے چار آنکھیں کیجئے ورنہ ہم کو تو اِن ہی مولویوں کی جوتیوں کا صدقہ ایسے ایسے مسئلے معلوم ہیں کہ نہ نماز پڑھو، نہ روزہ رکھو، نہ زکوٰت دو، نہ حج کو جاؤ، جس کا چاہو مال مارو، جس پر جی میں آئے ظلم کرو اور پھر دیندار کے دیندار، بہشت کے مستحق، رضائے الٰہی کے اُمید وار۔ خیر تو مولوی لوگ بہت کریں گے تو حیل شرعی ایجاد کریں گے مگر اصلاحِ باطن کے سامنے سب سرنگوں ہیں اور سرنگوں ہوئے بدوں ان کو بن نہیں آتی۔ لیکن باطن والوں کا ظاہر یعنی شریعت کے ساتھ کیا حال ہے۔ رسول شاہی، سترہ شاہی وغیرہ وغیرہ کتنے گروہ کے گروہ تو ایسے ہیں جنھوں نے شریعت کی مخالفت کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ نماز نہ پڑھیں، روزہ نہ رکھیں، مسلمانوں کی صورت نہ بنائیں نہ بنانے دیں، کھُلے خزانے بھنگ پئیں، چرس کے دم لگائیں۔ غرض شریعت کے جتنے احکام ہیں سب سے مستثنیٰ، اور طرّہ یہ ہے کہ نادم نہیں۔ احکام شریعت کی نسبت پکارے کہتے ہیں کہ یہ پابندیاں عوام الناس کے لیئے ہیں۔ یہود کی طرح کہ وہ اپنے تئیں اَبْنَاءُ اللّٰہِ وَاَحِبَّاءُ[1] سمجھا کرتے تھے۔ اور اُن کو پیغمبر زادگی کا بڑا گھمنڈ تھا۔ یہ لوگ بھی خدا کے ساتھ ایک ادعائی خصوصیت جتاتے ہیں دنیا بھر کے آوارہ اور کاہل اور مکاّرہ اسی گروہ میں جا کر کھپتے ہیں۔ اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ دین اور مذہب کو تو سمجھتے بوجھتے خاک نہیں اِن فقیروں کے گرد لٹّو ہو رہے ہیں جس کی حقیقت بجز اس کے نہیں ہے کہ ان کو خدا رسول کے کہنے کا اعتبار نہیں۔ دلوں میں یہ وہم بیٹھے ہوئے ہیں کہ باطن کا حال کون جانے ہے

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر   تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

کیا خبر ہے کہ کون کس مصلحت سے کس حال میں ہے۔ اور اے کاش صرف اسی قدر ہو کہ دوسرے کے دل کا حال معلوم نہیں۔ مصیبت تو یہ ہے کہ ظاہر کے خراب ہونے کو باطن کے آباد ہونے کی شرط قرار دے

---

[1] اللہ کے بیٹے اور اُس کے چہیتے ہیں۔

رکھا ہی۔ حقیقت میں خدا کی رزّاقیاں ہیں کہ ان نکموّں کو بھی رزق پہنچانا منظور ہی ع جو احمق ز جہاں
باقی ست مفلس کس نیماند۔ اگر سب ہمارے ہی سے خیال کے ہو جائیں تو ملک میں لاکھوں بندگان خدا
بھوکے مرنے لگیں۔ مگر یہ کیا ستم ہی کہ ان کا دوزخ شکم بھرنے کے لیئے سارا ملک بھوکا مرا جاتا ہی۔ ملک کی
بے دولتی کے جہان اور اسباب ہیں ان میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی ہی کہ مُفتے ہم کو لوٹے لیئے جاتے ہیں
یہ سچ ہی کہ فقرا، یا مشائخ کے گروہ میں سب کا ایک رنگ نہیں اور ان میں ایسے بھی ہیں اور وہی خطاب مشائخ کے
اہل بھی ہیں جو شریعت کا ادب ملحوظ رکھتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے ہم جو دیکھتے ہیں تو نفس اسلام کو مولویوں سے
اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا کہ مشائخوں سے پہنچا۔ یہ تو دیکھو کہ اسلام میں ایسا کون مذہب ہوگا جس کا اتنا سارا
عمل ہی۔ کوئی ایک عمل ظاہر یا باطن کا بتاؤ جو وہی یا یوں ہی سے فرق کے ساتھ ویسا ہی دوسرے دینوں میں *
نہ ہو اور فرق ہوگا بھی تو اعمال ظاہر میں ہوگا جہاں تک دین کو باطن کے ساتھ تعلق ہی بلا تفاوت سب دین
ایک ہی طرح کے دکھائی دیتے ہیں۔ جھوٹ کو سب بُرا کہتے ہیں۔ مردم آزاری کسی کے یہاں بھی جائز نہیں
وقس علی ہذا۔ پس کوئی تو خصوصیت ہونی ضرور ہی کہ اسلام اُس پر ناز کرتا ہوا بھی بھلا لگے۔ یہ پہیلی کچھ
میں نے ہی نہیں بوجھی کہ ناحق کی شیخی مارنے لگوں مگر ہاں اتنی بات ضرور کہوں گا کہ لوگ اس میں سوچ بچار نہیں
کرتے اور یہی بانی کے مرنے کی جگہ ہی۔ وہ خصوصیت جس پر نہ صرف اسلام کو بلکہ اسلام کے ہر ایک نام لیوا کو فخر
کرنا چاہیئے توحید ہی اور بس۔ کہ خدا کے بارے میں لوگوں کے عقائد بہت ہی ڈانواں ڈول ہو گئے تھے اور اب بھی ہیں
سب سے پچھلا مذہب اسلام تھا، خدا تا قیام قیامت اس کا بول بالا رکھے اور رکھے گا جس نے آب حیات توحید کو
تمام آلائشوں سے فلٹر کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اجی جہاں تک اعمال ظاہر پر نظر کرتے ہیں اور جہاں تک انسان کے
برتاؤ سے معاملات سے اس کے باطن کا پتہ لگتا ہی ہم تو کسی مذہب میں کسی طرح کی کسر نہیں دیکھتے بلکہ انصاف کی
بات تو یہ ہی کہ بعض صفتیں دوسرے مذہب والوں میں ہم اپنے سے بہتر پاتے ہیں مثلاً ہندوؤں ہی کو لو کہ
ان بیچاروں کا مذہب سب سے زیادہ بودا اور بُھسبُھسا ہی اور خدا کی مرضی یوں ہوئی کہ ہمارا اُن کا چولی دامن کا

ساتھ ہو۔ اگر ہٹ دھرمی نہ کریں تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ رحم جیسا ان میں ہے اس کا عشر عشیر بھی
ہم میں نہیں۔ آدمی تو بڑی چیز ہے جانوروں اور درختوں تک کا ستانا بھی اُن کے یہاں منع ہے دیکھئے نہیں
کہ یہ لوگ گوشت کو چھوتے تک نہیں۔ گائے بیل کی کیسی خدمت کرتے ہیں سانپ جیسے موذی جانور کو
بھی تو مارنا نہیں چاہتے۔ یہی حال ہے درختوں کی حفاظت کا کہ ہرے درخت کی کوئی ٹہنی تک تو توڑلے
خاص کر پیپل کی۔ بارہا اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہندو دونے لیے ہوئے چیونٹیوں کے واسطے کھانڈ بکھیرتے
پڑے پھرتے ہیں۔ ایسا کونسا بازار ہوگا جس میں ہندوؤں کی طرف سے بارہ مہینے پانی پلانے کی پونہ بیٹھی
رہتی ہو۔ جانوروں کے لیے جابجا پانی کی نادیں گڑی رکھتے ہیں۔ سدا برت بھی جاری ہیں اور یوں
بہتیرا ہی دان پُن ہوتا رہتا ہے۔ غرض ایسی بہت سی باتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں دیا ہم سے
کہیں بڑھ کر ہے۔ اور اگر نفس کشی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو عبادتوں میں سب سے زیادہ روزہ۔ بے شک
گرمی کے پہاڑ دنوں میں کامل ایک مہینے دن دن بھر بھوکا پیاسا رہنا کچھ آسان کام نہیں۔
صد آفریں ہے مسلمانوں کو کہ ایسی محنتِ شاقہ خوش دلی کے ساتھ انگیز کرتے ہیں۔ لیکن کوئی کوئی برت
ہندوؤں میں بھی ایسا کٹھن ہے کہ آدمی کو للہ کر دیتا ہے اور یوں اور بہت سی ریاضتیں ہیں کہ کرنا تو کرنا
دیکھنے سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کتنے ہندو جوگی نظر پڑے کسی نے تو اٹھائے اٹھائے ہاتھ
سکھا دیا ہے۔ کوئی درخت میں اُلٹا پڑا لٹک رہا ہے۔ ایک کو دیکھا خیر نشتر نہیں تو اچھی خاصی نوک دار کیلیں
تختے میں جڑ رکھی ہیں۔ اور اُن ہی پر لیٹتا بیٹھتا ہے۔ اور ایسے تو بہت جو شاید دن رات میں گھڑی دو گھڑی کو
بیٹھ جاتے ہوں تو بیٹھ جاتے ہوں ورنہ جب دیکھو کھونٹے کی طرح زمین میں جمے کھڑے ہیں۔ ہاتھور میں
ایک گوسائیں جی تھے جو ہر روز اشنان کرتے وقت ساری آنتڑیاں منہ کے رستے باہر نکال کر گنگا جلی میں
دھوتے اور پھر پیٹ میں اُتار لیتے۔ غرض بدن کو ستانے اور ایذا دینے کا کوئی پیرایہ نہیں جسے ہندو
فقیروں نے اختیار نہ کیا ہو۔ انگریزوں سے ہمارا ایسا میل جول نہیں مگر ریاضت کے طریقے ان میں بھی

ہیں ہزارہا عورتیں ہیں جو نن کہلاتی ہیں وہ ساری عمر اپنا بیاہ ہی نہیں کرتیں۔ پادریوں میں بھی ایک قسم کے پادری ہیں جن کو زندگی بھر مجرّد رہنا پڑتا ہے۔ اب ایک مکتی فوج نکلی ہے۔ یہ لوگ بالکل ہندو سنیاسیوں کی طرح بڑی ہی مصیبت مند زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک عورت کو دیکھ کر ایسا ترس آیا کہ کہا نہیں جاتا۔ اس کی عمر ایسی کوئی تیئیس برس کے لگ بھگ ہی ہوگی۔ اصل و لاین زاد۔ رنگت ایسی جیسے چاندنی پڑنے سے میلی ہو۔ بیچاری مذہب کے خبط میں آکر گاڑھے کی موٹی کھدر ساڑی باندھے ننگے پاؤں دھوپ میں گھسٹتی چلی جارہی تھی۔ فتحپوری کے سامنے شام کے وقت نہر کی پٹری پر ہر روز بلا ناغہ ایک نہ ایک پادری ضرور وعظ کہتا ہوتا ہے۔ اور میں بھی چلتے چلتے اد بدا کر تھوڑی دیر کے لیے اس کے پاس ٹھٹک جاتا ہوں۔ وہ وعظ کہتا اور لوگ اس کے ساتھ بحث کرتے ہوتے ہیں اور میں اس پادری کے حلم اور انکسار کو کھڑا دیکھا کرتا ہوں بازاری لوگ بے تمیزی سے اس کو بڑی سخت سخت باتیں کہہ گزرتے ہیں اور اس مرد خدا کی آنکھ پر میل بھی تو نہیں آتا۔

سوال۔ یہ تو آپ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ آدمی اسلام کی طرف سے بدعقیدت نہ ہوتا ہو تو ہو۔

جواب۔ بس اتنے ہی پانی میں تھے؟ اجی یہ دوسرے مذہب والے ریاضت تہیں اپنی بوٹیاں بھی توڑ توڑ کر چیل کوؤں کو کھلا دیں تب بھی تو اسلام کی گرد کو نہیں پا سکتے۔

سوال۔ کس بات میں؟

جواب۔ ہر ایک بات میں جس پر ان کو گھمنڈ ہو۔

سوال۔ ابھی ہندوؤں اور عیسائیوں کی دیا اور نفس کشی اور حلم کی مثالیں آپ نے بیان کیں۔ یہ نیکیاں مسلمانوں میں ہیں تو سہی مگر نہ ایسے درجے کی۔

جواب۔ تم نے یہ بھی خیال کیا کہ نیکی حد سے گزر جاتی ہے تو نیکی نیکی نہیں باقی رہتی بلکہ وہ بدی سمجھی جاتی ہے۔ اخلاق کی کتابوں میں تو پڑھا ہوگا مگر اس وقت خیال نہیں رہا کہ کوئی سی بھی صفت لو وہ جب تک اعتدال کے درجے میں ہے صفت ہے اور اعتدال سے ذرا بڑھی ذرا گھٹی عیب ہوئی مثلاً ہم ایک غصہ ہی کو

لیتے ہیں کہ خدا نے جتنے جاندار دنیا میں پیدا کئے ہیں اُن کی حفاظت کا سامان بھی اُن کے ساتھ موجود ہی کسی کو تو قوتِ پرواز دے دی ہی کہ کوئی اُس کو پکڑ نہیں سکتا۔ قرآن میں اس بات کو کیسی اچھی طرح بیان کیا ہی[1] یاایھا الناس ضرب مثل فاستمعوا لہ ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ و ان یسلبھم الذباب شیئا لا یستنقذوہ منہ ضعف الطالب والمطلوب ما قدروا اللہ حق قدرہ ان اللہ قوی عزیز فرماتے ہیں لوگو ہم ایک مثال بیان کرتے ہیں اُس کو کان لگا کر سنو کہ خدا کے سوائے جن معبودوں کو تم حاجت پڑے پر پکارتے اور اُن سے دعائیں مانگتے ہو اُن کی بےبسی کا تو یہ حال ہی کہ اگر سارے مل کر بھی ایک مکھی کو پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے۔ اور پیدا کرنا تو خیر بڑا کام ہی اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے جائے تو اُس سے چھڑا نہیں سکتے۔ کیا تو مکھی اور کیا مکھی کی بساط اور کیا تمھارے معبودوں کی کہ ایک مکھی ان کے پکڑے نہ پکڑی جائے افسوس ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہ جانی اللہ تو بڑا زبردست ہی سب پر غالب۔ خیر تو غرض یہ ہی کہ ہر جاندار کی حفاظت کا سامان اُس کے ساتھ موجود ہی کسی کو تو قوتِ پرواز دے دی ہی کہ کوئی اُس کو پکڑ نہیں سکتا۔ کوئی پانی میں روپوش ہی کہ کسی کو نظر نہیں آتا اور نظر آتا بھی ہی تو کس کی بلا کو غرض پڑی ہی کہ پانی میں غوطہ لگائے۔ کوئی ایسا غضب کا بھاگنے والا ہی کہ دو چار چھلانگوں میں یہ جا وہ جا نظر سے غائب۔ کسی کے دانت ہیں کسی کے پنجے ہیں۔ یہاں تک کہ مینہ بوندی اور سردی سے بچنے کے لئے پروں اور بالوں اور اُن کا قدرتی واٹر پروف بھی تو جلد بدن کے ساتھ سیا ہوا موجود ہی کہ وقت پر ڈھونڈنا نہ پڑے۔ مگر حضرت انسان ہیں کہ ہیں چھوئی موئی، سب سے زیادہ نازک مزاج اور دیکھنے میں بےسامان محض۔ تو ان کو سب سامانوں کے بدلے عقل دی اور عقل سے

---

[1] لوگو ایک مثال بیان کی جاتی ہی تو اس کو کان لگا کر سنو کہ خدا کے سوا جن (معبودوں) کو تم پکارتے ہو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کرسکتے اگرچہ اس کے (پیدا کرنے کے) لئے (سب کے سب) اکھٹے (ہی کیوں نہ) ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو اس کو اُس سے چھڑا نہیں سکتے (کیسے) بودے یہ (بت) جو (مکھی کے) پیچھے پڑیں (اور اس کو نہ پکڑ سکیں) اور (کیسی) بودی وہ (بےچاری مکھی) جس کا پیچھا کیا جائے (اور پھر بھی ہاتھ نہ آسکے)

ساتھ غصّے کا ہتھیار کہ یہ سان پر چڑھا ہو تو اس کی کاٹ غضب کی کاٹ ہے۔ ادھر تو بے غصّے کام نہیں چلتا کہ یہ نہ ہو تو دُنیا میں کوئی جینے بھی نہ دے اور اُدھر ویسا ہی خطرناک سے

آئے تو کہاں جائے نہ تباہی سے کوئی جائے جب تک اسے غصّہ نہیں آتا نہیں آتا

حکیم تو اُس کو نوع من الجنون بتاتے ہیں اور ہے بھی یوں ہی کہ آدمی کو غصّہ آتا ہو تو پھر اس کو آگا پیچھا کچھ نہیں سُوجھتا۔ آدمی اپنے آپے سے باہر ہو جاتا ہے یعنی جتنی دیر غصّہ رہے انسان انسان نہیں رہتا بلکہ حیوان بن جاتا ہے اور حیوان بھی مرکھنا موذی۔ پھر اس جادو کا توڑ اس زہر کا تریاق کچھ ہے تو عقل ہے کہ وہ غصّے کو بالکل سلب تو نہیں کر سکتی مگر ہاں حد سے بڑھنے بھی نہیں دیتی۔ عقل مندوں نے اس کے فرو کرنے کی تدبیریں نکالی ہیں کہ غصّہ آئے تو آدمی سامنے سے ٹل جائے، کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، پیاسا نہ بھی ہو تو پانی پیئے، یعنی طبیعت کو دوسری طرف مصروف کرے۔ اور مذہب فرماتا ہے الکاظمین الغیظ و العافین عن الناس کہ غصّے کو ضبط کرنا سب ریاضتوں سے بڑھ کر ہے۔ انسان میں جتنی عادتیں خلقی ہیں جانے والی تو اُن میں ایک بھی نہیں۔ اور اُن کو عادت نہیں بلکہ خاصیت سمجھنا چاہیئے جیسے پانی کی خاصیت ہے کہ وہ نشیب کی طرف کو بہتا ہے یا جیسے ہر ایک جسم کی خاصیت ہے کہ روک نہ ہو تو زمین پر گر پڑے۔ اسی طرح آدمی ہوگا تو غصّہ بھی رکھے ہی گا۔ ایسا کون ہے جس میں پتا نہیں۔ پس مذہب جس نے انسان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے اُس کے کھوٹے کھرے کی بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ انسان کی طبیعی خاصیتوں کے سلب کرنے کے درپے ہے یا اُن کے معتدل کرنے کے۔ اگر سلب کرنے کے درپے ہے تو جان لو کہ وہ مذہب ادعائے محال کرتا ہے۔ اور اپنے ارادے میں نہ کبھی کامیاب ہوا اور نہ آیندہ کامیاب ہو۔ ایسے مذہب والے اپنے نزدیک ایک ایسا انسان فرض کر لیتے ہیں کہ اُس طرح کا آدمی خدا نے کبھی پیدا ہی نہیں کیا اور پھر ایسے فرضی اور خیالی انسان کا نمونہ دکھا کر لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ایسے بنو۔ ارے بھائی کیسے بنیں؟ پیٹ کو کاٹ کر پھینک دیں؟ آنکھیں پھوڑ لیں؟ کانوں میں رُوئی ٹھونسے رہیں؟ خدا نے جو ضرور تیں

ہمارے پیچھے لگادی ہیں اِن کو جاکر کہاں پھینک آئیں؟ پیٹ ہی تو بھوک لگے ہی گی اور بھوک لگے گی تو
چار و ناچار کچھ نہ کچھ کھانا ہی پڑے گا۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کی ریاضتیں سُن کر جو تم اسلام کی
طرف سے بدعقیدت ہوئے وہ اسی قسم کی ریاضتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ انسانی خاصیتوں کے
بوجھ سے سبک دوش ہونے کی تدبیر میں لگے ہیں۔ سو ٹکر بڑا لیں جتنا چاہیں۔ وہ بوجھ تو مرنا ہی سے اُترے گا
اس زندگی میں تو اُترتا نہیں۔ اور جو دعویٰ کرتا ہے کہ میں اُتار سکتا ہوں جھک مارتا ہے۔ اس میں دو پہلو اور بھی
بُرے ہیں۔ ایک تو من وجہ اس میں اعتراض ہے خدا پر کہ اُس نے انسان کو ایسا کیوں بنایا ہے کسی باپ کا کیا دینا
آتا ہے۔ اُس نے بنایا جیسا چاہا یخلق ما یشاء[1] ہم اِس میں چون و چرا کرنے والے کون ہیں۔ دوسرے یہ تعلیم در پردہ
لوگوں کو نفاق اور ریا کی تعلیم ہے۔ اس موقع پر میں ایک قانونی مسئلہ بیان کرتا ہوں۔ اِس سے تم میرے مطلب کو
خوب سمجھو گے۔ یہ جو شراب افیون گانجا چرس بھنگ نشے کی چیزیں ہیں اور معلوم ہے کہ ہزاروں گھر اور
لاکھوں آدمی ان کی وجہ سے برباد اور تباہ ہوتے ہیں۔ سرکار کا منشا تو یہ ہے کہ ملک سے اِن کا رواج بالکل
اُٹھ جائے اور کوئی آدمی اِن کا نام بھی نہ لے لیکن بہت لوگوں نے اِن کو زندگی کی ضرورتوں میں داخل کر لیا ہے
کہ بدون اِن کے اُن سے مطلق صبر نہیں ہو سکتا۔ ننگے پھریں بھوکے مریں غرض ہر طرح کی تکلیفوں کو
سہار بھی جائیں مگر عمل کا وقت نہ ٹلنے دیں۔ تو اب سرکار کیا کرتی ہے کہ محصول کے پیچ کو کستی اور کڑا کرتی
چلی جاتی ہے۔ اور اِن باتوں کی آمدنی پہلے سے اضعافاً مضاعفہ بڑھ گئی ہے اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ مگر سرکار
یہ نہیں کرتی کہ اِن کی قطعی بندی اور ممانعت کر دے یا ایک دم سے ایسا بھاری محصول لگا دے کہ وہ بندی
اور ممانعت کا کام دے۔ کیوں کہ ایسا کرے تو لوگ مجبور ہو کر کھلم کھلا بغاوت نہ بھی کریں تو ہزار جتن کریں
کہ سرکار کے اچھے سے بھی ان کا انسداد نہ ہو سکے اور اِس کا ضروری نتیجہ یہ ہو کہ محصول بڑھنے کی جگہ اُلٹا
گھٹ جائے اور چُھپکے چُھپکے ان چیزوں کا استعمال بھی جاری رہے۔ بعینہٖ یہی حال ہے مذہبی احکام کا

---

[1] جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

کہ ان کو حد سے زیادہ سخت کر دیا جائے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ لوگ ان کی تعمیل سے بچنے کے لیے بہانے ڈھونڈیں حیلے تصنیف کریں۔ دل میں تو تعمیل کرنے کی ہی نہیں مگر جوں کہ انکار کرتے بن نہیں پڑتا حکم کو مانتے ہیں۔ لیکن وہی یہودیوں کا سا ماننا سمعنا وعصینا[1] تو پھر یہ نفاق اور ریا نہیں تو کیا ہے؟ اور نفاق اور ریا بھی خدا کے ساتھ! اگر اسی کا نام ریفارم اور اصلاح ہے تو ہم بے اصلاح ہی بھلے۔ اور یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ جو ریاضتیں ہندو جوگی اور عیسائی راہب کرتے ہیں اگر شرط دینداری ہوں اور نجات ان پر موقوف ہو تو کتنے آدمی ان شرطوں کو بجا لا سکتے ہیں اور خود ہندوؤں اور عیسائیوں ہی میں کتنے آدمی ان کو بجا لاتے ہیں۔ شاید لاکھ میں دو چار۔ تو لاکھ میں دو چار کے بجا لانے سے بشرطیکہ واقع میں خلوص سے بجا لاتے بھی ہوں تو وہ حکم سخت ممکن التعمیل نہیں کہلایا جا سکتا۔ دنیا جس طرز پر چلی آئی ہے اُسی طرز پر چلے گی۔ لکھنے کے لیے جو چاہو کتاب میں لکھ لو۔ یہ صفت ایک اسلام ہی میں دیکھتے ہیں کہ وہ آدمی کو آدمی تسلیم کرتا اور وہ اس پر اُسی قدر بوجھ رکھنا چاہتا ہے جس کو وہ آسانی کے ساتھ سہار سکے۔ اور یوں دوسروں کی دیکھا دیکھی مسلمان ایک پہاڑ اپنے سر لادنا چاہیں تو ان کی خوشی۔ اسلام بیچارے کا اس میں کیا دوش؟

سوال۔ یہ تو آپ نے دل کو لگتی ہوئی کہی۔ مگر وہ بات رہ گئی۔ آپ فرما رہے تھے کہ اسلام میں ایسی کونسی انوکھی تعلیم ہے جو دوسرے مذاہب میں نہیں۔

جواب۔ ہاں تو وہ انوکھی تعلیم توحید ہے۔ اب تو لوگ مسلمانوں کے غل غپاڑا مچانے سے کچھ کچھ تاویلیں بھی کرنے لگے ہیں اور بتکلف موحد بننا چاہتے ہیں ورنہ اسلام کی تشریف آوری کے وقت تو اہل کتاب تک توحید میں ایسے کچے تھے کہ ان میں اور بت پرستوں میں صرف نام کا فرق باقی رہ گیا تھا۔ یضاھون قول الذین کفروا من قبل[2]

سوال۔ اچھا پھر اسلام نے توحید کا کیا ثبوت دیا؟

---

[1] سُنو اور نہ مانو۔ [2] لگے ان ہی کافروں کی سی باتیں بنانے جو ان سے پہلے (ہو گزرے) ہیں۔

جواب- وہی ثبوت جو خدا کے ہونے کا دیا تھا وہی خدا کے ایک ہونے کا بھی دیا یعنی جس طرح عقل انسانی گواہی دیتی ہو کہ خدا ہو اُسی طرح وہی عقل انسانی یہ بھی گواہی دیتی ہو کہ وہ ایک ہی۔ اگر دنیا زبانِ حال سے پکار رہی ہو کہ اس کا بنانے والا ہی تو دنیا کا انتظام زبانِ حال سے پکار رہا ہو کہ اس میں کسی دوسرے کا لگاؤ نہیں۔ جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہی وہ ایک ارادے سے ہو رہا ہی۔

سوال- اچھا پھر؟

جواب- بات تو اِس پر چلی تھی کہ اسلام کو مولویوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا اِن مشائخ کے گروہ سے اور اس کی سند میں میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ یوں تو دنیا میں بہتیرے ہی مذہب ہیں اور ہر ایک مذہب کا مقصود اصلی ہی انسان کی اصلاح، گو وقتی اور مقامی خصوصیتوں کی وجہ سے اصلاح کے اصول میں کچھ اختلاف بھی ہو۔ غرض انسانی اصلاح کے اعتبار سے اسلام کو دوسرے مذہبوں پر کچھ ایسی فوقیت نہیں۔ ہاں فوقیت ہی تو توحید میں ہی اور اُسی میں اِن حضرات مشائخ نے ایسا گول مال لگایا ہی کہ اسلام کے سارے فخر کو ملیامیٹ کر دیا۔ اب سچ پوچھو تو مسلمانوں کا مُنہ نہیں کہ اہل کتاب بلکہ بت پرستوں کی توحید کو آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکیں مثلاً عیسائیوں کی توحید میں بھی یہی نقص ہو نہ کہ وہ خدا اور حضرت مسیحؑ اور روح القدس کو عجیب طور سے خدا مانتے ہیں کہ بجائے خود ہر ایک خدا اور پھر ایک خدا۔ یا مثلاً ہندو ہیں کہ وہ دیوتاؤں اور اوتاروں کو بھی خدا کہتے ہیں چاہے اس کی کچھ تاویل کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں مگر تین ہوں یا تین ہزار ہوں ہمہ اوست کے آگے تو ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔

سوال- کیوں صاحب یہ ایسی موٹی بات اِن صوفیوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی اور کیوں نہیں آتی؟

جواب- یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں جس وجہ سے مثلاً عیسائیوں اور ہندوؤں کی سمجھ میں نہیں آتی اُسی وجہ سے صوفیوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔

سوال- نہیں میں صوفیوں کی نسبت اِس بات کا تعجب کرتا ہوں کہ یہ تو مسلمان ہیں اور مسلمانوں میں سے

بھی چُنے ہوئے مسلمان کہ مذہب کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں۔ تو کیا توحید کے مسئلے پر ان کی نظر نہ پڑی ہوگی؟ قرآن کا شاید ایسا ایک صفحہ بھی مشکل سے ملے گا جس میں توحید کا مذکور نہ ہو۔ رہے عیسائی اور ہندو ان کی مذہبی کتابوں میں اول تو توحید ہوگی ہی نہیں اور ہوگی بھی تو ایسی ہی گڑبڑ سڑبڑ ہوگی جیسے کہ یہ لوگ معتقد ہیں۔

جواب۔ بس تم ہر چند منٹ کے بعد ایک نہ ایک بات ایسی کہہ دیتے ہو کہ مجھ کو تمھاری طرف سے سخت نا اُمیدی ہو جاتی ہے۔

سوال۔ وہ ایسی کون سی بات میرے مُنہ سے نکلی؟

جواب۔ تمھاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم سمجھتے ہو توحید مذہب نے تعلیم کی۔

سوال۔ کیا نہیں بھی؟

جواب۔ تو تم نے ابھی مذہب ہی کو نہیں سمجھا کہ مذہب ہو کیا چیز اور کہاں سے اس کی ابتدا ہوئی۔ مذہب کی مثال صرف و نحو کی سی ہے۔ صرف و نحو نے زبان کو نہیں بنایا بلکہ لوگوں نے زبان سے صرف و نحو کو بنایا ہے۔ یعنی اہلِ زبان کو ایک طور پر بولتے سُنا اُس طور کو قاعدے کے طور پر منضبط کر لیا، صرف و نحو بن گئی۔ قاعدے زبان میں پہلے سے موجود تھے مگر لوگوں کو آگہی نہ تھی کہ ہم بولنے میں اس قاعدے کا لحاظ رکھتے ہیں۔ جب کسی کا ذہن منتقل ہوا اور اُس کو قاعدہ سوجھ پڑا تب خبر ہوئی۔ اور یوں بولنے کو تو ذرے ذرے لڑکے اپنی مادری زبان ایسی پٹر پٹر بولتے ہیں کہ صرف و نحو کا علامہ بیٹھا اِن کا مُنہ تکا کرے، اگرچہ لڑکے قاعدے کے نام سے بھی واقف نہیں۔ میں نے مذہب کو اپنے نزدیک ایسا ہی سمجھ رکھا ہے کہ مذہب کے اصول لوگوں کے ذہنوں میں پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ مذہب نے اِن ہی کو قواعد کے طور پر ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

سوال۔ اگر ایسا تھا تو مذہب میں اختلاف کیوں ہوا؟

جواب۔ ہاں تو اختلاف اس طرح پر ہوا کہ مثلاً ایک زبان اُردو کو لو۔ اگرچہ اُردو کی صرف و نحو اُس وقت تک منضبط نہیں اور یہ جو سکولوں اور مکتبوں میں لغت پر ہیچ دو چار رسالے دکھائی دیتے ہیں

یہ سب لغو اور مہمل جلا دینے کی لائق ہیں۔ لوگوں کو قواعد کے بنانے کا تو مادہ نہیں اور اس زمانے کے پڑھے لکھوں میں شاید کوئی سر تصنیف کے جنون سے خالی ہو۔ ذرا شُد بُد آئی اور تصنیف کا خبط پیدا ہوا۔ دیکھا کہ اب اُردو ہی بڑی معراج الکمال رہ گئی ہے۔ اور زبان کے سلسلے میں پہلی چیز صرف و نحو۔ انھوں نے بھی لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونا چاہا۔ یہ بات پہلے سے کان میں پڑی ہوئی تھی کہ عربی میں صرف و نحو کا بڑا ذخیرہ ہی عقل کے دشمن نے یہ تو سمجھا نہیں کہ عربی میں صرف و نحو کا بڑا ذخیرہ تو زبان عربی کیلئے ہے نہ اُردو کے لیئے اور اگر ایک ہی صرف و نحو سب زبانوں کے لیئے کافی ہو تو عربی اور سنسکرت اور لیٹین اور گریک سب نمازوں کو ایک ہی وضو سے ٹرخا دیا جا سکتا ہے۔ بہرکیف فکر ہر کس بقدر ہمت اوست اسے مائۃ عامل اور شرح مائۃ عامل اور صرف و نحو کا فتوا لکھنا منظور ہوا تو نحو میر بہم پہنچا۔ اُن ہی میں کاٹ چھانٹ شروع کی۔ ماشاء اللہ قلم میں زور، طبیعت میں جولانی، اپنی زبان کے کونے کھدرے معلوم، ایک ہفتہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ اچھا خاصہ رسالہ بن کر طیار ہو گیا۔ ہم جیسے کم سواد آدمی زیر زبر کو اُردو میں ڈھونڈتے پڑے پھرتے ہیں تو کہیں پتہ نہیں ملتا۔ غرض اُردو کی صرف و نحو تو اس وقت تک منضبط نہیں ہوئی۔ مگر فرض کر لو کہ ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ یہ کہاں کی اُردو کے لیئے ہے؟ یوں کہنے کو تو اُردو سارے ہندوستان کی زبان ہے مگر اُردو اُردو میں فرق ہے۔ اُردو دلی لکھنؤ کی۔ اُردو دیہات کی۔ اُردو مارواڑ کی۔ اُردو پورب کی۔ اُردو پنجاب کی۔ اُردو دکن کی۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دلی میں قلعے کی اُردو اور شہر کی اُردو اور۔ اور اب بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی اُردو میں فرق ہے مسلمانوں میں پنجابیوں تک کا محاورہ جدا ہمارا جدا۔ لیکن خیر اردو کی صرف و نحو جوڑ رہے جوڑ جیسی کچھ لکھی گئی ہے اسی اُردو کی لکھی گئی جو سند ہے اور یہی حال ہے عربی انگریزی سب زبانوں کی صرف و نحو کا۔ یعنی ہر ایک زبان کی صرف و نحو الگ ہے اسی طرح جیسے جیسے لوگوں کے خیالات ہیں ویسے ویسے ان کے مذہب ہیں۔ جیسے بعض زبانوں کی صرف و نحو نہیں ایسے ہی بعض لوگوں کے پاس مذہبی کتاب نہیں۔ اور جس طرح زبان کی صرف و نحو منضبط نہ ہونے سے لازم نہیں آتا کہ اس میں قواعد نہیں،

اسی طرح کسی مذہب کی کتاب شہ ہونے سے لازم نہیں آتا کہ وہ مذہب نہیں۔ جن مذہبوں کی کتابیں ہیں میں اُن کو ایسا سمجھتا ہوں کہ گویا ایک ہی زبان کے مختلف لہجوں کی صرف ونحو ہیں۔ اور اسلام وہ مذہبی صرف ونحو ہی جو سب سے زیادہ فصیح اور سب سے زیادہ عمدہ لہجے کے لیے بنائی گئی ہی۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ سا بیچ میں آ گیا اور میں نے اس پر خاص کر اس لیئے زور دیا تاکہ تم کو معلوم رہے کہ جن کو خدا نے سلیم طبیعتیں عطا فرمائی ہیں اُن کے خیالات اور معتقدات اسلام دونوں ایک ہی چیز ہیں اور یہی تو اسلام کے برحق ہونے کی بڑی دلیل ہی کہ عقل سلیم اُس کو طوعًا قبول کرتی ہی اکرہًا نہیں۔ اصل میں مذکور یہ تھا کہ اسلام کو توحید پر بڑا فخر ہی اور اسی میں حضرات مشائخ نے ایسا گول مال لگا رکھا ہی کہ اسلام کی توحید بھی دوسرے مذہبوں کی طرح میلی میلی اور گدلی گدلی دکھائی دیتی ہی۔

سوال۔ یہی تو میں پوچھتا تھا کہ ان صوفیوں کی توحید میں فتور پڑا تو کیسے پڑا؟

جواب۔ فتور پڑنے کی پوچھتے ہو تو فتور پڑا بزرگوں کی تعظیم مفرط سے۔ اُنھوں نے پیروں کا ادب کیا اور بجا کیا۔ باپ ہو، استاد ہو، پیر ہو، بڑوں کا ادب کرنا ہی چاہیئے۔ مگر وہی بات کہ ہر چیز میں اعتدال شرط ہی ادب کی بھی ایک حد ہی۔ مریدوں نے ادب کو حد سے بڑھا دیا یہاں تک کہ تعظیم اور عبادت میں فرق باقی نہ رہا۔ اپنی تعظیم سے کس کو خوشی نہیں ہوتی؟ پیر جی صاحب کچھ پیغمبر تو نہ تھے کہ مریدوں کو روکتے منع کرتے اور مرید خود اُمیدوارِ خلافت تھے۔ پیر جی بادشاہ تھے تو یہ ولیعہد۔ یہ گدی کے ادب کو کیوں کم ہونے دینے لگے تھے۔ یوں تعظیم مفرط کا دستور پڑ گیا۔ دین کا اُستاد کہ اس کو بھی شیخ ہی کہتے ہیں پیر سے رتبے میں کم نہیں۔ مگر وہی بے چارے مولوی ڈرپوک پھونک پھونک کر پاؤں دھرنے والے کہ کہیں شرع کے خلاف نہ ہو جائے شاگرد کو سر پر آ کر مری ہوئی زبان سے السلام علیکم کہتے ہوئے سُن کر خوش ہو لیتے ہیں۔ ہم کسی مسلمان پر کیوں بدگمانی کریں مریدوں نے ادب ہی سمجھ کر پیر جی کا ادب کیا ہو گا مگر اول تو اُن کو ادب نامشروع کرنا ہی کیا ضرور تھا کہ پیغمبر صاحب تو اپنی تعظیم کے لیئے کھڑا ہونا بھی روا نہیں رکھتے تھے

جیساکہ حدیث سے ثابت ہے۔ دوسرے عوام کے حال پر بھی کچھ رحم فرمایا ہوتا کہ ان شامت کے ماروں کو اونگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ ملتا ہے۔ دیوانہ راہوئے بس است۔ اب کیا حال ہے کہ خدا کو تو بالائے طاق بٹھادیا ہے۔ سینکڑوں کوس سے ہزارہا آدمی مرد اور عورت قبریں پوجنے چلے آتے ہیں۔ ان ہی کی منتیں مانیں، ان ہی کو نذریں چڑھائیں، ان ہی سے حاجتیں مانگیں۔ اور کہنے کو مسلمان، نبی موحد کی امت، مشرک نہیں، بت پرست نہیں۔ ان سب کا وبال کس پر ہے؟ ان ہی پر جنھوں نے یہ دستور نکالا، جو اس دستور کو جاری رکھتے، جو اس دستور کو رونق دیتے، جو اس دستور کی کمائی کھاتے ہیں۔ بعض بعض مولوی ایسے ہو گزرے ہیں اور اب بھی ہیں، اگرچہ کم ہیں اور نیک بندے ہر زمانے میں کم ہی ہوتے ہیں، قرآن حافظ، واعظ، عالم، فقیہ، محدث کہ جن کے دیکھنے سے ہم کو تو پیغمبر صاحب کے صحابہ یاد آجاتے ہیں۔ صورت پر نور ٹپرا برس رہا ہے اور درود پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ متواضع منکسر، صوم صلوۃ کے پابند، نہ کسی کی غیبت نہ کسی کی بدی، کوئی آگیا اس کو پڑھادیا، نہیں بیٹھے بیٹھے اللہ اللہ کیا کیے۔ ہم نہیں جانتے کہ نیک کے سر میں اور کیا سینگ لگے ہوتے ہیں ایسے لوگ مر گئے کل من علیہا فان کے حکم سے داخل دفتر۔ کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ کب مرے اور کہاں مدفون ہوئے ان فقیروں میں ایک یہ تو کھلی کرامت دیکھی جاتی ہے کہ بے ستر ہوں تو، بے شرع ہوں تو، نشہ باز ہوں تو، بیہودہ بکواس کرتے ہوں تو، آج مرے اور کل سے ان کے ڈھیر کی پرستش ہونے لگی چہلم نہیں ہونے پایا کہ ڈھیر کا اچھا خاصہ عالی شان گنبد بن گیا۔ قبر شریف پر مکلف غلاف پڑا ہے۔ غلاف پر پھولوں کی چادر۔ سرہانے اگر کی بتی روشن ہے اور پائنتی خدام اور زوار سر جھکائے دوزانو مودب بیٹھے جھوم رہے ہیں۔ پہلے ہی عرس پر سارے میلوں پر اوس پڑ گئی۔ شاہ صاحب مرجع خلائق تو سچا لنت حیات بھی تھے مگر انتقال کے بعد تو ان کے مریدوں اور جانشینوں اور معتقدوں کے برتاؤ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ساری خدائی کا چارج ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ایسا کون سنگدل ہوگا جس کو مردے کے حال پر

ترس نہ آتا ہو۔ دیکھتا ہو کہ ایک اپنے ہی جیسا آدمی کھاتا پیتا چلتا پھرتا جو مکھی تک اپنے اوپر نہیں بیٹھنے دیتا تھا مردہ بدست زندہ کیسا عاجز پڑا ہو کہ کروٹ تک نہیں بدل سکتا۔ مگر سب مُردے اِن فقیروں کے سے مرے ہوں تو ترس کیسا ایسی موت پر امیروں اور بادشاہوں کو بھی رشک ہو تو بجا ہی۔ ہم تو زندہ امیروں اور بادشاہوں کے ساتھ بھی بعض مزاروں کا سا تو زک اور احتشام نہیں دیکھتے۔ پھر ایک اور بڑی خطرناک بات ہی کہ ہر چند ہر ایک مسلمان کی نسبت نیک گمان رکھنے کا حکم ہی اور چاہیئے بھی یوں ہی کہ جتنے مسلمان بھائی خدا کے یہاں جا چکے ہیں گو اپنی زندگی میں کچھ ہی کرتے رہے ہوں مگر آخر تھے تو مسلمان، ہم کو خدا کی ذات سے یہی اُمید رکھنی چاہیئے کہ وہ بڑا غفور و رحیم ہی اُس نے اپنے فضل و کرم سے اُن کو بخش ہی دیا ہوگا مگر جیسا وہ غفور و رحیم ہی ویسا ہی بے نیاز بھی ہی ؎

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن　　رہے ہی خوف مجھے اُس کی بے نیازی کا

اور یہی بے نیازی ہی کہ بڑے سے بڑے بزرگ یہاں تک کہ جن کو پیغمبر صاحب نے خدا کی طرف سے اور اُس کے حکم سے جنت کی خوش خبری سُنادی تھی وہ تک تو اپنی نجات اور مغفرت کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔ اور جیسا خود پیغمبر صاحب جن کے اگلے پچھلے سب گناہ خدا نے معاف کر دیئے تھے لیغفر لک اللہ[1] ما تقدم من ذنبک وما تاخر و ما ادری ما یفعل بی ولا بکم[2] فرمائیں تو دوسرے کس گنتی میں ہیں۔ ذرا اصحاب کا حال پڑھو کہ بڑے سے بڑے عابد و زاہد کی ساری عمر کی عبادت اُن کی ایک پل کی خدمت کے برابر نہیں ہو سکتی۔ با ایں ہمہ حضرت ابو بکر صدیق فرماتے تھے کہ اے کاش میں گھاس پات ہوتا، کوئی جانور مجھ کو چر جاتا اور گوبر کر کے نکال پھینکتا اور مجھ کو خدا کے حضور میں جواب دہی کرنی پڑتی۔ حضرت عمر فاروق رضؓ کو کسی بڑے بزرگ صحابی نے بارہ برس بعد خواب میں دیکھا کہ پیشانی پر سے پسینہ پوچھتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ پوچھا حضرت آپ کا کیا حال ہی۔ فرمایا بھائی اب محاسبے سے نجات ملی ہی

[1] تاکہ (تم اس فتح کے شکریے میں دینِ حق کی ترقی کے لیئے اور زیادہ کوشش کرو اور) خدا (اس کے صلے میں) تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کرے۔ [2] اور میں نہیں جانتا کہ (آیندہ) میرے ساتھ کیا کیا جائے گا۔

وہ بھی خدا نے بڑی ہی رعایت کی کہ یہاں بال بال نکل آیا۔ اور جتنے بزرگ ہو کر مرے ہیں اُن کی کتابیں ہیں دعائیں ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کو خطرِ عاقبت کی طرف سے تا دمِ مرگ اطمینان نہ تھا تو اِدھر حسنِ ظن اور اُدھر خدا کی بے نیازی اِن دو باتوں کا نتیجہ کیا ہے کہ ہم کسی کے مقبول و مغفور ہونے کا قطعی طور پر حکم نہیں لگا سکتے۔ اور جب کہ ابھی مغفرت ہی میں کلام ہے تو یہ ساری کو بھگت ایک طرح پر خدائی میں دخل دینا ہے۔ ایک بزرگ کا تو حال ہم کو معلوم ہے کہ وہ شیخ الامرا تھے یعنی شہر کے اکثر رو دار لوگ اُن کے مرید تھے۔ اور کیوں مرید تھے اس کا سبب بیان کریں تو کسی نہ کسی کو اُن بزرگ کا پتہ لگ جائے اور وہ ہمیں منظور نہیں۔ امیروں کے دین کا بھی عجیب حال ہے کہ جہاں اور مشغلے ہیں اُنھوں نے دین کو بھی ایک مشغلہ سمجھا ہے۔ آپ خود جیسے دیندار ہیں، جو اُن کو جانتے ہیں ساتھ ہی یہ بھی جانتے ہیں کہ دین سے ان کو مس نہیں۔ اس پر مسخرہ پن یہ ہے کہ آپ دین میں بھی اپنے اختیارات چلانے چاہتے ہیں۔ فغفورِ چین کو تو شاہی کہ وہ دنیا کا بادشاہ اور دین کا پیغمبر دونوں مانا جاتا ہے تو چینیوں کے مذہب پر ہم کو تعجب ہوا تھا مگر اپنے امیروں اور بادشاہوں کو دیکھا تو اِن کو بھی اسی خبط میں گرفتار پایا۔ اِن کے ناموں اور خطابوں سے تو خیر فرعونیت ٹپکتی ہی تھی مرے بعد جو خطاب خلد آرام گاہ، جنت آشیان، عرش مکان، اپنے بزرگوں کو عطا فرماتے ہیں ان کو کیا کہا جائے۔ کیا جنت اتنی جاگیر کر پائی ہے کہ اندھا بانٹے ریوڑی ہر پھر اپنیوں ہی کو دے۔ لگے بے دریغ بانٹنے ع بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را۔ بہ خیر تو وہ بیچارے شیخ الامرا دل میں جو کچھ ہے ہوں ظاہر میں تو ان میں فقیری کی صرف یہ بات تھی کہ گیروا لباس زیب تن فرماتے تھے مگر کپڑا ہوتا تھا قیمتی، اور یوں بھی ان کی گذران امیرانہ تھی اور امیروں کے پیر تھے تو کیوں نہ ہوتی۔ امیروں کی عقیدت کا تو کچھ کہنا نہیں اِن کے یہاں جہاں موروثی داروغہ، موروثی خواجہ سرا، موروثی ایک ناموروثی ڈھمک تھے اسی فہرست میں شیخ الامرا صاحب بھی تھے مگر لوگ شاید حسد کے مارے کچھ اُن کے قائل نہ تھے بلکہ کسی مجمع میں اِن کا ذکر بھی آ گیا تو جو وضعدار تھے اُنھوں نے سکوت کیا اور جو منہ کے پھوہڑ تھے اُنھوں نے غیبت کر دی

کہ ریاکار ہیں، فقیری کو بدنام کر رکھا ہے۔ آخر وہ بزرگ ایسے بیمار پڑے کہ گھڑی گھڑی اُن کے مرنے کی خبر اُڑنے
لگی اور خبر کے ساتھ اُن کی کرامتیں اور خوارقِ عادات بھی کہ وصال ہو چکا ہے اور لطائف جاری ہیں سب کو
دکھائی دینے ہیں سُن پڑتے ہیں غسل دینے میں ہتھ ذرا کی ذرا گھٹنے پر سے کھسک گیا تھا خدا کے بندے
ہو تو یقین کر کے مانا حضرت نے خود اپنے ہاتھ سے نیچا کر لیا۔ ہاتھ پاؤں جیسے ریشم۔ جنازہ اُٹھایا تو
ہلکا پھول۔ آخر مشہور ہوا کہ قبر کی مٹی عجیب خوشبودار نکلی ہے کہ سارا جنگل پڑا مہک رہا ہے۔ شہر کی
خلقت کہ انگلی کھڑی کرو تو سیکڑوں آدمی جمع ہو جائیں، ہزاروں آدمی اُمنڈ پڑے اور تبرک کے طور چٹکی
چٹکی مٹی لینی شروع کی۔ کھودتے کھودتے قبر بن گئی باؤلی کتنی عورتوں اور بچوں کے گلے میں تعویذ کی جگہ
اُس مٹی کی پوٹلیاں لٹک گئیں۔ پھر وہ دن اور آج کا دن کرامتوں کی فہرست ماشاءاللہ بڑھتی ہی
چلی جاتی ہے۔ اللھم زد فزد۔

سوال۔ واقع میں یہ کیا بات ہے کہ مرے پیچھے درویش لوگ زیادہ پجنے لگتے ہیں؟

جواب۔ پیراں نمی پرند مریدان میپرانند۔ اور جیتے جی ایسے لمبے چوڑے دعوے کیے جائیں تو
ابراہیمؑ کی سی تحدّی ہو کر قلعی نہ کھل جائے۔

سوال۔ ابراہیمؑ کی تحدّی کیسی؟

جواب۔ قرآن میں اس تحدّی کا نہایت عمدہ مذکور ہے۔ خدا سمجھ دے تو جتنے خدشے آدمی کے ذہن میں
گزرتے ہیں صراحتہً یا کنایتہً سبھی کا جواب قرآن میں موجود ہے۔ ابراہیمؑ کی تحدّی یہ تھی کہ اُن وقتوں کا
بادشاہ خدا کو نہیں مانتا تھا۔ اسی بات پر اس کے اور ابراہیم علیہ السلام کے جنت ہو پڑی۔ بادشاہ نے کہا کہ
تم جس خدا کی طرف سے پیغمبر بن کر آئے ہو اور چاہتے ہو کہ ساری دنیا اُسی کی پرستش کرے آخر بتاؤ کہ وہ
بندوں پر کس طرح کا اختیار رکھتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا ایک اختیار تو اُس کا یہی ہے کہ بندوں کا
جینا مرنا اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ بادشاہ نے کہا یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک خونی کو چھوڑ دیا

اور ایک بے گناہ کو ناحق بیٹھے بٹھائے مروا ڈالا۔ ابراہیم نے کہا خیر یہ تو آپ نے کیا مگر آفتاب جو پورب سے نکل کر پچھم میں غروب ہوتا ہے یہ تو آپ کے حکم سے نہیں کیونکہ آپ سے پہلے بھی تھا۔ آپ اگر خدائی کے اختیارات رکھتے ہیں تو اس کو حکم دیجئے کہ پچھم سے نکلے اور پورب میں غروب ہو۔ اس سے بادشاہ لاجواب ہو گیا۔ تو اگر دنیا میں کوئی بھی اب دعوے کرے اُس کا قائل کر دینا کیا مشکل ہے۔ آئے دن اس کی درماندگی ظاہر ہو۔ یہ وجہ ہے کہ درویش اور مشائخ مرے پیچھے زیادہ پُجنے لگتے ہیں۔

سوال۔ کیوں صاحب جو لوگ توحید کے بھی قائل ہیں اور پھر اُس میں رخنے بھی پیدا کرتے ہیں جیسے مسلمان ہو کر ہمہ اوست کہنے والے یا مثلاً عیسائی۔ وہ اپنے معتقدات کی کیا تاویل کرتے ہیں؟

جواب۔ ہمہ اوست کہنے والوں اور عیسائیوں کی تخصیص کیوں کرو۔ ایسا کوئی آدمی نہیں جو خدا کا قائل نہ ہو۔ اور جو خدا کا قائل ہے وہ ضرور اُس کو وحدہٗ لاشریک لہٗ بھی جانتا ہے۔ اور جس قدر توحید سے بھٹکا ہوا ہے وہ اپنے زعم میں اس کی کچھ تاویل کرتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اصل میں توحید کا معتقد ہے اور توحید کے خلاف جو باتیں اُس سے سرزد ہوتی ہیں ان کی تاویل کرتا ہے تاکہ توحید میں خلل نہ آئے۔ مسلمانوں کی توحید بھی ویسی پکّی اور خالص توحید نہیں جیسی واقع میں ہے اور جیسی اسلام چاہتا تھا کہ ہو۔ مسلمانوں سے بھی ایسے افعال سرزد ہوتے ہیں جن سے ان کی توحید کا تنزل ظاہر ہوتا ہے۔ یہ لوگ بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے دوسرے لوگ کافر و مشرک اور بُت پرست کہلائے۔ تو جو تاویل مسلمان کرتے ہیں وہی یا ویسی ہی قسم کی دوسرے لوگ بھی کرتے ہیں جن کو تم سمجھتے ہو ہم شریک خدائی گردانتے ہیں، خدا نہیں ہیں بلکہ خدا نے اپنی خاص خاص صفتوں کو ان کے رنگ میں ظاہر کیا ہے۔ یا یہ لوگ خدا کی سرکار میں ہمارے وسیلے ہیں۔ یا ہم نے خیال جمانے کے لئے ایک حیلہ بنا رکھا ہے۔ یا چونکہ ہر چیز میں خدا کی قدرتیں نمایاں ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ان ہی میں خدا ہے۔ غرض آدمی بات بنانے پر آئے تو اس کے بہتیرے رستے ہیں۔ ایک پادری نے تثلیث کی ایک تاویل کی تھی۔

ایسی ہی ذرا کم سوجھتی ہے۔ کھڑا ہوا وعظ کہہ رہا تھا اور اسی تثلیث کا مذکور تھا اُس کی تمام تقریر کا حاصل یہ تھا کہ تثلیث ایک راز ہے خدا کی ذات سے متعلق۔ ہم سب لوگ مانتے ہیں کہ خدا ہر جگہ موجود ہے جیسا یہاں اِس جگہ، ویسا امریکہ میں۔ ویسا زمین کے کونے کونے میں، ویسا آسمان میں۔ وہ سوتا نہیں تھکتا نہیں دلوں کے منصوبے تک جانتا اور جو کچھ ہو چکا اور ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے اُس کو سب معلوم ہے لیکن یہ ایسی باتیں ہیں کہ مطلقاً ہماری سمجھ میں نہیں آتیں کہ کیوں کر کوئی شخص ان صفتوں کا جامع ہو سکتا ہے ایسا شخص نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی کسی نے دیکھا اور نہ کوئی اُس کی طرف خیال دوڑا سکتا ہے غرض خدا خود بھید ہے اُس کی ہر ایک بات بھید ہے اور دُنیا میں اور بھی بہت سے بھید ہیں تو ایک تثلیث کے بھید سے لوگ کیوں اِس قدر گھبراتے اور کیوں اِس قدر اس کے پیچھے پڑے ہیں۔

سوال۔ بات تو معقول ہے۔

جواب۔ معقول نہ معقول۔ کیا خاک معقول ہے! یہ بالکل سچ ہے کہ عقل انسانی خدا کی ذات اور صفات پر احاطہ نہیں کر سکتی۔ ہم نہیں جانتے اور نہیں جان سکتے کہ وہ کیا ہے اور کیسا ہے لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ خدا کے بارے میں ہم عقل سے بالکل کام نہ لیں عقل ہم کو اور زیادہ نہ بتا سکے تاہم اتنا تو بتاتی ہے کہ خدا ہے اور عقلی گواہی کے سوائے خدا کے ہونے کی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ تو جب ہم نے خدا کو مانا عقل کا کسی قدر احاطہ تو تسلیم کرنا پڑا اور جس طرح عقل گواہی دیتی ہے کہ خدا ہے اُسی طرح یہ بھی گواہی دیتی ہے کہ ایک ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم عقل کی ایک بات کو مانیں اور ایک بات کو نہ مانیں۔ رہ گئیں خدا کی صفتیں ہماری عقل اتنا تو بتاتی ہے کہ خدا میں یہ صفتیں ہیں اور انتظام دنیا گواہی دے رہا ہے کہ اُس میں یہ صفتیں ہونی چاہئیں۔ اس سے آگے عقل گم ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ وہ دیکھتا اور اندھے خدا سے دُنیا نہیں سنبھل سکتی مگر یہ کہ اُس کی آنکھیں ہیں یا نہیں اور ہیں تو کیسی ہیں اور نہیں تو کیسے دیکھتا ہے یہاں ہم دم نہیں مار سکتے اور یہی حال ہے اُس کی دوسری صفتوں کا۔ اگر عقل یہ کہتی کہ خدا تو ہے

مگر نہیں معلوم ایک ہی یا تین ہیں یا ایسا ایک ہے کہ وہی تین ہیں اور ایسے تین ہیں کہ وہی ایک ہے تو پادری صاحب سچے تھے۔ مگر عقل تو صاف پکارے کہہ رہی ہے کہ ہے اور ایک ہی، تو اب عقل کے خلاف کیسے مانیں؟ ایک کو تین اور تین کو ایک منوانا طلبِ محال ہے۔ اور میں نے مذہب کا اصول یہ ٹھیرا رکھا ہے کہ جو مذہب طلبِ محال کرے وہ سچا اور خدائی مذہب نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے میں عیسائی مذہب کو مذہب حق نہیں سمجھتا اور عیسائیوں کی کیا تخصیص ہے، میں نے توحید میں تزلزل دیکھا اور ہنسے سے اکھڑا اور اسی توحید کے کارن تو میں مشائخ کے پاس ہو کر نہیں بیٹھ سکتا ورنہ اصلاحِ باطن کے لحاظ سے تو اس گروہ کا بہتیرا ہی ادب میرے دل میں ہے اور میں اس گروہ کی بڑی ہی ضرورت سمجھتا ہوں مگر جیسی بڑی ضرورت ہے ویسی ہی مکر کی بڑی گنجائش ہے خصوصاً جس حالت میں کہ شریعت کی روک اٹھا دی گئی ہو جیسے کہ اٹھا دی گئی ہے۔ پھر ایک بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے طرزِ عبادت سے، اُن کے تیوہاروں سے، اُن کی ظاہری وضع سے جس سے مسلمان پہچان پڑتا ہے، اُن کے احکامِ شریعت سے آخر اس کا تو پتہ لگتا ہے کہ اسلام کے خر او پر اترے پیچھے مسلمان کو کیا اور کیسا ہونا چاہیئے۔ اُس کو ہونا چاہیئے نمونہ پر اللہ کا نور یعنی نیچی ڈاڑھی، نہ چڑھی ہوئی نہ مُنڈی ہوئی اور نہ خشخاشی کتری ہوئی۔ لبیں لی ہوئی۔ سر منڈا ہوا نہیں تو سارے سر پر بال، پٹھے نہیں گردہ نہیں۔ بھلے مانسوں کا سا لباس، نہ ایسا باریک کہ اندر سے بدن پڑا جھلکے کہ اُس کو پیغمبر صاحب نے فاسقوں کا لباس فرمایا، نہ تنگ کہ اُس سے اکڑ ظاہر ہو، اور نہ بے ضرورت ڈھیلا کہ وہ اسراف اور شیخی میں داخل ہے، ریشمی نہیں، عورتوں کی طرح رنگین نہیں۔ سر سے پاؤں تک بناؤ سنگار کا کہیں نام نہیں کہ زیب و زینت عورتوں کا شیوہ ہے۔ نیچی چولی، ٹخنوں سے اونچا پاجامہ۔ زیور کے نام بدن پر چھلا تک نہیں کہ یہ سب زنانہ پن ہے گوٹہ نہیں ٹھپّہ نہیں۔ یہ تو مسلمان کی وضع ہوئی اگر چلتا پھرتا کہیں نظر پڑ جائے تو نیچی آنکھیں کیے دبے پاؤں اپنے رستے لگا چلا جا رہا ہے۔ اینٹھتا نہیں اتراتا نہیں۔ جب دیکھو گھر میں یا کام کے سر یا پانچوں وقت مسجد میں۔ گنجفہ چوسر تاش شطرنج جتنے کھیل ہیں ان میں سے اُس کو ایک بھی نہیں آتا۔ کبھی کھیلے ہوں تو جانے۔

نہ پتنگ اُڑاتا نہ مرغ یا بٹیر بیں لڑاتا نہ جانوروں میں کشتی کرانا۔ برسوں سے محلے میں رہتا نہ کبھی کسی سے لڑا نہ جھگڑا۔ گلی کی لڑکیاں دن رات اس گھر سے اُس گھر میں اور اُس گھر سے اس گھر میں دوڑی دوڑی پڑی پھرتیں، اُس نے کبھی کسی کو آنکھ اُٹھا کر دیکھا ہو تو پہچانے۔ پاس پڑوس والوں کا کچھ کام ہو تو بے بلائے موجود۔ بازار سے لوگوں کے سودے سُلف یہ لا کر دے۔ کوئی بیمار پڑے تو حکیم کے یہاں دونوں وقت یہ جائے۔ نسخہ عطار کے یہاں سے یہ بندھوا کر لائے۔ اپنے گھر میں کبھی بڑوں کو جواب دیا نہ کبھی چھوٹوں پر سختی کی۔ کسی سے معاملہ پڑا تو نیت کا درست، بات کا پورا، وعدے کا سچا۔ شہر میں ایسا کون ہے جو اس کی ساکھ نہیں مانتا۔ ناچ رنگ کے جلسوں میں شریک ہونا تو درکنار نام لے دو تو پسینے پسینے ہو جائے۔ غریب، مسکین، متواضع، منکسر، بھلا مانس، ہنس مکھ، خلیق، ملنسار، راست باز، دیانت دار، غیور، بردبار، حریص نہیں، لالچی نہیں، سیدھا سادا، بے تکلف، آنکھوں میں شرم لحاظ، نیک، شرع کا پابند۔ یہ ہے مسلمان کا مختصر سا حلیہ۔ اور جو پرہیزگار ہیں وہ تو ایسے مہذب اور شائستہ اور باوقار رہیں کہ بھول کر بھی ان سے کوئی سخیف اور خفیف حرکت سرزد نہیں ہوتی۔ ہم کو بھی ایسے دو چار بزرگوں کی زیارت کا اتفاق ہوا ہے تو اُن کی متانت کا کچھ ایسا رعب پڑتا تھا کہ ان کے سامنے بات نہیں کی جاتی تھی۔ دل میں تو یہ خیال بیٹھے ہوئے تھے اور جانا ہوا ایک بزرگ کے عرس میں۔ بہزارہا مخلوق تھی مگر بمجبوری کہنا پڑتا ہے کہ ایک بھی تو اپنی نگاہ میں نہ جچا۔ بازاری اور عوام در رد کے خدوے لوگوں کو چھوڑ کر قوالی کا جو مقدس جلسہ تھا وہی خود کیا تھا۔ تقدس کے تو بڑے درجے ہیں مجھ جیسے نالائق نابکار عار اسلام گنہ گار کو بھی تو اس مجمع میں بیٹھنے سے شرم آئی۔ یوں ناچ کا جلسہ ہوتا تو میں ایسا پاک بے حیا ہوں کہ شاید کچھ بھی شرم نہ کرتا۔ جان لیتا کہ چند بے غیرت مسلمان اسلام کو بدنام اور اپنے تئیں فضیحت کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں اور ان میں ایک میں بھی ہوں لیکن افسوس تو یہ تھا کہ اس جلسۂ قوالی کو ایسے ادب سے دیکھا جاتا تھا کہ گویا مجلس وعظ ہے اور اس میں خدا رسول کا تذکرہ ہو رہا ہے اور قوالی نہیں بلکہ ایک طرح کی

عبادت ہے۔ کیوں کہ جتنے لوگ تھے سب سرنگوں دوزانو مؤدب بیٹھے ہوئے تھے، بلکہ اپنی مجالس میں تو لوگ ایسا کرتے بھی نہیں۔ عزاداری کی مجلسوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ مولود کی محفلوں میں شریک ہوا ہوں۔ میں نے تو کہیں ایسا ادب قاعدہ دیکھا نہیں۔ لوگ گانے کے مزے لے رہے اور کچھ ؎

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں ؛ شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

خدا جانے کیا سمجھ کر عجیب عجیب حرکات کرتے تھے کہ ہم جیسے بے بصر اُن کو حرکات مجنونانہ کے سوائے اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ ہاں آسمان میں فرشتے ذکرِ الٰہی کے وجد میں آکر ایسے بے تال بے سُر ناچتے ہوں تو خبر نہیں لیکن اگر بہشت میں جانا نصیب ہوا اور ظاہر میں تو کچھ سامان ہی نہیں۔ لیکن اگر ہوا اور اب ناچ ناچنا پڑا تو ہم سے کیا بن پڑے گا؟ بہر کیف لوگ تو اپنے اپنے خیال میں تھے اور میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ الٰہی یہ قبر ہے اور بڑے بزرگ ہی کی ہو مگر ہے تو قبر اور حدیثوں میں تو پیغمبر صاحب نے کل قبروں کی نسبت ایسا حکم دیا ہے کہ زمین دوز کر دی جائیں اور جس مصلحت سے یہ حکم دیا گیا ہے ہو نہ ہو وہ یہی مصلحت تھی کہ جو معاملہ ہم لوگ بیٹھے کر رہے ہیں کسی کی قبر کے ساتھ ایسا معاملہ نہ ہونے پائے۔ کیونکہ خدا نے کل من علیہا فان کا فتویٰ جو جاری فرما دیا ہے وہ تو پورا ہو کر رہے گا۔ گنبد بنائیں تو اور مقبرے بنائیں تو۔ علاوہ بریں زیارت قبور سے مقصود ہے عبرت، اور عبرت تبھی ہو گی کہ قبروں کو خستہ حال دیکھو، اور اب تو شامیانہ اور روشنی اور ساز سامان اور زوّاروں کا ہجوم اور یہ جلسۂ قوالی دیکھ کر عبرت کی جگہ عظمت کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور قلب پر اُلٹی غفلت طاری ہوئی جاتی ہے۔ آخر شب کا وقت تھا اور میلے کے غل غپاڑے کی وجہ سے آنکھ کچھ رات رہے سے کُھل گئی تھی۔ اس ارادے سے چلا تھا کہ نورِ ظہور کا وقت ہے چلوں موقع ہوا تو ان بزرگ کے مزار پاس بیٹھ کر کچھ قرآن پڑھوں گا۔ یہاں جو آیا تو قوالی کا مجمع دیکھا۔ قرآن پڑھا جائے کیا خاک جلسے میں رہا تو سہی مگر جب تک بیٹھا رہا یہی سوچتا رہا کہ یا تو مجھ کو اسلام سے تعلق نہیں یا اسلام کو ان لوگوں سے تعلق نہیں۔

یہ خیالات ہیں جو مجھ کو ان باطن والوں کی طرف رخ نہیں کرنے دیتے۔ ورنہ میں تو ان کے پاؤں دھودھوکر پیوں۔ اور میں تو اس سے اور بھی زیادہ برگشتہ ہوا کہ مجھ کو شبہ ہوتا ہی کہ کہیں ان لوگوں میں من تراحاجی بگویم تو مراحاجی بگو کی طرح کی سازش نہ ہو اور ایک حمام میں سب ننگے ایک دوسرے کی پردہ داری نہ کرتے ہوں۔ ورنہ جیسے کسی کو اپنی لمبی چوڑی تعظیم کرتے دیکھ تھا اس سے بگڑ کر کہہ دیا ہوتا کہ کیا تو مجھ کو بناتا ہو اگر میں عبادت ریاضت مجاہدہ کچھ کرتا بھی ہوں تو تجھ کو کیا۔ میری محنت تیرے کام نہیں آسکتی تو اپنی آپ کر۔ اور اگر تو نے مجھ کو خدا کا مقرب سمجھ رکھا ہو تو یہ تیری غلطی ہو۔ میں بھی ایک ناچیز سا بندہ ہوں اور اپنے عیب مجھی کو معلوم ہیں۔ میں اپنی نجات سے تو مطمئن نہیں تیری کیا مدد کرسکتا ہوں۔ پیر خود درماندہ کرا شفاعت کند۔ اگر شروع میں ایسا رویہ اختیار کرلیا جائے تو کوئی پاس بھی تو آکر نہ پھٹکے۔ اور ایک دم سے ان تمام خرابیوں کا انسداد ہوجائے جو اس گروہ کے سبب سے اسلام میں پھیل گئی ہیں۔ قرآن میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہی لا تزکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقی اپنے آپ پاکیزہ و مقدس نہ بنو (اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے کام نہیں چلتا) خدا ہی کو خبر ہے کہ کون پاکیزہ و مقدس ہی۔ اگر اب سمجھیں اور اس پر عمل کریں تو کوئی کیوں کسی سے بیعت لے، کیوں کسی کو مرید کرے، کیوں کسی سے ہاتھ چمبوائے، کیوں کسی پیر کو ہاتھ لگوائے، کیوں لوگوں سے تعظیم و تکریم کا طلب گار ہو۔

سوال۔ کیوں صاحب ایک بات کا کئی دفعہ خیال آیا اور باتوں کے سلسلے میں ذہن سے اتر اتر گئی۔ جو لوگ توحید میں پورے نہیں ظاہر ہی کہ وہ اسلام میں تو آ ہی نہیں سکتے اور ہم ان کو بہت سے اعمال نیک کرتے دیکھتے ہیں۔ تو کیا ان کی یہ نیکیاں برباد اور اکارت ہیں؟

جواب۔ میرے پاس اس کا کچھ جواب نہیں۔ میں نے تم کو بار بار منع نہیں کیا کہ تم دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دو؟

سوال۔ لیکن طبیعت میں خود بخود ایک خدشہ پیدا ہو تو کیا کیا جائے؟

جواب۔ طبیعت تمہارے بس کی ہے یا تم طبیعت کے بس میں ہو؟ اگر ایسی بے اختیاری ہے تو ہم مذہب کی طرف سے مطمئن ہو چکے۔ یہ طبیعت تم کو دنیا اور دین دونوں میں خوار کرے گی۔ اس طبیعت کا آدمی دنیا میں امن سے رہ نہیں سکتا۔ اور اس طبیعت کے نتیجے ہیں کہ لوگ آئے دن آپس میں جوتی بیزار کرتے رہتے ہیں کوئی ایک مذہب دوسرے مذہب کو دیکھ نہیں سکتا۔ اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو جو شخص جس مذہب کا زیادہ تعصب رکھتا اور دوسرے کے ہر ایک فعل کو اس کی توہین کا موجب سمجھتا ہے وہ خود بھی اس الزام سے بری نہیں۔ مثلاً ایک ہندو ہماری مسجد کا ادب نہیں رکھتا تو وہ معذور ہے کہ سرے سے اس کو عبادت گاہ ہی نہیں جانتا لیکن ہم جو مسلمان ہو کر مسجد کا بڑا ادب رکھتے ہیں یہی کہ اس میں جوتیاں پہن کر نہیں جاتے مگر اندر جا کر غیبت ہم کرتے، جھوٹ ہم بولتے، لڑتے جھگڑتے، بیہودہ بکواس لگاتے۔ دنیا کا وہ کون کام ہے جو خانۂ خدا میں نہیں ہوتا۔ کیا اس سے مسجد کی توہین نہیں ہوتی؟ ہمارے نزدیک اس سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے کہ دوسرے مذہب کا آدمی جوتیاں پہن کر اندر چلا جائے۔ مگر لوگوں نے مذہب کا تو حیلہ بنا رکھا ہے۔ دلوں میں خباثتیں بھری ہیں۔ مذہب کی آڑ میں ان خباثتوں سے کام لیا جاتا ہے اور دین کے اعتبار سے تو میں دوسرے مذہب سے متعرض ہونے ہی کو برا سمجھتا ہوں کہ ہم کو دوسرے کے دین و مذہب سے غرض نہیں تعلق نہیں۔ وہ جانے اس کا کام جانے ہر کسے مصلحت خویش نکو می داند۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے۔ من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ[۱] اور میں دوسرے کے مذہب سے متعرض ہونے کو ما لا یعنی میں داخل سمجھتا ہوں۔ اور ایک پہلو تو اس کا بہت ہی برا ہے کہ دوسرے کے مذہب سے متعرض ہونا خدا کے اختیارات میں دخل بیجا ہے۔ یہ خدا کا کام ہے کہ وہ اپنے بندوں کی نیکی بدی کو تولے اور ان کو ان کے کیے کی جزا یا سزا دے۔ ہم سے وہ لوگوں کے بارے میں پوچھتا نہیں تو ہمارا دخل در معقولات داخل سوء ادب ہے۔ دنیا میں ہمارا لوگوں سے

---

[۱] آدمی کے ایمان کی خوبیوں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جو چیز اسے درکار نہ ہو اس سے سروکار نہ رکھے۔

اتنا ہی تعلق ہو کہ ہماری حاجتیں اُن سے اور اُن کی حاجتیں ہم سے متعلق ہوتی ہیں اور بس۔ اگر ہم سے مثلاً کسی نے قرض لیا ہو اور وہ ہم کو وقت پر ادا کر دیتا یا ہم کو کسی نے قرض دیا ہو اور ہم سے ناحق ناروا زیادہ نہیں لینا چاہتا تو ہم کو جیسا مسلمان ویسا ہندو ویسا عیسائی ویسا بُت پرست ویسا مشرک ویسا کافر۔ ہم مسلمان ہیں تو اپنے واسطے وہ مسلمان نہیں ہو تو اپنے واسطے سے

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است   با دوستاں تلطف با دشمناں مدارہ

دوست دشمن کا تفرقہ بھی شاعر نے کیا ہو۔ ہم کو تو سب دوست ہی دوست دکھائی دیتے ہیں۔ دشمن اگر ہو تو اپنا نفس ہو اِنَّ النفس لامارۃ بالسوء۔[1]

سوال۔ یہ رائے تو آپ نے اب قرار دی لیکن جن دنوں آپ میری طرح دین کی طرف سے اطمینان حاصل کرنے کی فکر میں تھے اُس وقت کفار کے اعمال نیک کی نسبت آپ کیا خیال کرتے تھے۔

جواب۔ لگے مجھ سے بھی طالب العلمانہ داؤ چلنے ہیں جو کچھ رائے رکھتا تھا اب میں نے اُس کو بدل دیا ہو۔

سوال۔ تاہم اُس کے سُننے سے مجھ کو تسکین ہو گی۔

جواب۔ تسکین تو اس سے ہو گی کہ اپنی ہنڈیا کی خیر مناؤ۔ مگر تم اصرار کرتے ہو تو ایک حکایت کے طور پر تم سے بیان کئے دیتا ہوں۔ مجھ کو ایک مثال سوجھ گئی تھی کہ جیسے ایک شخص کسی مرض سخت میں مبتلا تھا وہ گیا ایک حکیم حاذق کے پاس۔ اُس نے بڑی توجہ سے اُس کا علاج کیا اور مریض اچھا ہو گیا۔ مقتضائے انسانیت یہ ہو کہ وہ حکیم کا شکریہ ادا کرے لیکن وہ حکیم کو چھوڑ عطار پاس دوڑا گیا۔ اسی طرح خدا نے ہر ایک آدمی کو اتنی عقل دی ہو کہ خدا کو پہچانے۔ اگر وہ پہچاننے کی کوشش نہیں کرتا تو جو اعمال نیک وہ اس غرض سے کرتا ہو کہ خدا سے اس کو تقرب ہو وہ ایسی ہی غلطی میں ہو جیسے وہ بیمار عطار کا شکریہ ادا کرنے گیا تھا مگر اس کے بعد جو تم نے اس طرح کی بات پوچھی تو مجھ سے زیادہ بُرا کوئی نہیں۔ کیوں کہ بحث و مناظرہ میری طبیعت کے

---

[1] آدمی کا نفس تو بدی ہی کے بڑے حکم چلاتا ہو۔

سوال۔ آپ ناخوش نہ ہوجیئے میں نے بحث کے طور پر آپ سے کچھ نہیں پوچھا بلکہ استفادے کے طور پر۔ اور آپ کے بیان سے میری پوری تسلّی ہوگئی ہے اور کسی طرح کا خدشہ میرے دل میں باقی نہیں۔ ہاں طبیعت ان خیالات سے آشنا نہیں۔ اب ان شاء اللہ وقتاً فوقتاً غور و فکر کرکے میں ان خیالات کو راسخ کروں گا۔

نیچری فرقہ

لیکن میں ان نیچریوں کی نسبت بھی آپ کے خیالات معلوم کرنے چاہتا ہوں کہ آج کل ان لوگوں نے بھی بڑی اودھم مچا رکھی ہے۔

جواب۔ نیچری ابن الوقت ہیں یعنی اس زمانے کی پیداوار۔ زمانے کا رنگ تو دیکھو کیا سے کیا ہوگیا ہے۔ تمام ہندوستان میں انگریزی عملداری ہے مطمئن کہ ایسا امن کبھی ہندوستان کو نصیب نہیں ہوا۔ اسی امن کا دوسرا نام ہے آزادی۔ ہر شخص فاعل مختار ہے جو چاہے سو کرے بشرطیکہ دوسروں کی عافیت میں خلل انداز نہ ہو۔ سرکار ایک کو دوسرے کی آزادی میں کیوں خلل انداز ہونے دے گی جب رعایا کی آزادی میں اپنا خلل انداز ہونا بھی جائز نہیں رکھتی۔ آزادی کے کئی پیرائے ہیں ان میں سے بڑا ضروری پیرایہ آزادی رائے کا بھی ہے جس سے ہم کو بحث ہے۔ سرکار کسی کی رائے میں دخل نہیں دیتی۔ مگر جس چیز سے رائے کے قائم کرنے کی لیاقت پیدا ہوتی ہے یعنی تعلیم اُس کے پیچھے ستو باندھ کر پڑی ہے اس واسطے کہ دُنیا کے کام بے تعلیم کے چل نہیں سکتے۔ ہرچند تعلیم دنیاوی چیزوں میں دی جاتی ہے اور کسی مذہب کا نام زبان پر نہیں آنے پاتا مگر ہندوستانی تو مذہب کے بدون ٹکڑا نہیں توڑتے۔ ان کی عادت ہے کہ پوشاک ہو تو کھانا پینا ہو تو میز کرسی ہو تو برتن بھانڈا ہو تو ہر چیز کو مذہب میں لے دوڑتے ہیں یہ تعلیم کو کیا بخشتے۔ مدتوں لوگ اسی خبط میں مبتلا رہے کہ تعلیم کا اصلی مقصود عیسائی بنانا ہے۔ مگر جھوٹے کے پاؤں کیا۔ اور ادھر پڑی پیٹ کی مار اور یہ بھی دیکھا کہ تعلیم کی بھٹی میں تو سوکھا اور گیلا سبھی جلا چلا جاتا ہے۔ ہندو مسلمان عیسائی یہودی کون ہے جو اس کی آنچ سے بچا ہو۔ بارے وہ اگلی سی حشت تو نہیں مگر انس بھی

نہیں - بہت سی دوائیں ہیں کہ فائدے کے اعتبار سے اکسیر کا حکم رکھتی ہیں جیسے کونین ہوئی یا کاڈلورآئل ہوا - مگر کوئی تو اس بلا کی کڑوی ہو کہ زبان پر نہیں رکھی جاتی - کسی میں ہیک ہو کہ حلق سے نہیں اترتی اور جب طبیعت دوا کو قبول نہ کرے تو فائدہ کیا خاک ہو - اس لیئے لوگوں نے کونین کی تلخی دور کرنے کے لیئے گولیاں نکالیں - کونین کے اوپر کوئی اور چیز خوش مزہ یا بدمزہ نہیں بے مزہ - کاڈلورآئل میں جو کانٹ ستہ یا اور دوائیں ملا دیں کہ کاڈلورآئل کی ہیک بھی دب گئی اور اُس کے اثر کو بھی تائید پہنچی - یہی حال تعلیم کا ذکر اس کے آگے اکسیر کی کچھ حقیقت نہیں - مگر مذہبی خلط والوں کو پچتی بھی نہیں - کیا مشکل میں جان ہو کہ مفلسی جیسا تو مہلک مرض اور دوائی یہ ایک تعلیم - نہ پیتے بن پڑتی ہو اور نہ بے پیئے رہا جاتا ہو - نیچریوں نے تو ویل کی ایک ترکیب نکالی ہو کہ اُس سے مذہبی مذاق کچھ ایسا بہ جاتا ہو کہ پھر تعلیم کی دوا مطلق ناگوار نہیں معلوم ہوتی - بس ان کی دوا میں یہی ایک عیب ہو کہ مذہبی مذاق کو معطل کر دیتی ہو جیسے مخدر دوائیں کہ جہاں لگا دو وتنا ٹکڑا سُن پڑ جاتا ہو - ورنہ نیچریوں کے مسلمان ہونے میں اور ان کی نیت کے بخیر ہونے میں ذرا بھی شک نہیں -

سوال - لیکن مذاق مذہبی جو بڑی ضروری اور بکار آمد قوت ہو وہ جو باطل ہوئی جاتی ہو؟

جواب - کیا کیا جائے مقام مجبوری ہو؟

سوال - ایسی کاہے کی مجبوری ہو؟

جواب - مجبوری یہ ہو کہ تعلیم بھی تو اپنی حالت پر قائم نہیں رہی - انگریزی عملداری سے پہلے ہمارے یہاں کی تعلیم تھی کیا - لفاظی اور منطق و فلسفے خیالی کے ڈھکوسلے سو وہ سارا دفتر گاؤخورد ہو گیا - اب تو ہندسہ اور ریاضی اور طبیعات ایسے علوم کی قدر ہو جن کا مدار بدیہیات اور مشاہدات پر ہو اور ایسے علوم دُنیا میں کام بھی آتے ہیں - ایسے ہی علوم سے ریلیں چل پڑیں، تار دوڑنے لگے، ہزاراہا قسم کی

کلیں ایجاد ہو گئیں۔ ان علوم کو پڑھتے پڑھتے آدمی کی طبیعت کچھ ایسی ہو جاتی ہو کہ بے مشاہدہ اُس کو کسی بات کا یقین ہی نہیں آتا۔ وہ ہر جگہ ڈھونڈتا ہو اقلیدس کا سا ثبوت یا حساب اور جبر و مقابلہ کا سا عمل۔ مذہب کے اعتبار سے یہ پہلا خلل ہو جس سے آج کل کا کوئی تعلیم یافتہ دماغ محفوظ نہیں۔ طبیعت تو واقع ہوئی ایسی اور مذہب کی جڑ بنیاد خدا کی شناخت جس کو نہ کسی نے دیکھا اور نہ کوئی دیکھ سکتا ہو تو ایسی طبیعتوں میں اور مذہب میں کیوں کر التیام ہو؟ اگر مذہب ہی مشاہدے کی چیز ہوتی تو جوتیوں میں دال ہی کیوں بٹتی۔ سب کی ایک مت ہوتی نہ کوئی کسی کو کافر بتاتا نہ کوئی کسی کو جہنم میں دھکیلتا۔ اندھے کو پھر بھی صبر کرنے کی جگہ ہو کہ اُس کو کچھ نہیں سوجھتا ایسا سا حدی لوچتین بڑی مصیبت تو اُس کی ہو جو اندھا بھی نہیں کہ صبر کرے اور اُس کو نور کی جھلک سی بھی دکھائی دیتی ہو۔ نہیں دیکھتا تو دل نہیں مانتا اور دیکھتا ہو تو صاف نظر نہیں آتا۔ بعینہٖ یہی حال ہو انسان کا مذہب کے بارے میں۔ اس کا دل گواہی دیتا ہو کہ خدا ہو اس واسطے کہ وہ اُس کی آواز سنتا اور اُس کی آہٹ پاتا ہو۔ مگر نہ دکھائی دیتا اور نہ پکڑائی دیتا۔ پھر اس کا دل گواہی دیتا ہو کہ گو میں دنیا سے کوچ کر جاؤں اور میری لاش کو جلا کر راکھ کر دیں اور راکھ کو دریا میں بہا دیں یا قبر کھود کر گاڑ دیں اور میرے بدن کو کیڑے کھا ڈالیں مگر میں کسی جون کی شکل میں رہوں، رہوں گا ضرور۔ پھر اس کا دل گواہی دیتا ہو کہ میں دنیا میں اچھے کام بھی کر سکتا ہوں اور برے بھی کر سکتا ہوں۔ اچھا کروں تو مجھ کو شاباش ملے گی اور برا کروں تو میری شامت آئے گی۔ بس مذہب کے بارے میں عقل انسانی کی پرواز ہو چکی گو وہ انسان افلاطون یا افلاطون کا باوا ہی کیوں نہ ہو۔ اور کوڑھ میں کھاج عقل کی نارسائی پر ماشاء اللہ کرید کہ سب کچھ جان لوں اور خدا ہو جاؤں اور یہ ساری آفت کا ہے کی ہو؟ اُسی کرید کی۔ کہ حضرت آدمؑ سے صبر نہ ہو سکا اور جس درخت کے کھانے کی مناہی تھی اُس کو کھایا پر کھایا۔ انھوں نے کھایا اور اُسی کے مزے ہم بڑے چکھ رہے ہیں۔ طبیعت کی کرید دیکھ کر خدا نے پیغمبر بھیجے کہ جہاں تک انسان کا ظرف متحمل ہو سکے اُس کو وہ بات بتا دی جائے جس کی

ٹوہ میں لگا ہی پیغمبروں نے بتایا سمجھایا۔ مگر ع میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے۔ وہ کرید لگی پہ نہ گئی کہ دُنیا کی چیزوں کی طرح خدا کو دیکھوں اُس سے خود میری باتیں ہوں اُس کا منشا معلوم کروں دُنیا سے جو جو کچھ پیش آنی ہو سب پر حاوی ہو جاؤں۔ یہ کرید تھوڑی بہت سبھی میں ہو اور آج کل کے تعلیم یافتوں میں تو جنون کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ قریب تھا کہ یہ لوگ قیدِ اسلام سے آزاد ہو کر کہیں کو آوارہ ہو جائیں۔ ان کی روک تھام کے لیئے نیچری کھڑے ہوئے۔ سو وہ شورش تو فرو ہو گئی اور رہی سہی اور فرو ہوتی جاتی ہو کہ اب کوئی انگریزی پڑھا ہوا مسلمان چاہیے وہ ایم اے اور ایل ایل بی یا بارسٹر ہی کیوں نہ ہو احاطۂ اسلام سے بھاگنے کا نام نہیں لیتا۔ مگر ہڑک تو جاتے ہی جائے گی۔

سوال۔ اگر یہ ہی تو نیچری ہم مسلمانوں کی بڑی شکر گزاری کے مستحق ہیں۔

جواب۔ خیر اگر شکر گزاری کے مستحق نہ بھی ہوں تو لعنت اور گالیوں کی بوچھاڑ کے بھی سزاوار نہیں، جو اِن پر چاروں طرف سے پڑی برس رہی ہیں۔ یہ تہ دل سے اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں۔ ان کو خود بڑی مشکل درپیش ہی کیونکہ مرض ہی سخت کہ اگر اس کو جنون سمجھا جائے تو وہ ایسا خطرناک جنون ہی کہ مجنون شاید اپنے تیئں یا کسی دوسرے کے تیئں کسی طرح کا نقصان نہ پہنچا بیٹھے اور پھر جنون بھی ہی تو نئی قسم کا جنون ہی۔ اس کے لیئے علاج بھی نیا تجویز کرنا پڑتا ہی اور نئے علاج میں کچھ غلطی بھی ہو تو چنداں لحاظ کے قابل نہیں۔

سوال۔ آپنے نیچریوں کے اصول تو خوب دریافت کیئے مگر یہ فرمایئے کہ اسلام اور تعلیم میں التیام کا اُنھوں نے کیا طریق نکالا۔

جواب۔ اُنھوں نے طریق یہ نکالا کہ جہاں تک ہو سکا اسلام ہی کو دبایا۔ اور بات بات میں تعلیم اور عقل کی جانب داری کی۔

سوال۔ یہ تو یک طرفہ فیصلہ ہوا۔

جواب۔ اس میں شک کیا ہی۔ اور اسی سبب سے تو میں اُن کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا۔
سوال۔ اچھا اگر تعلیم اور عقل کی جانب داری نکرتے تو کرتے کیا ؟ تعلیم یافتہ تو کسی طرح دبنے والے تھے نہیں۔
جواب۔ بتاؤں کیا کرتے عقل اور مذہب دونوں میں حد بندی کر دیتے جیسے ان دنوں ہماری سرکار روس اور افغانستان کے مقابلے میں کر رہی ہی۔ مگر عقل اور مذہب کے مقابلے میں جو حد بندی کی جاتی اُس میں الگ الگ تین طرح کی حد بندی ہوتی۔ ایک تو علاقہ جس میں مذہب ہی مذہب ہو اور عقل کو قطعی ممانعت کر دی جاتی کہ اپنے قدوم نحوست لزوم اس علاقے میں نہ لائے۔ دوسرے خالص عقل کا علاقہ کہ حضرت مذہب وہاں جانے کی تکلیف نہ فرمائیں تیسرا علاقہ مشترک کہ اُس میں عقل و مذہب دونوں یکساں دخیل ہوں۔ عام مسلمان تو بیچارے بھولے بھالے سیدھے سادے یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب اور عقل دونوں جوڑواں بھائی بھائی ہیں، ان میں لڑائی کا بانٹیا لیکن جن کو عقل (اس زمانے کی عقل) ہی وہ جانتے ہیں کہ عقل و رمذہب میں سدا سے کھٹ پھٹ ہوتی چلی آئی ہی اور دونوں میں نہ کبھی بنی اور نہ کبھی بنے۔ عام مسلمانوں نے تو ایک کان کیا گونگا ایک کان کیا بہرا۔ ان کو عقل و مذہب کی لڑائی کی خبر ہی نہیں اور نہ ان کے لیئے حد بندی کی ضرورت۔ جن کو عقل کے بڑے لمبے چوڑے دعوے ہیں ان ہی کو حد بندی کی بڑی ضرورت بھی ہی۔ ہم نہیں کہتے کہ نیچریوں نے مذہب اور عقل کے اختلاف کو یا حد بندی کی ضرورت کو نہیں سمجھا۔ سمجھا اور خوب سمجھا مگر علاقہ نمبر (۱) کو توڑ کر علاقہ نمبر (۲) میں شامل کر دیا اور یہ بڑی غلطی کی کہ ہمیشہ ہمیشہ کو جھگڑا قائم کا قائم رہا۔
سوال۔ ذرا علاقوں اور اُن کی حد بندی کی صراحت تو کیجیئے۔
جواب۔ لو میں اکثر مذہبی باتوں کو علاقہ نمبر (۱) قرار دیتا ہوں کہ اُس میں مذہب ہی مذہب ہو اور عقل کا دخل نہ ہو۔ میں تم سے بیان کر چکا ہوں کہ مذہب کا سارا دار و مدار خدا شناسی پر ہی۔ خدا کو

مانا، اپنے تئیں نیک و بد کا ذمہ وار سمجھنا اور مرنے کے بعد اپنے باقی رہنے کا یقین کیا۔ تو ان سب خیالات کے
جمع ہونے سے مذہب پیدا ہوا۔ اور خدا شناسی میں جہاں تک ہم کو ملکہ ہے وہ بھی بیان کر چکا ہوں
تو سرے سے مذہب کی بنیاد ہی نامفہوم چیز پر ہے تو ایسا علاقہ نکلا یا نہ نکلا جہاں مذہب ہی مذہب ہے
اور عقل کا دخل نہیں۔ میں اکثر مذہبی باتوں کو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ ان میں عقل کو دخل دینا وضع الشئی
فی غیر محلہ ہے۔ مثلاً خدا کی ذات و صفات میں عقل دوڑانی لاحاصل ہونے کے علاوہ دخل حمق ہے اسی طرح
بعد مرگ جو جو حالتیں پیش آئیں گی اُن میں رائے زنی کرنا دخل حمق ہے۔ تمام جزئیات شرعیہ کی مصلحتوں کو
معلوم کرنے کی کوشش کرنا دخل حمق ہے۔ جبر و قدر کی پہیلی کے پیچھے پڑنا دخل حمق ہے یا روح کی ہیئت کے
درپے ہونا دخل حمق ہے۔ اور اسی طرح سیکڑوں باتیں نکلیں گی جہاں عقل کے پر جلتے ہیں تو کیوں ایسا علاقہ
قائم نہ کیا جائے جہاں عقل کا مطلق دخل نہ ہو۔ علاقہ نمبر (۲) دنیا کے دھندے ہیں کھیت میں چنے
بوئیں یا مٹر۔ جوتی سلیم شاہی پہنیں یا گول پنجے کی یا اوٹ یا گرگابی۔ کہ ایسی باتوں سے مذہب کے کچھ سروکار نہیں
علاقہ نمبر (۳) میں تمام اخلاقی باتیں ہیں کہ عقل اور مذہب دونوں کا اُن پر اجماع ہے۔

سوال۔ یہ آپ نے عقل اور مذہب میں حد بندی اور علاقوں کی تقسیم تو خوب نکالی ہے۔

جواب۔ جی ہاں۔ ایسا نہ کریں تو مذہب کی طرف سے اطمینان کیوں کر ہو۔ یہ من سمجھوتیاں برسوں کی
غور کے نتیجے ہیں اور برسوں ہی کے غور میں ذہن نشین بھی ہوتے ہیں۔

سوال۔ تو آپ کے نزدیک نیچریوں نے کیا غلطی کی ذرا یہ فرمائیے گا۔

جواب۔ اصل غلطی تو یہ ہے کہ عقل سے اس کی بساط سے بہت زیادہ کام لینا چاہتے ہیں اور غلطی کا
قاعدہ ہے کہ بڑی جلدی انڈے بچے دیتی ہے جہاں ایک بڑی غلطی کی اور اُس سے دوسری غلطیاں
پیدا ہوئیں۔ اکثر تو ان لوگوں کو غیر ضروری باتوں میں بہت وقت ضائع کرنا پڑتا ہے اور پھر عقل کی
نارسائی کے تسلیم کرنے کی تو کھائی ہے قسم، ایسی ایسی مکروہ غلطیاں کرتے ہیں کہ تو بہ ہی بھلی ہے لاحول

اصل مطلب فوت ہوتا ہے سو الگ۔ حدیث تفسیر فقہ کو تو بالائے طاق رکھ ہی دیا تھا صرف ایک قرآن بچا تھا وہ بھی اس لیئے کہ اس پر فالالحا فظون کا پہرا کھڑا تھا تو اُس کو بھی ماستے تاویلوں کے ایسا اُلٹو کیا ہے کہ اس کی فصاحت بلاغت پر پانی پھرا تو پھر ظاہر عبارت پر سے بھی اعتماد اُٹھ گیا۔ چلے تھے لوگوں کو مسلمان بنانے، ان کو اصل دین یعنی قرآن میں بھی شک پڑ گئے۔ میں ایسے جوتڑوں سے کان گانٹھنے پر آؤں اور قرآن اور بدعادت کو ایک نہ کر دکھاؤں تبھی کہنا۔

سوال۔ مجھ کو تو کوئی خاص مثال دے کر ان نیچریوں کی غلطی سمجھایئے تب میری تسکین ہو۔

جواب۔ مثالوں کو لے کر کیا کرو گے؟ وہی کلیہ قاعدے کیوں نہیں یاد رکھتے جو میں نے تم کو بتا دیئے ہیں کہ عقل انسانی قاصر محدود ہے، اُس کو اُس کی حد سے باہر مت ہونے دو۔ اور دین میں سیکڑوں ہزاروں باتیں ہیں سب پر مقدم اپنے نفس کی اصلاح۔ اور معلوم ہے کہ آدمی تا مرگ اصلاح نفس سے فارغ نہیں ہو سکتا۔ پس ضروری کو چھوڑ کر غیر ضروری باتوں میں مشغول ہونا وقت جیسی قیمتی چیز کا ضائع کرنا ہے جس کی بازپرس ہونی ہے۔ تو جب کوئی مذہبی بات تمھارے سامنے پیش آئے سب سے پہلے دیکھو کہ اصلاح نفس سے متعلق ہے یا نہیں۔ اگر نہیں یا عقل انسانی کی رسائی سے باہر ہے اور جھگڑے کی ساری باتیں اسی قسم کی ہیں، تو اس کان سُنو اور اس کان نکال دو۔ شیطان کے بہکانے بھٹکانے کے ہزاروں رستے ہیں اُن میں کثیر الوقوع یہ بھی ہے کہ آدمی دین سمجھ کر ایک کام میں لگا رہتا اور اُس شغل کو کار نیک سمجھ کر اُس کے اجر اور ثواب کی توقع رکھتا حالانکہ وہ کام نیک ہو یا نہ ہو اُس کے نہ کرنے سے اس پر کسی طرح کا الزام نہیں اور سیکڑوں ضروری کام ہیں جن کی بازپرس ہونی ہے وہ سب جانتے ہیں اور آدمی اُن کے سرانجام میں غفلت کرتا ہے۔ یہ آفت اکثر پڑھے لکھوں میں ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اُن کی لیاقت اور ذہانت کی تعریفیں کرتے ہیں اور یہ سُن سُن کر پھولے نہیں سماتے۔ شاید اتنی نیکی بھی کی ہو کہ دوسروں کو غلطی اور گمراہی سے بچایا مگر عُجب اور خود پسندی سے

اپنے تئیں تو تباہ کر لیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا۔ دوسرے لوگوں کے جھگڑے تو پُرانے پڑ گئے ہیں اب کوئی ان کی طرف التفات بھی نہیں کرتا اور یہ مقلدوں غیر مقلدوں کی نزاعیں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں کہ تمام سمجھ دار آدمی ان پر ہنستے ہیں۔ مگر ہاں نیچری فرقہ نیا کھڑا ہوا ہے۔ اور اس میں لوگ بھی بڑے بڑے ذہین اور لائق ہیں سو یہ بھی آخر کار کسر انکسار ہو کر ایک نہ ایک دن اپنے ٹھکانے سے لگ رہیں گے۔ ان کی کونسی خاص بات بیان کروں **دعا** اور **قدرت** اور **وحی** اور **معجزات** اور **ملائکہ** اور **شیطان** اور **جنت** اور **دوزخ** اور **آسمان** ایک چیز بھی اُنھوں نے نہیں چھوڑی جس میں عقلی نکتے نہ چلائے ہوں اُنھوں نے اپنا اصول ہی ٹھیرا رکھا ہے کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ جو بات سمجھ میں آئی اُس سے انکار۔ اور میں ان سب کو غیر ضروری اور ادراکِ انسان سے بالاتر سمجھتا ہوں۔

دُعا

سوال۔ اگر آپ دعا وغیرہ ان ہی چند باتوں کی نسبت اپنی رائے ظاہر فرمائیں تو میں نہایت درجہ ممنون ہوں گا۔ اور شاید میں اس سے زیادہ آپ کو تکلیف بھی نہ دوں۔

جواب۔ دعا کا حال یہ ہے کہ میرے نزدیک کوئی فردِ بشر اس سے منکر نہیں یعنی کوئی بندہ بشر نہیں جو مصیبت میں دعا نہ مانگتا ہو۔ اور دعا نہیں مانگتا دل کی خالی خولی تسلی کے لئے، بلکہ اُس تسلی کے لئے جو حصول مدعا سے ہوتی ہے۔ یعنی ہر فرد بشر کو کامل یقین ہے کہ کوئی اس کے دُکھ درد سُننے والا ہے اور ایسا سُننے والا کہ وہ اس کی مدد کر سکتا ہے اور اُس کو پورا بھروسا ہی کرے گا۔ تو یہ انسان کی ایک خلقی بات ہوئی اور دعا سے انکار کرنا اصول نیچر کے خلاف ہوا۔ فلاسفہ میں سے ایک گروہ سوفسطائیوں کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دُنیا میں کچھ ہے ہی نہیں یہ سب وہم کا کارخانہ ہے۔ ایک چیز جس کو ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں خارج میں کہیں

لہ اور ان کو خیال یہ ہے کہ ہم اچھا کر رہے ہیں۔

اس کا وجود نہیں ہمارے وہم نے اُس کو موجود مان لیا ہے۔ وہ لوگ خوشی اور رنج اور راحت اور درد کسی کے قائل نہیں مگر یا ایں ہمہ دنیا بھی ہے اور اس میں بے شمار مخلوق بھی ہے، خوشی اور رنج بھی ہے، راحت اور درد بھی ہے کیوں ہے؟ اس لیئے کہ ہم دیکھتے اور احساس کرتے ہیں۔ غرض ہمارا دیکھنا اور احساس کرنا ہی چیزوں کے موجود ہونے کی دلیل ہے اور اس کے سوائے ہمارے پاس کوئی اور دلیل نہیں اور نہ کسی اور دلیل کی حاجت۔ اسی طرح دعا بھی ہے۔ کیوں ہے؟ اس لیئے کہ ہم کو خود بخود اس کے ہونے کا یقین ہے جو شخص دعا کا منکر ہو اُس کو چاہیئے کہ دعوئے اسلام سے دست بردار ہو کر سوفسطائیوں میں جا ملے۔ مگر نیچری ہونا اور ان کے نیچر کو نہ ماننا اور سوفسطائیوں کی سی باتیں کرنا اور اسلام کا دعویٰ، یہ تو کوئی معقول بات نہیں ہے یہ بات کہ کیوں ہر طرح کی دعا قبول نہیں ہوتی اور کیوں ہمیشہ قبول نہیں ہوتی، اس سے تو دعا کو اور تقویت پہنچتی ہے کہ باوجودے کہ ہر طرح کی دعا قبول نہیں ہوتی اور ہمیشہ قبول نہیں پھر بھی لوگ دعا کیئے ہی جاتے ہیں اس واسطے کہ دعا اُن کی فطرت میں داخل ہے۔ دعا کا تو نام ہے، اصل تکرار اس بات کی ہے کہ خدا کی قدرت محدود ہے یا نامحدود۔ میرے روبرو یہ مسئلہ پیش کیا جائے تو میں فوراً اس بحث کو بند کردوں کہ خدا کی ذات اور صفات میں زیادہ غور خوض کرنا ہماری عقل کی رسائی سے باہر بات ہے۔ لیکن لوگوں کے سروں میں میرا دماغ نہیں، دماغوں میں میرے خیالات نہیں۔ نیچری خدا کو قادر مطلق تو مانتے ہیں مگر اس طرح پر کہ اُس نے اپنی مرضی سے ایک قاعدے پر دنیا کے انتظام کو چلا دیا۔ اب وہ قاعدہ ٹوٹ نہیں سکتا نہ اس واسطے کہ خدا اس کو توڑ نہیں سکتا بلکہ اس واسطے کہ وہ اس کو توڑنا نہیں چاہتا۔

سوال۔ کم بخت بات تو مغز سے ایسی اُتار کر لاتے ہیں کہ کسی کے اُٹھائے نہ اُٹھے۔

جواب۔ یہ سچ ہے کہ دنیا کا انتظام ایک نسق پر چل رہا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ نسق ناقابل تبدیل بھی معلوم ہوتا ہے مگر ہماری معلومات اس قدر ناقص ہے کہ اول تو ہم یقینی طور پر نہیں

جان سکتے کہ وہ نسق ہی کیا۔ ہم ایک واقعے کو دیکھتے ہیں اور اپنے نزدیک اُس کا ایک سبب ٹھہرا لیتے ہیں
ممکن ہے کہ جس کو ہم نے سبب سمجھا ہو وہ سبب کافی نہ ہو۔ اس میں کچھ شرائط ہوں، یا اس کے ساتھ دوسرے
اسباب ہوں اور وہ ہم کو معلوم نہ ہوئے ہوں۔ یہ ریلیں اور تار برقی اور ہزارہا قسم کی کلیں جو چل پڑی ہیں
ان کے معنی کیا ہیں کہ نئے نئے اسباب انسان کو دریافت ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے زمانۂ گزشتہ کے
حالات بھی تو مبہم ہیں۔ کوئی شخص وثوق کے ساتھ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ شروع دنیا سے فلاں واقعے کے
خلاف کبھی نہیں ہوا۔ ہاں یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے علم میں اس کے خلاف نہیں ہوا لیکن کیا وہ اور کیا اُس کا علم!
یہ حشرات الارض جو برسات کا پانی پڑنے سے زمین میں کو دنے اچھلنے اور رینگنے لگتے ہیں ان کو کیا خبر
کہ دنیا میں گرمی اور جاڑے کے موسم میں کیا ہوا کرتا ہے۔ زمانے کے امتداد پر نظر کرو اور پھر ان کی ہستی کو
دیکھو تو آدمی حشرات الارض سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ باوجودے کہ
ہم دُنیا کے انتظام کو ایک نسق پر چلتا ہوا دیکھتے ہیں ساتھ ہی ہم اس کو قابل تبدیل بھی سمجھتے ہیں ورنہ
دعا ہی کیوں کرتے۔ رہی یہ بات کہ دنیا کے انتظام کو ہم کیوں قابل تبدیل سمجھتے ہیں اس کا وہی جواب ہے کہ
ہماری فطرت ہی اسی طرح کی واقع ہوئی ہے۔ مزہ تو اسی میں ہے کہ نیچری کو نیچر قائل کرے۔ نیچریوں نے اپنی
اس رائے کے نتائج پر نظر نہیں کی ورنہ ایسی بات اُن کو مُنہ سے نکالنی بھی مناسب نہ تھی ؎

تو برائے وصل کردن آمدی　٭　نے برائے فصل کردن آمدی

میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ اگرچہ دنیا کے امن و انتظام میں حکامِ ظاہر کو دخل ہے مگر نہ مذہب جتنا
آج دُنیا کے تمام لوگوں کی (صرف معدودے چند نیچریوں کی نہیں تو مُنہ سے کہنے کی سند نہیں بلکہ
واقع میں تہ دل سے) یہ رائے ہوئے دو کہ خدا نہیں یا ہے اور جو کچھ اُس کو کرنا تھا کر چکا۔ پھر دیکھو
کہ دُنیا کا کیا رنگ ہوتا ہے۔ فرانس اور اٹلی نے حکماً مذہب کو انتظام دنیا سے خارج کر کے کیا پھل پایا۔
مردم شماری گھٹ گئی، جرائم کی تعداد اضعافاً مضاعفہ بڑھ گئی، ملک سے برکت سلب ہو گئی

تو ہار کر پھر چاہتے ہیں کہ حسبِ دستورِ سابق مذہب کو رواج دیں- مذہب سے علیحدہ ہو کر دُنیا میں نیکی رہ ہی نہیں سکتی اور اس جگہ مذہب سے مراد یہی خیال کہ خدا اپنی ذات سے دُنیا میں تصرف کرتا ہی اور وہ اسباب کا محکوم یا محتاج نہیں-

وحی اور معجزات

سوال- اچھا اب چلیئے وحی-

جواب- یہ بحث جا پہنچتی ہی خدا کی صفات میں جب ہم نے ایک شخص کو پیغمبر مانا اور تسلیم کر لیا کہ اس بندے کو خدا سے خاص طرح کا تقرب ہی- تو اُس تقرب کی کیفیت میں ہم کلام کر نہیں سکتے- وہ بندۂ مقرب اپنے تقرب کی نسبت جو کچھ بیان کرے ہم کو مان لینا پڑے گا- اور اس کی زیادہ تفتیش کرنے سے ہم کو فائدہ ہی کیا ہی- تقرب ہی تو اُس کو ہی نہ ہم کو- ہم کو اس کے تقرب سے کام ہی نہ تقرب کی کیفیت سے-

سوال- اچھا معجزات؟

جواب- یہ قدرت کی بحث کا ضمیمہ ہی- بات ایک ہوتی ہی اور اُس میں شاخ در شاخ بہت سی باتیں نکلتی چلی آتی ہیں، اس پر بھی ساری ہی قوموں کا اجماع ہی- وہ کون مذہبی گروہ ہی ذرا میرے سامنے تو آئے جو معجزات اور خوارق عادات اور کرامات او استدراج کا قائل نہیں اور قائل بھی ایسے ایسے لوگ ہیں کہ ایسے مقدس آدمی جھوٹ بولنے لگیں تو جانو کہ دُنیا میں کہیں سچ کا نام نہیں- خدا کی قدرت پر نظر کرو تو معجزہ کچھ تعجب کی چیز نہیں- دُنیا کا ہر واقعہ معجزہ ہی- فرق اگر ہی تو اسی قدر ہی کہ ایک چیز آئے دن واقع ہوتی رہتی ہی، ہم اُس سے خوگر ہو گئے، تعجب نہیں کرتے- ایک چیز جو شاید معمولی چیز وں سے وقعت میں کم بھی ہو- شاذ و نادر واقع ہوتی ہی ہم کو تعجب ہوتا ہی-

✽✽✽

اِنَّ فی خلقِ السمٰوٰت والارض واختلافِ اللیل والنھار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماءٍ فاحیا بہ الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لاٰیٰتٍ لقومٍ یعقلون[1] - یہ بھی ذرا خیال کرنے کی بات ہے کہ اگر کوئی واقعہ خلاف عادت واقع ہو تو گواہی کے سوائے اُس کا اور کیا ثبوت دیا جاسکتا ہے اور گواہی کو لوگ صرف اس وجہ سے متہم کریں کہ واقعہ خلاف عادت ہے تو یہ نری زبردستی اور ہٹ دھرمی نہیں تو کیا ہے؟ علاوہ بریں میں تو معجزات کی کچھ ایسی بڑی وقعت بھی نہیں کرتا - وہ کوئی اور ہوں گے جن کو معجزات سے تسکین ہوتی ہوگی - ہم کو تو تسکین ہوتی ہے پیغمبر کی تعلیم سے یا پیغمبر کی طرزِ زندگی سے -

سوال - اب ملائکہ کا نمبر ہے -

جواب - ملائکہ سے جو انکار کیا جاتا ہے تو صرف اتنی بات پر کہ دکھائی نہیں دیتے - سو خدا کرے کہ ابھی نہ دکھائی دیں یوم یرون الملائکۃ لابشریٰ یومئذ للمجرمین ویقولون حجراً محجوراً[2] تاویل یہ کرتے ہیں کہ ملائکہ سے مناسب مقام کا بلیوں کی طرح کے قوی ہیکل لوگ، یا اللہ کے نیک بندے، یا انسان کی وہ روحانی قوتیں جو نیک کام کرنے کی داعی ہوتی ہیں مراد ہیں لیکن ہم فرشتوں کو اسی طرح کا مخلوق مانیں جیسا کہ عام مسلمان مانتے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کیا قباحت لازم آجائے گی - یوں بھی خدا اپنے تصرفات دوسری چیزوں کے ذریعے سے نافذ کرتا ہے - وہ ذریعہ (مثلاً آگ پانی ہوا) نہ ہوئے فرشتے ہوئے ہی اور فرشتوں کے نہ دیکھ سکنے کی کیا شکایت کریں جب کہ اپنی روح جس کو ساری عمر بغل میں پالا کیے دیدار کے دکھانے کی روادار نہیں - ملائکہ کے متعلق ایک قصہ قرآن میں ہے کہ خدا نے آدم کو پیدا کر کے زمین میں

---

[1] بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے ردوبدل میں اور کشتی میں جو لوگوں کے کام کی چیزیں لے کر دریا میں چلتی ہے اور مینہ میں جسے اللہ نے آسمان سے برسا کر زمین کو افتادہ ہوئے پیچھے پھر جلا اٹھایا اور ہر طرح کے چلتے پھرنے جانور اس میں پھیلا دیتے اور ہواؤں کے الٹ پلٹ میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرا رہتا ہے سمجھنے والوں کے لیے بہتیرے ہی قدرت کے نشان ہیں - [2] جس دن فرشتے نظر آئیں گے گنہ گاروں کے لیے کوئی خوشی (النصیب) نہ ہوگی اور (فرشتوں کو دیکھ کر) کہیں گے کہ دور دفان -

ں کو اپنا نائب بنانا چاہا تو فرشتے متعرض ہوئے۔ خدا نے آدم اور فرشتوں سب چیزوں کے نام
چھے۔ آدم اس امتحان میں پاس ہوا اور کُل فرشتے فیل۔ تب خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کا ادب کریں
ف شیطان نے نافرمانی کی اور راندہ گیا۔ یہاں فرشتوں سے نیکی کا رجحان اور شیطان سے بدی کا میلان
د لیتے ہیں کہ خدا میں اور فرشتوں میں بحث کا ہونا سخت نامعقول بات ہے۔ لیکن اگر خدا میں اور
توں میں بحث کا ہونا نامعقول بات ہے تو خدا میں اور آدم کی نیکی کے رجحان اور بدی کے میلان میں
ث کا ہونا اس سے زیادہ تر نامعقول بات ہے۔ اور یوں ہنسی اُڑانے پر آؤ تو ہر ایک بات کی ہنسی
ئی جا سکتی ہے وکان الانسان اکثر شیءٍ جدلا[1] مجھ کو تو اس ہنسی اڑانے پر بے اختیار قرآن کی وہ آیت
ئی ان تقول نفس یا حسرتیٰ علیٰ ما فرطت فی جنب اللہ وان کنت لمن الساخرین[2]۔ اسی طرح ایک
ان کی ایک تحریر نظر پڑی ہے۔ وہ عیسائیوں کی اس دعا کے ساتھ تمسخر کرتا ہے جو گرجاؤں میں مانگی جاتی ہے
ے ہمارے آسمانی باپ۔ تیرے نام کی تقدیس ہو۔ تیری بادشاہت آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان میں ہے
ا ہی زمین پر بھی ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے"۔ اس پر وہ مسلمان صاحب فرماتے ہیں۔
یٹ بھرنے کی دعا تو گدھا بھی ہر روز مانگتا ہے۔ یعنی یہ دعا خدا کی تعلیم کی ہوئی نہیں معلوم ہوتی
ا تک تو چنداں مضائقے کی بات نہیں کہ مسلمان تورات و انجیل کو محرّف سمجھیں۔ اتنی پرانی
ں کا ترجمہ در ترجمہ ہو کر تبدیل سے محفوظ رہنا قرین قیاس نہیں۔ کچھ بھی کرو ترجمے میں ہو بہو
ں کی شان تو باقی رہتی نہیں اور یہ آزمائی ہوئی بات ہے۔ اس پر وہ آفتیں جو یہودیوں اور
ائیوں پر مخالف مذہب والوں کے ہاتھ سے نازل ہوتی رہیں، جلاوطن کر دیئے گئے، اُن کی
ہا چھین کر جلا دیں۔ اور اُس زمانے کی کتابیں ایسی تھیں ہی کتنی۔ پھر ہر مذہب میں ایسے بدنفس بھی ہوتے

---

[1] نسان تمام مخلوقات سے زیادہ جھگڑالو ہے۔ [2] (آخر کار تم میں سے) کوئی کہنے لگے کہ اے افسوس میری
ر کوتاہی) پر جو میں نے پاس خدا (ملحوظ رکھنے) میں کی اور میں تو (ان باتوں پر) ہنستا ہی

رہے ہیں جو ضد یا لالچ میں آ کر اور نہیں تو معنوں ہی میں اُلٹ پھیر کرنے کو موجود ہو جاتے ہیں۔ لیکن با ایں ہمہ اسلام نے تورات اور انجیل کا برابر ادب قائم رکھا ہے۔ پیغمبر صاحب ان ہی کتابوں سے استشہاد کرتے تھے مصدقاً لما معکم۔[1] انا انزلنا التوراۃ فیہا ھدی و نور[2] وقفینا علی آثارھم بعیسی ابن مریم مصدقاً لما بین یدیہ من التوراۃ و اتینہ الانجیل فیہ ھدی و نور و مصدقاً لما بین یدیہ من التوراۃ و ھدی و موعظۃ للمتقین[3] جن کتابوں کو خدا ہدیٰ اور نور اور موعظہ فرمائے مسلمان کی یہ شان نہیں ہونی چاہیئے کہ ان کی توہین کرے اور خدا کی تعلیم کی ہوئی دعا کو گدھے کے رینگنے سے بھی گئی گزری سمجھے۔ ہمارے خیال میں تو نہیں آتا کہ خدا کو رب العالمین کہنا اور اس سے روزی مانگنا دونوں میں کیا فرق ہو سکتا ہے۔ اگر لوگوں نے تورات اور انجیل میں تحریف کی اور ہم کہتے ہیں کہ کی تو پیشین گوئیوں میں کی ہوگی، احکام میں کی ہوگی دعاؤں میں تحریف کرنے کی ان کو کیا ضرورت پڑی تھی؟ اسی خیال سے میں نے تم کو مباحثے اور مناظرے کی سخت ممانعت کی کہ اب مباحثے اور مناظرے کا یہ رنگ رہ گیا ہے اور یہ تو بڑا اہلکار رنگ ہے لیکن کیا اسی طرز سے تم عیسائیوں کو مسلمان کرنا چاہتے ہو؟ یوں کہو کہ اس طرز کو دیکھ کر مسلمان بھی مسلمان رہتے ہیں یا نہیں۔

سوال۔ اب اس ذکر کو جانے دیجیئے سن کر طبیعت کو بڑا رنج ہوتا ہے۔ وہی نیچریوں کے خیالات بیان کیجیئے کہ شیطان کے بارے میں ان لوگوں کی کیا رائے ہے۔

جواب۔ فرشتوں کے ذکر میں سن نہیں چکے؟ اب اس کے دہرانے کی کیا ضرورت ہے؟

سوال۔ ایک اعتراض تو نیچریوں کی طرف سے مجھ کو بھی کرلینے دیجیئے۔

---

[1] (کتاب تورات) کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے [2] ہم (ہی) نے تورات نازل کی جس میں (ہر طرح کی) اور نور (ایمان) ہے [3] اور بعد کو ان ہی (پیغمبروں) کے قدم بقدم ہم نے مریم کے بیٹے عیسے کو بھیجا کہ وہ تورات کی جو اُن کے (وقت میں) پہلے سے موجود تھی تصدیق کرتے تھے اور ان کو ہم نے انجیل (بھی) دی جس میں (ہر طرح کی) سوجھ اور نور (ہدایت) موجود ہے اور تورات جو اس کے (نزول کے زمانے میں) پہلے سے (موجود) تھی (یہ انجیل) اس کی تصدیق بھی کرتی اور (خود بھی) پرہیزگاروں کے لیئے ہدایت اور نصیحت ہے۔

جواب۔ بسم اللہ۔

سوال۔ بھلا یہ تو فرمایئے کہ شیطان کو ہمارے پیچھے لگا دینا کہ ہر وقت ہماری بدی ہلاکت کے درپے رہے اور ہم اُس کو دیکھ بھی نہ سکیں آپ کو بھی خدا کی شان اور اُس کے انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہے یا نہیں اِس سے تو وہ بدی کا میلان ہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

جواب۔ اب تم لگے اسرار مصالح خالق عالم میں دخل دینے۔ اور یوں تو سرے سے انسان کا پیدا کرنا اور اُس کو مارنا ہی خدا کی شان اور اُس کے انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ شیطان پیدا کرنا انصاف سے بعید ہے تو انسان میں بدی کا میلان پیدا کرنا کیوں انصاف سے بعید نہیں۔ دونوں کا نتیجہ ایک ہے مگر ایک نکتہ بتاتا ہوں، کیا یاد کروگے۔ بدی کو شیطان کی طرف منسوب کرنے میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ گو آدمؑ نے خدا کے حکم سے سرتابی کی اور جس درخت کی مناہی تھی کھا لیا مگر پھر بھی خدا نے اپنی مہربانی اُس پر سے کم نہیں کی۔ کھایا آدمؑ نے اور تھوپا گیا شیطان کے سر۔ مجرم کو رو در رو کہہ دینا کہ تیرا قصور ہے اور ایک آڑ رکھ کر اُس کو الزام دینا، دونوں میں بڑا فرق ہے۔ شیطان کا پیدا کرنا جس کو ہم دیکھ بھی نہیں سکتے ظلم ہوتا اگر ہم کو آگاہ نہ کر دیا گیا ہوتا۔ اور یوں دنیا میں بہت سے انسان کی جان کے دشمن موجود ہیں وہ پانی میں ڈوب جاتا، آگ اُس کو جلاتی، بجلی گرتی، سانپ کاٹتا، زہر سے مرتا اور پھر اتنے دشمنوں میں زندہ رہتا۔ اب کہیں سوالات کا سلسلہ ختم بھی کروگے جی تو اُکتا گیا۔

سوال۔ بس اب ختم ہی سمجھیے دو چار باتیں اور رہ گئی ہیں۔ آپ کا جی تو بے شک اُکتا گیا۔ مگر میرے دل سے تو پوچھیے کہ میرے حق میں آپ کا ایک ایک لفظ آب حیات کا سا کام کر رہا ہے اب جنت اور دوزخ کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب۔ میں کیا فرماؤں گا۔ نہ اِس کو دیکھا نہ اُس کو۔ ہاں اِس سے جو پیغمبر صاحب سے سنا دوزخ کا تو دیکھنا تک بھی گوارا نہیں، جنت کی تمنا ہے سو وہاں جانے کی جو شرائط ہیں ادا نہیں ہوتیں غرض ذاتی معلومات تو

جنت اور دوزخ کی نہ ہے اور نہ اِس زندگی میں ہو سکتی ہے۔ مرے پیچھے جو بات سو بات۔ ہمارے
یہاں ایک مُسلمان کالٹر کا خدمتگار تھا کچھ احمق اور مسخرہ سا۔ تو بچّے اُس کو چھیڑتے اور پوچھتے۔
کیوں بے فلانے تو بہشت میں جانا چاہتا ہے یا دوزخ میں۔ وہ کہتا میاں وہاں چل کر دیکھوں گا اور اِدھر
یا اُدھر ہو رہوں گا۔ میرے کان میں اس کی بات پڑتی تو کہتا ایسی بے خبری ہے تو یہ اب بھی بہشت ہی
میں ہے۔ نیچری بیچارے تو جب مجبور ہوتے ہیں اور جواب بن نہیں آتا تو ناچار تاویل پر اُتر پڑتے ہیں۔
اصل میں یہ اعتراض عیسائیوں کا ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کے مزوں کو جمع کر کے ایک خیالی بہشت بنا رکھی ہے
جو خدا کے تقدّس کے بالکل خلاف ہے۔ میں کہتا ہوں دُنیا میں جو خدا نے یہ مزے پیدا کیے ہیں،
خدا کے تقدّس میں ابھی کونسا فرق آ گیا ہے کہ بہشت میں ان کے ہونے سے آ جائے گا۔ عیسائیوں کی
تو بات بات میں رہبانیت ہے اور وہ نہ چلی ہے اور نہ چل سکتی ہے۔ اگر انسان کی ایک خواہش کا پورا ہونا
گناہ نہیں تو دوسری خواہش کا پورا ہونا کیوں گناہ ہو۔ خواہش ہونے میں سب خواہشیں برابر ہیں۔
ہاں کیفیتیں مختلف ہوں۔ اگر وہ کھانا کھا سکتا ہے تو پانی کیوں نہ پیئے۔ اگر کھانا کھا سکتا اور پانی
پی سکتا ہے تو سونے کو اُسے کس نے منع کیا۔ مَن[1] حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبٰت من
الرزق دنیا کے کسی مزے میں گناہ نہیں۔ گناہ ہے تو ان سے ناجائز طور پر فائدہ اُٹھانے میں ہے، اُن
مزوں میں پڑ کر خدا سے غافل ہو جانے میں ہے اور خدا کی ناشکری میں۔

سوال۔ اچھا پھر نیچری کیا کہتے ہیں؟

جواب۔ نیچری کہتے ہیں لوگوں کے سمجھانے کو تمثیل کے طور پر جنت کے مزے اور دوزخ کی
تکلیفیں بیان کر دی ہیں۔ رنج و راحت آخرت میں بھی ہے مگر ہم اُس کی کیفیت کے سمجھنے کے
لائق نہیں ناک اُسی جگہ ہے جو سامنے سے نہ بتاؤ تو اور گدّی کے پیچھے ہاتھ لیجا کر بتاؤ۔ ہم تو چھوٹتے ہی یہی

---

[1] (اے پیغمبر! لوگوں سے) پوچھو کہ اللہ نے جو زینت (کے ساز و سامان) اور کھانے (پینے) کی ستھری چیزیں اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں (ان کو) کس نے حرام کیا ہے۔

جواب دیتے کہ دوزخ ہو یا جنت یہ وہ چیزیں ہیں جن سے مرے پیچھے واسطہ پڑے گا۔ وحی کے سوائے ہم کو کوئی ذریعہ ان کی حقیقت دریافت کرنے کا نہیں اور جو کچھ وحی میں ہی ہم اُس سے نہ ایک حرف کم کہہ سکتے ہیں اور نہ ایک حرف زیادہ اور تاویل کرتے ہیں بلکہ سکوت اور زیادہ تفتیش کرنے کو اپنے حق میں بالکل غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

سوال۔ اب تو صرف ایک آسمان رہ گیا ہی اور بس۔

جواب۔ اچھا تم نے میرے لفظوں کو یاد رکھا۔ ابھی ان پر کیا موقوف ہی ایسی بیسیوں باتیں ہیں وہ جو گربھا میں نے تم کو سمجھا ہی دیا آسمان کا بھی قرآن میں بہت ہی جگہ مذکور ہی۔ اول تو زمین میں اس کے تصرفات بکثرت ہیں۔ آسمان سے پانی برستا، آسمان سے روشنی آتی، آسمان سے سبتک پہنچتی، آسمان کے تعلق سے ہمارے موسم بدلتے، آسمان کے تعلق سے ہماری روزی پیدا ہوتی پھر آسمان میں اجرام فلکی ہیں اور ان کی حالتوں میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان سے بھی ہمارے کام نکلتے ہیں ان کے علاوہ آسمان خدا کی قدرت کا بڑا عظیم الشان نمونہ ہی۔ یوں دیکھو تو ایک نیلا سا سرپوش زمین پر ڈھکا ہوا معلوم ہوتا ہی اب اکہ دور تک کنکوا بڑھائیں تو شاید آسمان کو جا لگے۔ مگر جتنی دور آنکھ سے دکھائی دیتا ہی وتنی ہی دور بڑے سے بڑے پلے کی دوربین سے۔ غرض یوں کھلی دیتا ہی تو کیا ہی اس کو بھی ایک اعتبار سے اُن ہی چیزوں میں سمجھو جو نظر نہیں آتیں، جیسے فرشتے جنات بہشت دوزخ وغیرہ۔ آدمیوں کو اختلاف کرنے کے لیے اتنا لس کرتا ہی۔ یہ حضرت عقل دوڑائے بدون رہنے کے نہیں جو جس کی سمجھ میں آتا ہی کہتا ہی۔ اصل حقیقت خدا کو معلوم ہی۔ اپنی نارسائی کا تو حال یہ ہی کہ اپنے ہی تئیں نہ جانا کہ کیا ہیں۔ آسمان کے پیچھے کیا سر کھپائیں۔ مذہب کی رو سے جو تعلق ہم کو آسمان سے ہی وہ یہی ہی کہ ہم اُس کو دیکھیں اور اپنی بے حقیقتی اور خدا کی عظمت کے خیال کو دل میں جمائیں۔ اور جو ان فکروں میں پڑے ہیں کہ وہ ہی بھی یا نہیں، اور ہی تو کتنی دور ہی، اور کاہے کا بنا ہو، دنیا

اُن کی لیاقت اور ذہانت کی مدح کرے اور وہ اپنے جی میں خوش ہوں۔ مگر مذہب کو علاقہ نمبر (۲) کی باتوں سے کچھ سروکار نہیں۔ خدا قرآن میں فرماتا ہے۔ وجعلنا السماء سقفا محفوظا وھم عن ایاتہا معرضون[1] جس نظر سے علم ہیئت والے اجرام فلکی کے حالات کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں ہم تو اُن کو اس آیت کے الزام سے بری سمجھتے ہیں۔ آسمان کے متعلق ان دنوں ایک نئی بحث چلی ہے کہ قرآن میں کئی جگہ اس کا مذکور ہے کہ خدا نے زمین و آسمان کو یعنی سارے جہان کو چھ دن میں بنایا۔ چھ دن نہ اس سے لگے کہ خدا اس سے کم میں بنا نہیں سکتا تھا۔ مگر اُس نے کسی مصلحت سے جو ہم پر منکشف نہیں چھ دن لگائے۔ کہتے ہیں کہ اس دیر کے لگانے سے ہم لوگوں کو دکھانا سکھانا منظور تھا کہ کوئی کام ہو آہستگی کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ خیر تو یہ واقعہ اُن وقتوں کا ہے کہ آدم خاکی کا وجود بھی نہ تھا اور آدم کی نسل نے بھی پیدا ہوتے کے ساتھ ہی سب کمالات حاصل نہیں کر لیئے تھے۔ ہزاروں برس کے تجربے کے بعد تو ہم اس درجے کو پہنچے ہیں۔ سو جاننے والے اس کو بھی ترقی کی ابجد ہی بتاتے ہیں اور ہے بھی یوں ہی۔ آدمی نہ صرف آنے والے واقعات کے جاننے سے عاجز ہے بلکہ ایک مدت کے بعد اس کو گزشتہ واقعات کا پتہ ملنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مصر میں ہزار ہا برس پہلے کے عجیب مینار موجود ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ آدمی کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان میں کتبے لگے ہیں مگر پتہ نہیں چلتا کس نے بنائے کب بنائے۔ کس غرض سے بنائے۔ کتبے پڑھے نہیں جاتے۔ وہ خط معدوم ہو گئے۔ ان کے لکھنے والے معدوم ہو گئے۔ پڑھنے سمجھنے والے معدوم ہو گئے۔ اور ایسی کتنی چیزیں دنیا میں ہیں۔ جب ایسی ایسی مستحکم یادگاروں کا یہ حال ہے تو آدمی کیا جان سکتا ہے اور کیوں کر جان سکتا ہے اُن وقتوں کی باتیں جو اس کی ہستی سے پہلے کی ہیں؟ کیفیت تو یہ ہے اور رائے زنی کی جاتی ہے اس میں کہ آسمان اور زمین کب بنے اور کیوں کر بنے۔ اس کو جنون نہ کہیں تو کیا کہیں؟ افراط عقل بھی کیا بری چیز ہے انسان کو

---

[1] ہم نے آسمان کو بنایا چھت بے جوکھوں اور لوگ ہماری قدرت کی نشانیوں سے جو اس میں ہیں بے پروا ہیں۔

کیسے کیسے کوئے جھکاتی ہو! زمین آسمان کے پیدا ہونے کی سب سے پہلی تحریری یادداشت دنیا میں
توراۃ ہو کہ اس کے پہلے باب میں اسی قسم کا بیان ہو۔ یا اب لوگوں نے عقلی تکے چلانے شروع کیے
ہیں ان ھما لا یخرصون۔ اُنھوں نے دیکھے دنیا میں اس طرح کے تغیرات کہ جہاں پہاڑ ہیں وہاں کسی
زمانے میں سمندر بہتا ہوگا۔ کیوں کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر مچھلیوں کی ہڈیاں پائی گئیں اور معلوم ہو
کہ مارے سردی کے کوئی جان دار وہاں جا نہیں سکتا۔ علاوہ بریں ہڈیاں نکلیں پتھروں کی تہوں میں دبی ہوئی
پھر دیکھا کہ صحرائے افریقہ کے ریگستان کو کھودا جاتا ہو تو بہت نیچے جا کر ایسے درخت دبے ہوئے نکلے سوائے
سمندر کے دوسری جگہ پیدا ہو نہیں سکتے، ان کو چاہیے شور پانی۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہاں پہلے سمندر ہوگا۔
پھر اُنھوں نے دیکھا کہ ہوا کے جھکولوں سے سمندر میں جھاگ اُٹھتے ہیں اور جھاگ سورج کی گرمی پاکر کائی
بن جاتے ہیں۔ کائی کی مٹی، مٹی کے کنکر، کنکر کے پتھر۔ مگر یہ تغیرات کتنے ہزاروں برس میں جا کر واقع
ہوتے ہیں۔ تو اُنھوں نے قیاس دوڑایا کہ ہو نہ ہو دنیا اسی قاعدے سے بنی ہوگی۔ ذرا "ہوگی" کو دھیان
میں رکھنا۔ اب اُنھوں نے فرض کر لیا کہ زمین آسمان سے پہلے خلا تھی اور خلا میں ایک قسم کے نہایت چھوٹے
چھوٹے ذرّے تھے جیسے کواڑوں کی درز میں آفتاب کی شعاع سے نظر آیا کرتے ہیں۔ ان ہی ذرّوں میں
تغیر و انقلاب ہو ہو اکر دنیا بن گئی۔ بس اب کیا تھا۔ ابتدائے آفرینش کا معما ایسا عمدہ طور پر حل ہوگیا
کہ گویا آسمان اور زمین ان کے سامنے کے گو دکھلائے بنے ہیں۔ اب اس خیال کا مقابلہ ہو توراۃ کی کتاب
آفرینش سے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کے بننے میں کچھ نہ لگے ہوں گے تو لاکھوں کروڑوں برس اور توراۃ بتاتی ہو
چھ دن، صرف چھ دن۔ اگر کوئی شخص دہریہ ہو اور خدا کو نہ مانتا ہو اور وہ ایسا خیال کرے تو عجب نہیں کہ دنیا
اسی طرح قدیم سے چلی آئی ہو اور آپ سے آپ بن گئی ہو لیکن بیچارے نیچریوں کی مشکل ہو کہ ایک طرف تو
قرآن ہی توراۃ کا ہم زبان اُس کا مصدق اور دوسری طرف زمانۂ حال کے محقق فلاسفہ کی رائے
نہ قرآن ہی کو غلط کہتے بن پڑتی ہو اور نہ فلسفیوں ہی کو جھٹلایا جا سکتا ہو اور یہ بھی نہیں دیکھا جاتا

کہ دنیا کا اتنا بڑا کارخانہ موجود ہو جائے اور خدا الگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تماشا دیکھے۔ آخر انھوں نے آب و آتش کے یکجا کرنے کی یہ تدبیر نکالی۔ اور اس کے سوائے نکالتے بھی کیا کہ وہ چھوٹے چھوٹے ذرّے خدا نے پیدا کئے اور ان ذرّوں کا اجتماع اس طرح پر کہ ایک اجتماع سے مچھر بنا اور دوسرے سے ہاتھی۔ ایک سے آفتاب دوسرے سے ہوا۔ ایک سے زمین دوسرے سے پانی۔ یہ سب خدا کے حکم سے ہوا مگر ہوا دہی لاکھوں کروڑوں برس میں جیسا کہ فلاسفہ نے سمجھا رہا قرآن، وہ تو کچھ بات نہیں زمین اور آسمان کی پیدائش کے بارے میں یہودیوں کا ایسا ہی خیال تھا کہ خدا نے ان کو چھ دن میں بنایا ہے سو قرآن میں خدا کا یہ مقصود نہیں کہ ہم نے زمین اور آسمان کو چھ دن میں بنایا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان جس کا چھ دن میں بن جانا تم کہتے ہو اس کے بنانے والے ہم (خدا) ہیں۔ توراۃ جس میں پیدائش کا خاص پہلا باب قائم ہے ہم مسلمان اس کے ذمہ دار نہیں کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ وحی آسمانی ہے یا یہودیوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ تاویل کی تو سہی مگر جس کی نظر قرآن پر ہے وہ کبھی اس بات کو تسلیم کر نہیں سکتا کہ قرآن میں چھ دن کی تعیین پر زور نہیں دیا گیا۔ بے شک کچھ آیتیں ایسی بھی ہیں جن کا مخاطب بہ تکلف یہود کو بنایا جا سکتا ہے۔ مگر ایسی بھی آیتیں ہیں جن کا سیاق و سباق پکار رہا ہے کہ چھ دن پر زور ہے اور مخاطب بلا تخصیص یہود کل افراد بشر ہیں جیسے سورۂ ق میں ولقد خلقنا السموات والارض وما بینھما فی ستۃ ایام وما مسنا من لغوب۔ وما مسنا من لغوب کا اس کے سوائے اور کیا محل ہو سکتا ہے کہ قائل کا مطلب چھ دن پر زور دینا ہے۔ غرض اپنی اپنی سمجھ ہی تو ہے۔ ہم کو تو اس تاویل کے تسلیم کرنے سے دنیا کا چھ دن میں پیدا ہونا مان لینا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے اور پھر جب خدا نے چھوٹے چھوٹے ذرّوں کو بنایا، اس کے حکم سے ان کے اجتماعات ہوئے۔ اتنا مان لینے سے کیا قباحت لازم آجائے گی کہ موجودہ اجتماعات چھ ہی دن میں ہوئے اور آگے کو یہ قاعدہ ٹھیرا کہ

---

[1] اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو چیزیں آسمان و زمین میں ہیں ان کو (سب کو) چھے دن میں بنا کھڑا کیا اور تکان نے ہم کو چھوا (تک بھی تو) نہیں۔

ہوں تو ہزاروں لاکھوں برس میں ہوں ؟ اس سے خدا کی بڑی عظمت اور اس کی بے انتہا قدرت ظاہر ہوتی ہے کہ جو کام ہزاروں لاکھوں برس میں ہونے کے تھے اُس نے بے تکان چھ دن کے تھوڑے عرصے میں کر دکھائے۔ آدمی جواب ایک طور پر پیدا ہوتا ہے ضرور ہے کہ سب سے پہلا آدمی اور طور سے بنا ہو تو اب ایک طور پر دنیا کا چلنا اس کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ یہی طور سدا سے چلا آیا ہے۔

اب تو تم نے نیچریوں کے اصول کو سمجھ لیا ہوگا۔ ان کا اصل مقصد ہے قرآن اور زمانۂ حال کے فلسفہ کو ایک ذات کر دینا کہ دونوں میں کسی طرح کا تناقض و اختلاف باقی نہ رہے نیت اچھی ہے اور بہت اچھی ہے ارادہ نیک ہے بہت نیک ہے۔ مگر یہی کام بھی مشکل ہے۔ اور کوئی آسان سمجھتا ہو تو کر کے دکھائے بے شک نیچریوں سے غلطیاں ہوتی ہیں اور مسلمانوں کا کون سا فرقہ ہے جو ان سے بدتر غلطیاں نہیں کرتا ؟ مگر سچ پوچھو تو نیچریوں کی غلطی سے مسلمانوں کو عاجلاً نقصان نہیں پہنچتا جب کہ دوسرے فرقوں کی غلطی سے مسلمانوں کی دنیا تباہ ہو رہی ہے اور دُنیا کے ساتھ دین بھی۔

سوال۔ میں نے آپ کے عقائد کو خوب سمجھا اور اب میرے دل میں کسی طرح کا خدشہ باقی نہیں اور مجھ کو ایسی تسلی اور خوشی ہے جو ساری عمر کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ اور مجھ کو اُمید ہے کہ اگر مرتے وقت بھی میرے ایسے ہی خیالات رہے تو میں بڑے اطمینان سے مروں گا۔ اِن شاء اللہ میرا خاتمہ بخیر ہوگا اور آخر کار نجات۔
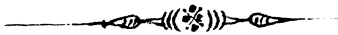
یوں صادقہ چاہتی تو وہ لکھنے میں تیز دست تھی کہ اپنے اس خواب کو بہت سے بہت ایک ہفتے میں لکھ کر صادق کے حوالے کر دیتی۔ مگر اس طرح کے لمبے لمبے خواب جن میں لفظوں اور عبارتوں کو دُہرانا پڑتا تھا ان کے بیان کرنے میں اُس کے دماغ کو ایسا سخت فشار ہوتا تھا کہ وہ گھنٹے سوا گھنٹے سے زیادہ اس تکلیف کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

اُس کو یاتو ایک بار اپنے ماموں کے امتحان کے سوالات بتانے میں ایسی زحمت پیش آئی تھی مگر وہ بھی تھوڑی دیر کا کام تھا یا اب یہ ایک سالے کا رسالہ اس کو لکھنا پڑا۔ وہ تو صادق ہی سری کا تھا جس کی خاطر اُس نے یہ محنت گوارا کی۔ اُدھر اُس کو نا دلی اِدھر اس کو جلدی۔ اس پر بھی صادقہ کا ایک چلّہ خرچ ہوا۔ تب کہیں جا کر پورا خواب قلمبند ہوا۔ اکثر تو ایسا ہی ہوتا تھا کہ صادقہ لکھتی جاتی تھی اور صادق جھکا ہوا دیکھ رہا ہو اور کبھی کبھی صادقہ کہہ بھی بیٹھتی تھی کہ تمہارے جھکنے سے مجھ پر بڑا بوجھ پڑتا ہی تو صادق ذرا کی ذرا پرے ہٹ جاتا۔ پھر سرکتے سرکتے پاس آ کر دیکھنے لگتا۔ غرض اِدھر صادقہ کے قلم سے نکلا اور اُدھر صادق نے پڑھا۔ پھر ایک دفعہ کے پڑھنے سے اُس کو کیا سیری ہوتی۔ وہ بار بار پڑھتا اور سوچتا رہتا۔ خواب ختم ہونے کو آیا تو صادقہ کو اپنے خاص طرح کے حافظہ کی وجہ سے یاد تھا اور صادق کو بار بار پڑھنے سے۔

صادق کا دیوان خانہ تو ایک مدت سے مذہبی اکھاڑہ ہو رہا تھا اور ایسا کونسا دن تھا کہ دو ایک سے اس کی جھڑپ نہ ہوتی ہو۔ شروع شروع میں تو ہوتا تھا مناظرہ اور آخر آخر میں ہو جاتی تھی عداوت۔ کتنے آئے اور روٹھ روٹھ کر گھر بیٹھ رہے اور پھر کہیں رستے میں مٹھ بھیڑ ہو بھی گئی تو ایک نے اِدھر کو منہ پھیر لیا دوسرا کترا کر نکل گیا۔ خواب کا مناظرہ بالکل اور ہی ڈھب کا تھا۔ اُس میں نہ لفظوں پر بحث تھی نہ دوسرے کو چھیڑنے اور چڑانے سے مطلب۔ نہ خواہ مخواہ کی ضد نہ سخن پروری۔ بلکہ جس طرح بیمار طبیب سے اپنا حال بیان کرتا یا دوست دوست کو صلاح بتاتا اسی طرح نرمی سے آہستگی سے بات چیت ہو رہی تھی جیسے بھلے آدمی آپس میں ہنسا بولا کرتے ہیں۔ ابتدا ہی سے صادق کی طبیعت گداز ہونے لگی۔ یہ کسی کسی وقت بونگی بے تکی بھی کہہ بیٹھتا تھا مگر اُدھر سے جب جواب ملا ایسا معقول کہ اس کو الٹ کر کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ پس حقیقت میں اُس کو مناظرہ کہنا ہی ٹھیک نہیں۔ وہ خاصہ سبق تھا کہ صادق پڑھتا تھا اور وہ مرد بزرگ پڑھاتے جاتے تھے۔ بیچ بیچ میں اس کو کہیں شبہ ہوا اُنھوں نے

تسلّی کردی۔ صادق اُن سے کیا جھگڑ سکتا تھا، اُنھوں نے جھگڑے کا دڑبا ہی پھونک دیا۔ صادقہ نے جتنا خواب پہلے دن لکھ کر دیا صادق کی آنکھیں تو اُسی سے کھل گئیں کہ ہاں مذہب کی تحقیقات اور اُس سے اطمینان حاصل کرنے کا یہ رستہ ہے۔ اس نے وہ لغو اور بیہودہ لاحاصل مباحثے جو آئے دن اس کے یہاں رہتے تھے بک قلم موقوف کر دیئے۔ بلکہ لوگوں کو تعجب بھی ہوا۔ کوئی کہتا تھا جواب سے عاجز آ گئے۔ کوئی سمجھتا تھا ان مدرسے والوں کی جمع پونجی ہی کیا خاص کر علی گڑھ کالج کے لڑکوں کی اور وہ بھی دینیات میں یہ بیچارے گنتی اور پہاڑوں کے سوائے کیا جانیں سُنی سنائی چند باتیں معلوم تھیں، ہو چکیں۔ اب کہیں تو کیا کہیں؟ ایک شخص جو صادق کے خانگی حالات سے بھی کسی قدر واقف تھا خدا جانے اس کو کیوں کر معلوم ہو گیا کہ میاں بی بی دونوں کوئی مذہبی کتاب لکھ رہے ہیں۔ اس کے ذریعے سے سارے جلسے میں اس بات کا چرچا سا ہو گیا۔ تو لوگوں نے تقاضا شروع کیا کہ صاحب کچھ لکھ رہے ہو تو میدان میں لاؤ۔ یہ کیا کہ بی بی نے لکھا میاں نے داد دی، میاں نے کہا بی بی نے تسلیم کر لیا۔ ان لوگوں میں ایک صاحب تو وہ تھے جنھوں نے مقلّدوں غیر مقلّدوں کی لڑائی میں یہ تجویز نکالی تھی کہ مسجدیں تقسیم ہو جائیں، مقلّدوں کی الگ غیر مقلّدوں کی الگ۔ ہر مسجد کے دروازے پر ٹکٹ لگا دیا جائے تاکہ کوئی ان جان دوسرے فریق کی مسجد میں نہ گھس جائے۔ ایک حضرت وہ تھے جنھوں نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ غیر مقلد امام کے پیچھے مقلد مقتدیوں کی نماز نہیں ہوتی کیوں کہ امام کی اطاعت مقتدیوں پر لازم ہے۔ مقتدی تو سجدے سے اُٹھ سیدھے کھڑے ہو گئے اور امام جلسۂ استراحت میں ہے تو اطاعت کہاں رہی۔ ایک اس درجے کے محتاط تھے جنھوں نے برسوں سے بی بی کو اس قصور پر اُس کے میکے میں بٹھا رکھا تھا کہ وہ لوگ پھول والوں کی سیر میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک تھے جو فتحپوری کے عین دروازے کے سامنے پادریوں کے مقابلے میں اب سڑک وعظ فرماتے۔ مسجد میں نماز مغرب ہو رہی ہے اور ان کا وعظ جاری ہے۔ کوئی جانا چاہتا تو اُس کو روکتے کہ جماعت پر وعظ کو فضیلت ہے۔ ایک تھے تو شہر کے باہر پہاڑ گنج اور بالالتزام مغرب

اور فجر کی نماز کھجور والی مسجد میں پڑھتے کہ ہندوؤں کا محلہ ہے، نماز میں کسی کے بولنے کی آواز بھی کان میں پڑ جائے تو ثواب جہاد ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ایک نے اپنی زندگی اسی میں وقف کر رکھی تھی کہ کچھ دلّی پر موقوف نہیں کہیں بھی مذہبی ٹکر اُٹھ پائیں عدالت میں پیروی کرنے کو جا موجود ہوں۔ ایک اس تدبیر میں لگے رہتے تھے کہ کوئی مندر نہ بچنے پائے جس کی بغل میں مسجد نہ ہو۔ ایک ستّو باندھ کر نیچریوں کے پیچھے پڑے تھے آپ تو کچھ لیاقت رکھتے نہ تھے مگر جو کچھ نیچریوں کی شان میں نثر یا نظم کسی اخبار یا رسالے میں دیکھ یا سُن پایا اُس کو چھوڑا نہیں۔ چنانچہ ان کے پاس ردِّ نیچری کا خاصہ ایک کتاب خانہ جمع ہو گیا تھا اور اس پر ان کو بڑا فخر تھا اور فخر کی بات ہی ہے۔ غرض سب کی غرض مشترک یہ تھی کہ نہ آپ چین سے رہیئے اور نہ دوسروں کو چین سے رہنے دیجئے۔

یہ لوگ تقاضا نہ بھی کرتے تاہم صادق سے خواب کا ضبط ہونا مشکل تھا۔ لوگوں کے تقاضے نے تو خواب کا پورا لکھا جانا بھی دشوار کر دیا۔ شاید ابھی آدھا بھی نہ لکھا جا چکا ہوگا کہ صادق نے جلسے میں سنانا شروع کر دیا۔ اگرچہ ایک ایک ایسے جھگڑالو تھے کہ کسی طرح مانتے ہی نہ تھے مگر ہم کو تو صداقت اور خلوص کی تاثیر کا اُسی دن سے یقین آیا کہ صادق پڑھتا جاتا تھا اور یہ سب کے سب دم بخود بیٹھے سنتے تھے۔ کسی نے کان تک بھی تو نہیں ہلایا۔ ان کی عمروں میں یہ پہلی ہی دفعہ تھی کہ ان کو اس طرح کی دین داری اور نصیحت کی باتوں کے سُننے کا اتفاق ہوا۔ اب لوگوں کو خیال آیا کہ اصل میں دین داری ہے کیا چیز، ہم کو کرنا چاہیئے کیا اور ہم کر رہے ہیں کیا۔ اس سے پہلے یہ لوگ مُسلمان تھے اس لئے کہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے تھے مسلمان کہلاتے تھے۔ اب نئے سر سے مسلمان ہوئے اس لئے کہ اسلام کی حقیقت کو سمجھا، اُس کی غرض و غایت کو سمجھا، اُس کی صداقت کو سمجھا۔ کوئی ایسا ہی سنگدل ہوگا جو خواب کو سُن کر رو نہ دیا ہو۔ ایک دفعہ تو سب کے دل بیٹھ سے گئے۔ پھر جو ایمان سے تسلّی ہوئی تو سب نے اپنی اپنی اصلاح پر کمر ہمت چست کر لی۔ یا تو جس وقت مباحثہ ہوتا تھا سارے محلے کو سر پر اُٹھا لیتے تھے یا اب غل غپاڑے کی جگہ ہوا

سکون اور سکوت تو اہل محلہ کو امن ملا۔ اور خواب کی برکتوں کی بسم اللہ ہوئی۔ وہ صاحب جنھوں نے
مسجدوں کی تقسیم تجویز کی تھی اور اپنے محلے کی مسجد کے دروازے پر لکھوا بھی دیا تھا کہ غیر مقلد آنے پائے
سب سے پہلے تو انھوں ہی نے اُس تحریر کو چھیلا اور کھرچا۔ اور جن کو غیر مقلد امام کے اقتدا سے انکار تھا
وہ شیخ المحدثین کی مسجد میں جاکر پانچوں وقت جماعت سے نماز پڑھنے لگے۔ اور جنھوں نے بی بی کو بٹھار کھا تھا
ڈولی لے جاکر گھر والی کو سوار کرا لائے۔ واعظ صاحب نے وعظ تو بند نہیں کیا مگر کوئی نماز کے لیے
جانا چاہے تو اُس کو روکتے ٹوکتے بھی نہیں۔ پہاڑ گنج کی پہلوان مدتوں سے دکھائی نہیں دیتے۔
نماز تو کیا چھوڑی ہوگی ہو نہ ہو اپنے محلے کی مسجد کا حق نکنے لگے۔ مقدمہ باز صاحب وعدہ کرتے ہیں
کہ جو مقدمات دائر ہیں اُن سے دست بردار ہونا تو بڑی سُبکی کی بات ہے مگر آئندہ کوئی نیا مقدمہ نہیں لوں گا۔
جو اس کے درپے تھے کہ ہر مندر کے پہلو میں مسجد ہو اب کہنے لگے ہیں کہ مندروں کو ڈھا یا جا کر روک
ہم نہیں سکتے خواہ مخواہ اِن کی بغل میں گھس کر اپنی عبادت میں بھی کیوں خلل ڈالا۔ روئیں چیری کی کتاب خانہ ہی
تو بدستور مگر نئے اخباروں اور رسالوں کا آنا بند اور نئے لوگوں کا اگلا سا جمگھٹا۔ اور جب لوگوں نے
سمجھ لیا کہ اُن کا ضروری اور مقدم فرض کیا ہے تو اُن کو ایسی پڑی پڑی تھی کہ دوسروں کے
حالات سے تعرض کرتے پھریں۔

یوں امن اور صلح کاری نے رفتہ رفتہ ایک سے دوسرے میں اور دوسرے سے تیسرے میں
اپنی تاثیر نیک کرنی شروع کر دی۔ لیکن ابھی دن ہی کے ہوئے ہیں۔ تاہم جن تیوہاروں اور
تقریبوں میں ادبدا کر فساد ہوتے تھے ایسے چُپ چپاتے گزر جاتے ہیں۔ کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی
اور خدا کو منظور ہے تو وہ دن بھی آیا سمجھو کہ ان تمام مذہبی مخالفتوں کا ایک فسانہ رہ جائے گا
اور آنے والی نسلیں اُن باتوں کو سُن سُن کر ہنسا کریں گی۔ کہ ہمارے بزرگ بھی کس قماش کے
لوگ تھے جو اختلاف رائے پر لڑتے تھے۔ مذہب ہدا ہے اور ہمیشہ سدا کو رہے گا اور اختلاف بھی

سدا سے ہی اور سدا کو رہے گا۔ مگر مذہب میں جو ایک طرح کی کڑواہٹ ہی، دیر ہو تو ہو یہی تعلیم اور آزادی آخر کار اس کو کھو کر رہے گی۔ لوگوں کے عقیدے جدا جدا ہوں گے مگر ایک جگہ کھائیں گے ایک جگہ پئیں گے، ایک جگہ اُٹھیں بیٹھیں گے، ایک جگہ رہیں سہیں گے، ایک طرح کا لباس ہوگا، ایک طرح کا مذاق، آپس میں دوستی اور اتحاد رکھیں گے۔ اُس وقت جاننا کہ آفتابِ اسلام طلوع کرنے کو ہی اور ابھی تو آدھی رات ہی یا شاید کچھ ڈھلی ہو تو ڈھلی ہو۔ وہ جو کہتے ہیں اوچھے نے کٹورا پایا پانی پی پی پیٹ پھلایا۔ صادق کا تو کچھ اس طرح کا سا حال ہوگیا تھا وہ اس کو خواب تھوڑا ہی سمجھتا تھا، بلکہ وحی یا الہام۔ وہ سارے سارے دن خواب پڑھ پڑھ کر لوگوں کو سُناتا اور ذرا نہ اُکتاتا۔ جو شخص غیروں کے سر ہو ہو کر سُنائے وہ اپنے کالج کے دوستوں کو کیوں بھولنے لگا تھا۔ اُس نے خواب کی ایک بڑی عمدہ خوش خط نقل طیار کی اور اُسی خاص کمیٹی میں جس کا یہ سکرٹری تھا اور جس کا مذکور شروع کتاب میں آچکا ہی اُس کو اس تمہید سے پیش کیا۔

دوستو، عزیزو ارشدکم اللہ تعالیٰ۔ آپ صاحبوں نے شروع سے اس کمیٹی، اس معزز کمیٹی کے سکرٹری ہونے کی عزت مجھ کو دے رکھی ہی جس کی میں بے انتہا قدر کرتا ہوں اور میں نے اگر سکرٹری ہونے کے فرض کو جیسا چاہیئے ادا نہیں کیا (سب طرف سے آواز آئی۔ نہیں یہ نہیں) تو اس کی اور جو کچھ وجہ ہو مگر میں آپ سب صاحبوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہی کہ مجھ کو اس کمیٹی کے اغراض سے پوری دلچسپی نہیں یا میری توجہ اس کمیٹی کی طرف سے کچھ کم ہوگئی ہی۔ آپ اس بات کو باور کیجیئے گا کہ جس شوق سے میں نے اس کمیٹی کے منعقد ہونے کی تحریک کی تھی وہ شوق اگر زیادہ نہیں ہوا تو گھٹا بھی نہیں (بے شک بے شک) میں نے شروع شروع میں نکاح کے خلاف اپنی رائے کے ظاہر کرنے پر جرأت کی تھی۔ لیکن میں کُھلے دل سے اقرار کرتا ہوں کہ جن صاحبوں نے میری اس رائے سے مخالفت کی اُن کی دلائل نہایت قوی تھیں۔ اور میں نے

اُن دلائل کے سُننے کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی اُس رائے کو اپنے سر میں نہیں رہنے دیا۔ میری نظر میں
صرف رائے کی کچھ بھی وقعت نہیں جب تک کہ صاحب رائے خود اُس پر عمل نہ کرکے دوسروں کے لئے
نظیر نہ بنے۔ کیا آپ نے وہ اعتراضات نہیں سُنے ہوں گے؟ ضرور سُنے ہوں گے جو ایک بڑے
ہندو ریفارمر پر چاروں طرف سے کیئے جا رہے تھے کہ وہ چھوٹی عمر کی شادی کے سخت مخالف تھے
اور باوجود مخالف تھے، مگر انھوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو جس کو بڑی عمدگی اور احتیاط کے ساتھ
تعلیم دی جا رہی تھی بالکل چھوٹی سی عمر میں بیاہ دیا اور وہ بیاہ اُس کی تعلیم کی گاڑی میں
ایک روڑا تھا جس کو وہ ہٹا نہ سکے۔ مجھ کو اس کا تو خیال بھی نہیں آیا کہ اگر شادی نہ کروں گا
تو لوگ مجھ پر معترض ہوں گے کیوں کہ میری معرفت کا دائرہ بہت ہی محدود ہے۔ نہ تو مجھ میں ریفارمر بننے کی
صلاحیت ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اُس نے مجھ کو شہرت کی آفتوں سے بھی بچا یا ہے تو اگر مجھ پر اعتراض
کرتے بھی تو شاید اتنے کہ اُن کو میں ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتا۔ لیکن میں نے دنیا کے حال پر
نظر کی اور دیکھا کہ خدا کی یہی مرضی ہے کہ ایک وقت پر دنیا چھے تو اس سے اعراض کرنا قانونِ فطرت کو
توڑنا ہے۔ اور تمام قوانین میں قانونِ فطرت ہی ایسا زبردست قانون ہے جس کا توڑنے والا سزا سے
محفوظ رہ نہیں سکتا۔ اور اسی واسطے اُس قانون کے سب سے بڑھ کر جاننے اور سمجھنے والے نے یعنی
ہمارے پیغمبر صاحب صلوات اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین نے فرمایا النکاح سنتی فمن رغب عن
سنتی فلیس منی۔ میں نے نہ صرف نکاح کی ضرورت کو سمجھا بلکہ اُس ذمہ داریوں کو بھی۔ اور جب میں نے
نکاح کا قصد کیا ہے تو آپ کی اسی کمیٹی کے طفیل سے اس تعلق کے اطراف وجوانب اور نتائج اور
عواقب سے اس قدر واقف ہو چکا تھا کہ اتنی واقفیت کے بدون نکاح کا قصد کرنا میرے
نزدیک داخلِ حمق ہے۔ میں نے عموماً انسان کی اور خصوصاً اپنی رغبتوں کو جانچا اور اُن انقلابات کو
بھی پیشِ نظر رکھا جو یقیناً یا غالباً میری حالت میں واقع ہونے والے ہیں۔ مثلاً میں یقیناً جانتا ہوں

کہ اگر آفاتِ ناگہانی سے محفوظ رہا تو میری توانائی ایک حد پر پہنچ کر ٹھیرے گی اور پھر گھٹنی شروع ہوگی
میں نے اس غرض سے انگریزی پڑھی ہی کہ مجھ کو آسودگی ہو اور میں اس کالج کا خدا اس کو ابدالآباد تک
قائم رکھے نہایت ممنون اور شکر گزار ہوں کہ میں معاش کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں۔ اول تو
آپ صاحبوں کو معلوم ہی کہ کتنی دفعہ مجھ کو معقول نوکریاں ملتی رہیں اور میں نے اُن کو قبول نہیں کیا۔
میں معاش سے آزادی کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں اسی لیے میں نے قانون اور انجنیری دو چیزیں
اختیار کی ہیں جن کے ذریعے سے میں اُمید کرتا ہوں کہ نوکری پیشہ لوگوں سے زیادہ خوش حال ہوں گا۔
ایک چیز اور بھی ہی زبان انگریزی۔ سو میں اپنے مضامین پایونیر اور انگلشمین اور مدراس میل اور
بمبئی ٹائمز۔ یعنی ہندوستان کے تمام نامی انگریزی اخباروں میں بھیج کر دیکھ چکا ہوں، سب نے
میری تحریر کو پسند کیا ہی۔ جو شخص اتنے وسائل رکھتا ہو اُس کو معاش کی طرف سے بےاطمینانی
کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ میری خاص حالت ایسی تھی کہ بزرگوں کا پس خوردہ بھی میرے لیے کافی ہوتا۔
مگر وہ روح جو اس کالج کی تعلیم نے میرے دل میں پھونکی ہی کسی طرح جائز نہیں رکھتی کہ میں دوسروں کا
بارِ خاطر ہو کر رہوں۔ خدا کا شکر ہی کہ میں اندھا لنگڑا لولا اپاہج نہیں ہوں۔ اور جن چیزوں سے
لوگوں نے عزتیں پیدا کیں، دولتیں کمائیں، وہ سب سامان میرے لیے بھی مہیا ہی اگر میں
اُس سے کام لینا چاہوں، اور میں نے لیا ہی، اور لوں گا۔ سخت دون ہمتی کی بات ہوگی
کہ میں دوسروں کا سہارا ایکڑوں سے

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است　　رفتن بپائے مردیِ ہمسایہ در بہشت

اسی خیال سے میں نے نحن رجال وھم رجال کو اپنا شعار قرار دے کر اس کی مُہر کندہ کرا رکھی ہی جس کو
آپ صاحبوں نے کبھی کبھی میرے خطوط اور لفافوں پر ثبت کیا ہوا دیکھا ہوگا۔ بہر کیف نکاح سے
پہلے میں نے چہاں اور بیش بینیاں کیں اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ مجھ کو زیادہ خرچ درکار ہوگا تو میں نے

دیکھا کہ میں اس کے لیے پورا پورا طیار رہوں۔ جس بات میں مجھ کو زیادہ غور کرنا پڑا وہ یہ تھی کہ میں نے اُن ذمہ داریوں پر نظر کی جو مجھ پر عائد ہوں گی اس لیے میں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی خانہ داریوں کی طرف توجہ کی تو اُن کو ناگفتہ بہ حالت میں پایا کہ مردوں نے عورتوں کے حقوق پامال کر دیئے ہیں اور یوں کوئی عورت شوہر پر غالب آگئی ہو تو وہ اتفاقی صورت ہے، عام دستور کے مطابق عورت مرد کے مقابلے میں ہوں بھی تو نہیں کر سکتی۔ حال آں کہ اسلام نے مرد اور عورت دونوں کے حقوق کو ایسی عمدگی کے ساتھ مقرر کر دیا تھا کہ اگر اُس قاعدے پر عمل ہوا ہوتا تو ہماری قوم کی ہرگز یہ ردی حالت نہ ہوتی۔ وہ قاعدہ کیا تھا ولھن[1] مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجہ۔ ذرا لفظ درجۃ کے اطلاق پر نظر کرو کہ وہ مردوں کی مطلق فضیلت ظاہر کرتا ہے اور بس۔ میں نے خیال کیا تو وہ فضیلت اسی کی ہے کہ مرد کماتا اور رب البیت کہلاتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھو تو ایک طرح پر اسی حیثیت میں وہ اہل و عیال کا خادم ہے۔ عجیب انتظام ہے کہ دُنیا میں ہر ایک شخص محتاج اور محتاج الیہ، اور خادم و مخدوم دونوں ہے۔ پس مرد اور عورت میں فرق ہے تو دائیں بائیں آنکھ یا دائیں بائیں ہاتھ کا سا۔ لیکن ہمارے طرز تمدن نے اِس فرق کو حد سے زیادہ بڑھا رکھا ہے اور جو مسافت مرد اور عورت دونوں کی حالتوں میں واقع ہے اُس کے کم کرنے کو بڑی مدتیں چاہئیں۔ وہ بھی اِس صورت میں کہ ابھی سے عورتوں کی اصلاح حالت کی تدبیر کی جائے سو اس کا تو ابھی ہم لوگوں میں مذکور بھی نہیں۔ رب البیت ہونے کے اعتبار سے مرد کا نہ صرف یہ فرض ہے کہ وہ اہل و عیال کے لیے معاش پیدا کرے کہ یہ تو ہر کس و ناکس کرتا ہے اور نابہ تقاضائے طبیعت بھی ہے بلکہ ایک مہذب خانہ دار کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ بی بی کے ساتھ محبت

---

[1] اور جیسے (مردوں کا حق) عورتوں پر ویسے ہی دستور کے مطابق عورتوں کا (حق مردوں پر) ہاں مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے۔

اور خاطر داری اور دل جوئی سے پیش آئے ہمیشہ اُس کی ہمدردی کرتا رہے اور جیسا اس کو اپنی امانت دار سمجھتا ہے آپ بھی اُس کی امانت میں خیانت نہ کرے۔ یہی وہ فرائض ہیں جن کی تعمیل میں اکثر کوتاہی ہوتی اور یہی کوتاہی اکثر خانہ داریوں کو بدمزہ رکھتی ہے۔ مجھ کو اچھی طرح یقین ہو گیا تھا کہ خانہ داری سے بہتر کوئی چیز انسان کو ادب نہیں سکھا سکتی۔ خانہ داری اس کے حق میں جنتری کا کام دیتی ہے کہ اس کے سارے بل نکل جاتے ہیں۔ پہلے شوہر اور پھر باپ بننا ایسے بوجھ نہیں ہیں کہ اُن کے تلے آکر آدمی اُچھل کود کر سکے بشرطیکہ آدمی آدمی ہو۔ اور اگر ظاہر کا آدمی اور باطن کا جانور ہے تو اس سے کچھ بحث نہیں۔ میں نے تو اپنے اصول یہ ٹھیرا رکھے ہیں کہ کوئی شخص کتنے ہی سرٹیفکٹ دکھائے مجھ کو اُس کی نیک چلنی کی طرف سے ایسا اطمینان نہیں ہوتا جیسا صرف ایک اتنی سی بات سے کہ وہ خانہ دار ہے۔ کاہلی کے دور کرنے کو خانہ داری جیسا کوئی کاری تازیانہ نہیں۔ وہ حکایت آپ نے نہیں سُنی کہ ایک شخص نے پیغمبر صاحب سے تنگ دستی کی شکایت کی اور وہ تھا مجرد نہ آگے اگاڑی نہ پیچھے پچھاڑی۔ فرمایا نکاح کر دیکھ، اور تنگ دستی زیادہ ہوئی پھر شکایت کی اور پھر ارشاد ہوا اور نکاح کرو۔ آخر خدا نے کشائش دی۔ بات کیا تھی کہ وہ شخص بے فکری کی وجہ سے کاہل ہو گیا تھا۔ وہ بھڑ یں لپٹ پڑیں تو لگا ناچنا پھرنے۔ پھر تو وہ شخص جس کو بیٹھ کر اُٹھنا مشکل تھا دل سے محنت کرنے پر آمادہ ہوا اور خدا نے اُس کو ایسی توانائی دی کہ مگدر کی جوڑی کے بغلی اور رومالی ہاتھ خاصی طرح صفائی سے ہلانے لگا۔ غرض میں نے دوسروں کی طرح بے سوچے سمجھے ادائے رسم کے طور پر اس تعلق کا ارادہ نہیں کیا اور نہ کوئی خواہش نفسانی اس کی متقاضی ہوئی کہ جلدی کرتا۔ مجھ کو اس تعلق کے لئے انتخاب کے کرنے میں بڑی مشکلیں پیش آئیں میں نے اپنی آزادی کو اس معاملے میں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یہ میرے اختیار کی بات تھی اور میرے ہی اختیار سے ہونی بھی چاہیئے تھی۔ لیکن رسم و رواج نے اس اختیار کو حقدار سے چھین کر

دوسروں کو دے رکھا ہو۔ ایسی کارروائی کے نتیجے کبھی قباحت سے خالی ہو نہیں سکتے کہ ذمہ داری کسی کی اور اختیار کسی کا۔ چنانچہ میں نے اپنے اختیار کو آپ نافذ کرنا چاہا، گو اُن لوگوں نے جو اُس پر غصباً قبضہ کیئے ہوئے تھے بُرا بھی مانا ہو۔ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہو اور اسی کا تجربہ مجھ کو پہلے پہل اسی معاملے میں ہوا۔ میرا ہی دل جانتا ہو کہ میں نے کس مشکل سے اپنے اختیار کو سنبھالا۔ بے شک مجھ کو کئی طرح کی تکلیفیں پہنچیں اور سب میں زیادہ ایذادہ تھی ناحق کی بدگمانی۔ مگر جیسی بدگمانی کی تکلیف تھی ویسی ہی اس بات کی خوشی بھی تھی کہ میں دوسروں کے لیئے ایک نمونہ قائم کرتا ہوں اس اصلاح کا جس کی ہماری سوسائٹی کو سخت ضرورت ہو۔ اگرچہ امید نہیں کہ میرا بے وقعت اور بے حقیقت نمونہ کوئی بڑی تحریک پیدا کرے گا، مگر تمام اصلاحوں کا یہی حال ہو کہ شروع میں ضعیف ہوتی اور بتدریج قوت پکڑتی جاتی ہیں۔ دوسری مشکل اور میں کہوں گا کہ سخت تر مشکل انتخاب کی تھی۔ ہمارا طرزِ تمدن ہم کو انتخاب کی اجازت دے نہیں سکتا۔ اس کو چاہیئے معاشرت اور اختلاط اور وہ ممکن نہیں۔ میں تو ایسا بے دل ہو چلا تھا کہ کئی بار میں نے آزادی سے دست برداری کرنی چاہی کہ بلا سے دوسروں پر بوجھ تو رہے گا۔ اُن کو مواقع بھی مل سکتے ہیں۔ گو میرا رجحان پورا پورا معلوم نہ ہو مگر عام طور کا رجحان تو سبھی کو معلوم ہی۔ اور جو لوگ میری طرف سے اور میرے لیئے انتخاب کرینگے وہ یقیناً میرے خیر خواہ بھی ہیں۔ قریب تھا کہ میں بھی عام دستور کی لٹک کے تلے سے ہو کر نکلوں کہ میری خوش قسمتی نے مجھ کو ایک موقع دیا اور میں اپنے اختیار اور انتخاب دونوں کو اچھی طرح سے لا سکا۔ مجھ کو ایک دوست سے ایک شریف زادی کے لیئے تفصیلی حالات سننے کا اتفاق ہوا کہ وہ معاشرت اور اختلاط کے قریب قریب تھا۔ میں ایک دومنٹل فلاسفی (فلسفۂ عقلی) کی ایک کتاب بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ دلّی کے رہنے والے ایک آشنا میرے کمرے میں تشریف لائے اور پوچھا کہ ایسی توجہ سے کیا پڑھ رہے ہو۔ میں نے کتاب کا نام بتایا۔ اُنھوں نے

پوچھا کس فن میں ہی۔ میں نے کہا فلسفۂ عقلی۔ اُنھوں نے زیادہ تصریح چاہی تو میں خواب کا بیان پڑھ رہا تھا اس میں سے اُن کو کچھ سُنایا۔ اُس پر اُنھوں نے کہا کہ ہمارے محلے میں ایک میر خسرو صاحب ہیں۔ بڑے شریف اور معاش کی طرف سے بھی آسودہ۔ اُن کی ایک لڑکی ہی۔ خدا نے اُس کا عجیب طرح کا دماغ بنایا ہی۔ کثرت سے خواب دیکھتی ہو اور اُس کا خواب کبھی غلط نہیں ہوتا اور تعبیر بھی ایسی دیتی ہی کہ اُس کے خلاف کبھی ہوا ہی نہیں۔ سارا شہر اُس کا معتقد ہی۔ میری والدہ کا تو یہ حال ہی کہ ابا جان کے یا بڑے بھائی کے یا کسی کے خط کو ایک دن کی بھی دیر ہو جاتی ہی تو میر خسرو کے گھر دوڑی جاتی ہیں اور خدا کی قدرت جب کبھی کسی بات کے پوچھنے کو گئی ہیں ہمیشہ جواب باصواب لے کر آتی ہیں۔ حسن کی، لیاقت کی، پاک دامنی کی، ہنر اور سلیقے کی، نیک بختی کی دھاک ہی۔ مگر باوجودیکہ بیس بائیس برس کی ہوگئی ہی اور دو چھوٹی بہنیں بیاہی جا کر بچوں کی مائیں ہیں۔ اس بے چاری سے کوئی بیاہ نہیں کرتا کہ اس کے سر پہ کچھ ہو حالانکہ خواب کے سوائے کچھ بھی تو نہیں ناحق کا واہمہ ہی واہمہ ہی۔ کہتے ہیں کہ وہ بڑی بزرگ عورت ہی۔ عابدہ، پرہیزگار، قرآن خواں، تہجد گزار۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس تقریب سے اس دوست نے تذکرہ کیا۔ اس میں تصنع یا مبالغے یا طرف داری کو دخل ہو نہیں سکتا۔ پس مجھ کو تو اُن کا کہنا پتھر کی لکیر ہو گئی۔ اجنبی بن کر میں نے دو چار باتیں ان سے اور بھی پوچھیں۔ اُدھر وہ اُٹھ کر گئے۔ اِدھر میں نے بسم اللہ کر کے میر خسرو صاحب کو ایک بڑا لمبا خط لکھا۔ اُس کی نقل بھی میرے پاس محفوظ ہی اور کبھی موقع ہوا تو وہ خط بھی میں آپ صاحبوں کو سناؤں گا۔ اگرچہ ہم لوگوں میں عورتوں کا تذکرہ کرنا آداب مجلس کے خلاف ہی مگر ایک تو یہ کیفیت خاص طرح کی ہی ممکن نہیں کہ نکاح پر بحث ہو اور عورتوں کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ دوسرے درحالیکہ ہم بزرگان دین حتیٰ کہ پیغمبر صاحب کی ازواج طاہرات اور صاحبزادیوں کے بے تکلف نام لیتے ہیں مضائقہ ان کے

کُل حالات بیان کرتے ہیں تو ہماری عورتیں کیا حقیقت ہیں کہ اُن کا نام لینا اُن کے حالات کا بیان کرنا موجب بے عزتی سمجھا جائے ؟ بس اسی ایک بات سے قیاس کر لینا چاہیئے کہ ہم نے اپنی عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور آیندہ کیا کرنے والے ہیں۔ یہ سچ ہی کہ اسلام نے عورتوں کو پردے کا حکم دیا ہی اور اس میں چند در چند مصلحتیں ہیں مگر ہم کو دیکھنا ہی کہ جن لوگوں کے گھر سے پردہ نکلا وہ خود کس طرح پردہ کرتے تھے۔ عورتیں لڑائیوں میں ساتھ ہوتیاں تھیں نہ اس لیئے کہ خیموں میں بیٹھی پانوں کی گلوریاں بنا بنا کر رکھیں بلکہ اس لیئے کہ سپاہیوں کی خدمت بجالائیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کریں، پانی پلائیں، رسیاں بٹیں، یا اسی قسم کے اور کام جو عورتوں کے ہوتے کے تھے۔ عورتوں کو نماز میں شریک ہونے کی اجازت تھی۔ عورتیں نامحرم مردوں سے باتیں کر سکتیاں تھیں، چنانچہ اس وقت تک وہ خطبے لکھے ہوئے موجود ہیں جو عورتوں نے مردوں کی جماعت کو مخاطب کر کے بیان کیئے۔ غرض پردہ تھا اور پردے کے ساتھ آزادی بھی تھی کہ فتنے کا بھی انسداد ہوا اور دُنیا کے کاروبار میں بھی خلل نہ پڑے۔ ہم نے پردے میں اتنا انسداد کر دیا کہ عورتوں کا نام تک زبان پر آنا موجب بے حرمتی ہی مگر یہ ادّعائی حرمت دُنیا کی فلاح دنیا کی ترقی کے ساتھ تو جمع نہیں ہو سکتی۔ خیالات تو یہ ہیں اور اس پر بڑ بڑانا ہی کہ اہلِ یورپ نے ہماری سلطنت چھین لی۔ اہلِ یورپ ہم کو پیٹ بھرا نہیں دیکھ سکتے۔ اہلِ یورپ ہماری ملکی دولت گھسیٹے لیئے چلے جاتے ہیں۔ اسلام حقیقت میں ہمارے حق میں میگنا چارٹا (فرمان آزادی) کا حکم رکھتا تھا اور کُل دُنیاوی ترقیوں کے دروازے ہمارے لیئے مفتوح تھے مگر ہم کمبختوں نے اس سے فائدہ نہ اُٹھا جانا۔ آپ اپنے اوپر قیدیں لگاتے گئے اور تھان پر بندھے بندھے

پانچوں عیب شرعی نکل آئے۔ خیر مسلمانوں کی قسمت کا رونا تو ہمارے اس کالج میں ہوتا ہی رہتا ہی۔ لوگ اس کو کہتے ہیں کالج اور میں کہتا ہوں امام باڑہ۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ عورتوں کا تذکرہ ہم لوگوں میں خلاف آداب مجلس ہو مگر میں اس جھوٹی خلاف شرع خلاف مصلحت ادعائی عزت کو مسلمانوں کی بے عزتی کا موجب سمجھتا اور بے محابا آپ سب صاحبوں کے روبرو کہتا ہوں کہ میں نے نکاح سے پہلے جو تفتیش کی اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ مجھ میں باپ بننے کی صلاحیت ہو تو فریق ثانی میں ماں بننے کی بھی صلاحیت ہی یا نہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس امر کی تحقیقات محال سے زیادہ مشکل تھی۔ مگر میں نے خیال کیا کہ جو امور جسمانی شناخت سے متعلق ہیں وہ ایک خاندان کے لوگوں میں اکثر یکساں ہوتے ہیں چنانچہ دریافت سے معلوم ہوا کہ اس خاندان کی کل عورتیں کیا ددھیال کی اور کیا ننھیال کی سب کثیر الاولاد ہیں۔

یہ باتیں میں نے اس غرض سے بیان کی ہیں کہ گو پردے نے تحقیقات کے سب رستے بند کر رکھے ہیں مگر آدمی درپے تفتیش ہو تو بہت کچھ کر سکتا ہی۔ میں نے کیا اور میں افسوس کرتا ہوں کہ دوسرے کیوں نہیں کرتے۔ اُدھر میرے خسر صاحب بھی روشن خیال آدمی ہیں۔ اُنھوں نے بھی میرے حالات کیوں نہ دریافت کیئے ہوں گے۔ بارے میری خوش نصیبیوں میں سب سے بڑی خوش نصیبی یہ بھی تھی کہ اُنھوں نے مجھ کو اپنی فرزندی میں لینا قبول کیا۔ اور میں نے اپنے تعلق کو اُس سے جو سُنا تھا اور اپنی توقع بلکہ تمنا سے بہت زیادہ پایا والحمد للہ علی ذلک۔

اس تعلق کی وجہ سے جو دلّی میں زیادہ رہنے کا اتفاق ہوا تو مجھ کو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہی کہ وہاں کے مسلمانوں کی حالت بہت ہی خراب ہی وہ مفلس اور کاہل ہیں

خود پسند اور مغرور ہیں۔ پُرانی لکیروں کے فقیر ہیں۔ ان پر ناز کرتے اور ترقی کے رستے میں نہ ایک انچ آگے کو سرکے اور نہ ایک انچ آگے کو سرکنا چاہتے ہیں۔ وہ بڑے تیرہ خیال اور متعصب ہیں۔ ان میں اصلاح پانے کی مطلق صلاحیت نہیں وہ جلی ہوئی رسیاں ہیں مگر اُن کے بل جیسے کے تیسے موجود ہیں۔ وہ قومی خیالات سے بالکل ناآشنا ہیں شروع سے آخر تک الا ماشاء اللہ۔ میں جو پہنچا تو لوگوں نے شاید دوسرے ہی دن سے از خود بلا تقریب میرے پاس آنا شروع کیا۔ اور آئے تو ایسے جمے کہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ معلوم ہوا کہ ہزاروں آدمی اسی طرح نکمّے پڑے پھرتے ہیں۔ بعض تو ایسے بیہودہ خیالات کے تھے کہ ان سے مجھ کو دلی نفرت تھی۔ اُنھوں نے دیکھا کہ میں ان کے ڈھب پر چڑھنے والا نہیں تو بے دل ہو کر بیٹھ رہے ساری بادی چھنٹ چھٹا کر آخر وہ لوگ رہے جو مولوی یا طالب علم یا پڑھے لکھے کہلاتے تھے۔ مگر پڑھنا لکھنا وہی اپنے پُرانے طور کا۔ لوگوں کی ملاقات کے حالات میں روز نامچے میں لکھتا گیا ہوں اور کبھی نہ کبھی آپ صاحبوں کو سناؤں گا بھی کیوں کہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس وقت تو مجھ کو اسی قدر کہنا ہے کہ دلّی والوں میں بلا کا مذہبی تعصب ہے۔ اور مسلمانوں ہی میں باوجودیکہ اس قدر اختلاف ہے کہ پولیس فوجداری دیوانی کوئی کچہری نہیں جس میں ان کے مقدمات دائر نہ ہوں ان کے آپس میں تو اتنا اختلاف ہو مگر میرے مسلمان نہ ہونے میں سب کو اتفاق تھا۔ میں حیران کہ الٰہی میرے مُنہ سے کفر کا کون کلمہ نکلا کہ یہ لوگ مجھ کو مسلمان نہیں سمجھتے آخر معلوم ہوا تو صرف علی گڑھ کالج کا سبب ہے۔ میرا تو جی اُلجھتا تھا مگر یہ لوگ مجھ کو بخشتے ہی نہ تھے اور میری مذہبی معلومات جو تھی سو تھی۔ میں اپنے کو سنبھالتا یا مذہب کے

گورکھ دھندے کو بیٹھا سُلجھاتا ہو تو میں بعض اوقات لاجواب ہوجاتا تھا مگر میں بھی اس خیال میں غلطاں پیچاں رہنے لگا۔ بیسیوں مذہبی رسالے دیکھ ڈالے اور شوق ہی کہ بڑھتا چلا جاتا ہی پر تسلی نہیں ہوتی۔ خیال کو دل سے دور کرنا چاہتا ہوں تو دور نہیں ہوتا اور طبیعت ہی کہ کسی طرف سے نہیں ہٹتی۔ اُقلیدس کی نئی شکلیں اور جبر و مقابلے کی مساواتیں حل کرنے میں جو اُلجھن پیدا ہوتی ہی، جس نے طالب العلمی کی ہی وہی اُس کی قدر خوب جانتا ہی۔ مگر میں آپ صاحبوں کو یقین دلاتا ہوں کہ مذہبی اُلجھن کے آگے میں ساری اُلجھنوں کو بھول گیا۔ ہر وقت کی سوچ سے نیند اُچاٹ ہوگئی۔ کھانا کم کھانے لگا۔ قریب تھا کہ میری تندرستی میں خلل آجائے کہ اتنے میں میری بی بی نے جن کی نسبت آپ سُن چکے ہیں کہ وہ بچپن سے بہت خواب دیکھا کرتی تھیں اور کبھی اُن کا خواب جھوٹا ہوا ہی نہیں میرے بارے میں ایک بڑا لمبا خواب دیکھا جیسے میں کسی بزرگ کے ساتھ مذہبی مباحثہ کر رہا ہوں اور ان بزرگ نے میرے سارے شکوک رفع کر کے میرا پورا اطمینان کر دیا ہی۔ یوں تو اُنھوں نے ہزاروں خواب دیکھے اور سارا شہر اس بات سے واقف ہی مگر ان کے دو خواب بڑے عجیب ہیں، ایک تو اُنھوں نے وقت سے پہلے اپنے ماموں کو امتحان تحصیلداری کے سوالات خواب کے ذریعے سے بتا دیئے تھے۔ ماموں کہیں الہ آباد کے علاقے میں تحصیلدار تھے اور یہ دلّی میں۔ خواب میں سوالات معلوم ہوئے۔ اُنھوں نے صبح اُٹھ سوالات قلمبند کر رجسٹری کرا ماموں پاس بھیج دیئے۔ کئی دن بعد امتحان ہوا تو ایک لفظے کا فرق نہ تھا۔ وہ خط رجسٹری کے لفافے سمیت اس وقت تک تحصیلدار صاحب کے پاس موجود ہی۔ یہ خواب جو میرے بارے میں دیکھا اُس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہی۔ میں نے اس خواب کو زبانی نہیں

سُننا چاہا۔ بلکہ اُن سے کہا کہ لکھ دو۔ وہ لکھتی جاتی تھیں اور میں برابر بیٹھا ہوا دیکھتا جاتا تھا۔
میرے جتنے سوالات ہیں جو بات میرے دل میں تھی وہی اُن کے قلم سے نکلتی تھی۔ یہ رسالہ
جو آپ میرے ہاتھ میں دیکھتے ہیں وہی خواب ہے۔ اور جنھوں نے دیکھا ہے اُن ہی کے ہاتھ کا
لکھا ہوا بھی ہے۔ اس کے مضامین ہی میں اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خواب دل سے نہیں بنایا گیا۔
میں خیال کرتا ہوں۔ کہ جنھوں نے یہ خواب دیکھا ہے اس کی بعض باتوں کو سمجھ بھی نہیں سکتیں
اگرچہ اِس خواب کو میں اُن فوائد میں شمار کرتا ہوں جو نکاح کی وجہ سے مجھ کو حاصل ہوئے
مگر چونکہ یہ ہر ایک کے نکاح کا نتیجہ لازمی نہیں ہے اس لیئے میں اس کو کمیٹی میں پیش
کرتے ہوئے تامل کرتا تھا کہ نہیں معلوم اس کو اغراض کمیٹی میں داخل بھی سمجھیں یا نہ سمجھیں
مگر مجھ کو اس خواب میں ایسی مسرت ہوئی ہے کہ آپ سب صاحبوں کو شریک کیئے بدون
مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور مطلب بھی ایسا اہم ہے کہ اس سے زیادہ ضروری کوئی مطلب ہو نہیں سکتا
غرض میں یہ رسالہ بڑی خوشی سے کمیٹی کی نذر کرتا ہوں اور اگر کمیٹی کی نظر میں بکار آمد
ثابت ہوا اور اس کے چھپوانے کی صلاح ٹھیرے تو اس کا کاپی رائٹ بھی کمیٹی کی نذر ہے"

صادق کا بیان سُن کر لوگوں کے شوق تو اس قدر مشتعل ہو رہے تھے کہ چاہے
ساری رات ہی کیوں نہ بیٹھنا پڑے مگر خواب ابھی سنایا جائے۔ لیکن گفت و شنود کے
بعد آخر یہ رائے قرار پائی کہ نہیں خواب کو بڑے اطمینان سے سُننا ہوگا اور عجب نہیں
کسی کسی موقع پر کچھ بحث بھی پیش آ جائے ختم ہونے تک کمیٹی کے آیندہ اجلاس
اسی خواب کے لیئے وقف رہیں۔ لوگوں نے بہتیرا چاہا کہ ان کو کتاب مستعار دی جائے
اور کمیٹی سے خارج ان کو اس کے پڑھنے اور دیکھنے کی اجازت ہو مگر پریزیڈنٹ نے
اس کو منظور نہ کیا اور وہ کتاب قفل میں بند کی گئی۔ جب کمیٹی کا اجلاس ہونا نکالی جاتی۔ لوگ

پھبتیے اور سر دُھنتے۔ اس پر بحث بھی اتنی ہوئی کہ کسی مضمون پر نہ ہوئی ہوگی۔ انجام یہ ہوا کہ کمیٹی نے بالاتفاق رزولیوشن پاس کیا کہ۔

جو اس کتاب جتنی باتیں بھی نہ جانتا ہو اُس کا اسلام کیا؟

پھر تو کالج کا کوئی طالب العلم نہ تھا جس کے پاس اس کی ایک چھپی ہوئی کاپی نہ ہو سُنا ہو کہ اس کتاب کے کاپی رائٹ سے کالج میں ہر سال دو تین فری بورڈنگ ہوس تعمیر ہوتے رہتے ہیں طالب العلموں نے بڑا زور مارا کہ یہ کتاب کالج کے مذہبی کورس میں داخل ہو مگر مسلمانوں کے تعصب کے آگے کسی کی پیش نہ گئی، لیکن کب تک؟ بہرکیف اس وقت تو کالج کے ہاتی کے مذہبی دانت دکھانے کے ان کی پرانی کتابیں ہیں اور کھانے کے یہ کتاب۔ اس خواب کے متعلق ایک عجیب بات اور ہے کہ اس کے بعد سے صادقہ کے خوابوں کا سلسلہ آپ سے آپ بالکل منقطع ہوگیا۔ وہ اور اُس کے لواحق بہتیرا چاہتے تھے کہ وہ کوئی خواب دیکھے مگر دکھائی دے تو دیکھے۔ جس غرض سے اس کو یہ نعمت دی گئی تھی کہ اُس کے آخری خواب سے اس کے شوہر کو خصوصاً اور مسلمانوں کو عموماً فائدہ پہنچے، سو پہنچا۔ اب اس کو خواب نظر آئیں کیوں اور لوگ منتظر رہیں کس لیے؟

تمت